جُدائی

ایک معاشرتی ناول

رئیس احمد جعفری

ناشران

شیخ شوکت علی اینڈ سنز

بندر روڈ، کراچی

جملہ حقوق طباعت و اشاعت دائمی بحق
بلقیس اقبال
پروپرائٹر
شیخ شوکت علی اینڈ سنز پبلشرز، بکسیلرز، بندر روڈ، کراچی
محفوظ ہیں

طبع اول: ———— سنہ ۱۹۶۱ء

قیمت: ———— آٹھ روپے

مطبوعہ: ———— انٹرنیشنل پریس کراچی

وہ ——— ایک بیوہ عورت تھی، شوہر کا منہ دیکھنے سے پہلے وہ بیوہ ہوگئی، روایات خاندانی نے اس کی آرزوئیں کچل دیں، اس کی تمناؤں کا گلا گھونٹ دیا، اس کی خوشیاں چھین لیں، اور اسے غم کے اتھاہ سمندر میں دھکیل دیا، ———

لیکن ـــــــــ محبّت کا بلاوا آیا، اور وہ اسے قبول کرنے پر مجبور ہو گئی، اس نے اپنے دل کو بھینچ بھینچ کر کچل ڈالا، اپنے سینہ کے ایوان میں محبّت کو قدم نہ دھرنے دیا، ـــــــــ لیکن ـــــــــ لیکن محبت آ گئی، وہ اسے روک نہ سکی، وہ محبت کرتی رہی، چپکے چپکے، خود اپنے دل کو بھی بے خبر رکھ کر خود اپنے آپ کو بھی فریب دے کر، مگر اس محبت کا نتیجہ کیا ہوا؟ انجام کیا نکلا؟ .. .. ؟

عزیز اور محبوب دوست

خلیل شرف الدین

مالک "کپو" پریس، بمبئی کے نام

شادی و غم

شادی جو ہوئی غم کے بھی پہلو نکل آئے
جب کوئی ہنسا ساتھ ہی آنسو نکل آئے

(1)

کسی شخص کو، دشمن جانی کے انتقال پر بھی اتنی بے اندازہ مسرت مشکل سے ہو سکتی ہے۔ جتنی اپنے عزیز، چہیتے، اور محبوب داماد خلیق کی وفات پر شرفو میاں کو ہوئی۔ شرفو میاں کا اصل نام تو اشرف تھا۔ لیکن عزت اور عظمت کے باعث گھر کے اور باہر کے لوگ انہیں شرفو میاں کہا کرتے تھے۔ مجموعی حیثیت سے وہ تھے بھی بڑے اچھے آدمی۔ بیوی سے محبت کرتے تھے، بچوں پر جان دیتے تھے۔ لڑکی ایک ہی تھی، قمر، اور واقعی وہ گھر کا چاند تھی، سارا انتظام اسی کو سونپ رکھا تھا۔ ہر آدمی کی بات شرفو میاں رد کر سکتے تھے۔ لیکن قمر کے منہ سے جو بات نکلتی۔ وہ پوری ہو کر رہتی تھی، سارا گھر مخالف ہو مگر، شرفو میاں اس کا ساتھ دیتے تھے، لہذا کیسے ممکن تھا کہ شرفو میاں اور قمر، جس بات

میں متحد ہو جائیں وہ پوری نہ ہو، جہاں تک داماد کا تعلق تھا، اسے بھی وہ پسند کرتے تھے۔ یوں تو خلیق ان کا قریبی عزیز تھا۔ لیکن عزیز نہ ہوتا تو بھی وہ اسے پسند کرنے اور چاہنے پر مجبور تھے، اس لیے کہ اس میں ہر وہ خوبی موجود تھی جو ایک شریف نوجوان میں ہونی چاہیئے، نہایت با اخلاق۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ اونچے سرکاری عہدے پر ملازم، سعادت مند، خوش کردار، خوش اطوار، خوش گفتار لیکن اس کے باوجود، خلیق کے اچانک انتقال کا نہ صرف انھیں صدمہ نہیں ہوا بلکہ دل نے ایسا محسوس کیا جیسے اسے اپنے پاس بلا کر خدا نے شرفو میاں پر بہت بڑا احسان کیا ہے جی چاہتا تھا اسی وقت سجدۂ شکر میں گر پڑیں۔

شرفو میاں، احمد نگر کے زمینداروں میں تھے، تقریباً چالیس پچاس ہزار سالانہ کی آمدنی گھر بیٹھے ہو جایا کرتی تھی۔ کنبہ بہت مختصر سا، یعنی وہ خود، بیوی نعیمہ، دو لڑکے، انوار اور اظہار، ایک لڑکی قمر، احمد نگر ایک چھوٹا سا شہر تھا، اس لیے ضروریات زندگی پر بھی یہاں کچھ زیادہ خرچ نہ ہوتا تھا، نہ مہمانوں کی ریل پیل رہتی تھی، نہ دعوتوں اور پارٹیوں کا سلسلہ جاری تھا، لہذا آمدنی کا بڑا مصرف یہ تھا کہ جمع کی جاتے، یا زمینیں خریدی جائیں، اور یہ دونوں کام بڑی فیاضی اور دریا دلی سے شرفو میاں کرتے رہتے تھے، شرفو میاں سے زیادہ ان کے والد، اور والد مرحوم سے زیادہ جد والا تبار جزرس اور کفایت شعار تھے، لہذا ترکہ میں زمینداری، زمین، جائداد، باغات کے علاوہ زر نقد بھی، عام لوگوں کے اندازہ سے وہ بہت زیادہ ملا، سکون اور عافیت کے ساتھ آسودگی کی زندگی بسر ہو رہی تھی۔

شرفو میاں کو ایک فضل ربی یہ حاصل تھا کہ وہ ایک انتہائی قدامت پسند خاندان کے ایک نہایت سعادت مند فرد تھے۔ اس خاندان کو کئی باتوں پر فخر تھا ایک اس بات پر، کہ یہ نجیب الطرفین تھا، دوسرے اس بات پر کہ غیر خاندان میں خواہ وہ اپنی جگہ پر کیسا ہی اعلیٰ اور نجیب الطرفین کیوں نہ ہو، نہ لڑکی دی گئی، نہ لی گئی، تیسرے اس بات پر، کہ چاند، سورج اور تاروں کے سوا، اس گھر کی عورتوں اور لڑکیوں کو کسی نامحرم نے آج تک نہیں دیکھا تھا، حد یہ ہے کہ کمینوں یعنی نیچ ذات کی عورتیں اول تو گھر میں قدم ہی نہیں رکھ سکتی تھیں، لیکن اگر کوئی ایسی ہی مجبوری ہو، اور اسے آنا پڑے تو، گھر کی عورتیں اور لڑکیاں فوراً پردے میں چلی جاتی تھیں، سامنے نہیں آتی تھیں، بھنگن جب آتی تھی پکار کر آتی تھی، اور جب پردہ ہو جاتا تھا تو داخلہ کی اجازت ملتی تھی، اگر محلہ کی بھنگن، دھوبن، یا اسی طرح کی کسی اور عورت سے شرفو میاں کے گھر کی کسی عورت کا حلیہ پوچھا جاتا، تو وہ کوئی جواب نہیں دے سکتی تھی، اس لیے کہ اس نے کبھی ان کی زیارت ہی نہیں کی تھی،

شرفو میاں نے ان خاندانی روایات کا نہ صرف ہمیشہ التزام ملحوظ رکھا بلکہ اپنی جودت طبع سے ان میں اضافہ بھی کیا، علم کا جہاں تک تعلق تھا شرفو میاں مادری زبان کے سوا کوئی زبان نہیں جانتے تھے، لہٰذا ان کا علم بھی صرف انہی چند کتابوں تک محدود تھا، جو مادری زبان میں انھوں نے کبھی پڑھی تھیں کتابیں خریدنے کا شوق نہیں تھا، لہٰذا مطالعہ کے ذوق سے بھی محروم تھے۔ لیکن کسی موضوع اور کسی مسئلہ پر گفتگو ہو رہی ہو، شرفو میاں خاموش رہ جائیں

یہ ناممکن تھا، ضرور بولتے تھے اور اس روانی سے بولتے تھے، جیسے ——
آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں، رفتہ رفتہ انہیں مذہب سے دلچسپی ہوگئی، دو چار مذہبی کتابیں بھی پڑھ ڈالیں، کچھ عربی کتابوں کے ترجمے بھی نظروں سے گزرے، نتیجہ یہ ہوا کہ شرفو میاں نے داڑھی رکھ لی، نماز پابندی سے پڑھنے لگے، کبھی لہر اٹھتی تو محلہ کی مسجد میں نماز بھی پڑھنا شروع کر دیا مگر نہ معلوم کیا سوچ کر رک گئے، یہ ارادہ قوت سے عمل میں نہ آسکا۔

روایات خاندانی میں یہ پانچواں اضافہ، یعنی مذہبیت، شرفو میاں کی ایجاد تھی، ورنہ اس سے پہلے روایات کہن پر عمل تو سختی سے ہوتا تھا لیکن مذہب سے اس خاندان کے سربراہوں کی عملاً، یا قولاً کبھی سروکار نہ رہا، اب شرفو میاں نہ صرف خود چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی مذہب کی عینک سے دیکھتے تھے، بلکہ بیوی کو بھی مجبور کرتے تھے کہ وہ بھی ایسا ہی کریں، گھر کے ہر فرد کے لیے نماز لازمی تھی اور رمضان کے روزے بھی، یہ دوسری بات ہے کہ اس باب میں وہ فریب خوردہ یعنی ان کے علم میں گھر کا ہر فرد پکا نمازی، اور روزے دار تھا، ورنہ عملاً، نماز یا روزے سے کسی کو سروکار نہ تھا، ——!

داڑھی رکھ لینے سے شرفو میاں اور زیادہ وجیہہ ہوگئے تھے، وہ ان لوگوں میں تھے جن پر داڑھی پھبتی اور سجتی ہے ممکن ہے داڑھی رکھ لینے کی ایک وجہ یہ بھی ہو!

محلہ میں، بلکہ شہر میں، شرفو میاں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، کچھ اس لیے کہ زمیندار، اور دولت مند تھے اور کچھ اس لیے کہ لوگوں کے ساتھ ان

کا برتاؤ بھی حد درجہ خلیقانہ تھا، محلہ کے غریبوں اور ناداروں کی کبھی کبھی وہ مدد بھی کردیا کرتے تھے، لہذا، آمدہ کی امید میں سامنا ہوتے ہی درازی عمر و ترقی اقبال کی دعا دینے والوں کی بھی کمی نہ تھی،

شرفو میاں کے دونوں لڑکے انوار، اور اظہار انگریزی اسکول میں پڑھتے تھے جو کام وہ خود نہ کر سکے، سوچا لڑکے کرلیں گے، لیکن جب مذہبی جامہ شرفو میاں کی قامت پر راس آگیا، تو انھوں نے دونوں کو اسکول سے اٹھا لیا، اور مدرسہ رحمانیہ میں داخل کرادیا، جہاں عربی کی تعلیم دی جاتی تھی، بعض بے تکلف دوستوں نے اعتراض بھی کیا۔

"حضرت لڑکوں کی زندگی کیوں برباد کرتے ہو،؟،

شرفو میاں بگڑ گئے۔

"زندگی برباد کرتا ہوں لڑکوں کی یا سنوار رہا ہوں؟، انگریزی پڑھ کر سوا اس کے کہ کچھ روپیہ کما لیں، اور کیا کرلیں گے؟ مذہب کو فراموش کرنے کے بعد روپیہ کمایا بھی تو کیا، اور جناب میرے لڑکوں کو روپیہ کمانے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ خدا نے صرف وہ لڑکے دیئے ہیں اگر دو درجن بھی ہوں تو رئیسانہ ٹھاٹھ سے زندگی بسر کر سکتے ہیں'!"

یہ ایسا جواب لاجواب تھا کہ پھر کوئی کچھ نہ کہہ سکا، یہ دوسری بات تھی کہ عربی مدرسہ میں بھی دونوں کا جی نہ لگا، اور کچھ عرصہ بعد جس طرح انگریزی کی تعلیم چھوڑ دی تھی، عربی سے بھی رشتہ منقطع کرلیا۔

قمر دونوں بھائیوں سے کافی بڑی تھی، انوار اور اظہار کی عمر علی الترتیب ۱۷،

اور ۱۸ سال کی تھی، اور قمر ۲۰ ویں سال میں قدم رکھ چکی تھی، یہ درمیانی وقفہ جب وہ لڑکے سے محروم، اور لڑکی کے باپ تھے کس کرب و اذیت میں شرفو میاں نے گذارا ہے، خدا ہی بہتر جانتا ہے، کئی دفعہ جی چاہا نعیمہ کو طلاق دے دیں، اور دوسری شادی کر لیں، نعیمہ کی خدمت گزاری، وفاداری، جاں نثاری کوئی چیز بھی سفارش نہ بن سکی، اور یقیناً اس فیصلہ پر وہ عمل کر چکے ہوتے، لیکن جس چیز نے، عمل کرنے سے باز رکھا وہ وہی روایات خاندانی تھے، خاندان میں کوئی موزوں عورت نہ مل سکی، اور خاندان سے باہر وہ ملکہ قلو پطرہ سے بھی شادی پر تیار نہ تھے، آخر خدا کو شرفو میاں سے زیادہ نعیمہ پر رحم آیا، اور پہلے انوار سے گھر جگمگایا، پھر اظہار نے اس گھر کی رونق بڑھائی۔

چونکہ ایک عرصہ تک شرفو میاں بھی اس خیال میں مبتلا رہے کہ قمر ہی اس گھر کی مالک ہوگی، اس لیے بادل نخواستہ اسے تھوڑی سی اردو فارسی ایک شریف اور پردہ دار استانی سے پڑھوانا پڑی "تاکہ، جب وہ اس گھر کی مالک بنے، تو حساب کتاب اور معاملات سمجھ سکے، ضرورت کے مطابق اردو فارسی پڑھا دینے کے بعد یہ سلسلہ بند کر دیا گیا، لیکن قمر کو خوب پڑھنے لکھنے کا چسکا پڑ چکا تھا، باپ سے چھپا کر اور ماں کی چشم پوشی سے حوصلہ پاکر، وہ برابر مطالعہ کا سلسلہ جاری رکھتی۔

انوار اور اظہار کی پیدائش کے بعد شرفو میاں کے لیے قمر کا وجود ایک نہایت پیچیدہ مسئلہ بن گیا، طبعاً وہ کسی لڑکی کا باپ بننا اپنے لیے موجب ننگ و عار سمجھتے تھے، لیکن انسان پہاڑ ٹال اور سمندر دل سے تو ٹکر لے سکتا ہے۔

مگر قدرت سے جنگ نہیں کر سکتا، بادلِ نخواستہ شرفو میاں کو لڑکی کا باپ بننا پڑا، لیکن جب قدرت نے اپنی غلط بخشی کی تلافی انوار و اظہار کی صورت میں کر دی، تو وہ سوچنے لگے کہ اب کیا ہو گا۔؟

خاندان کی لڑکیاں عام طور پر ۱۴-۱۵ سال کی عمر میں بیاہ دی جاتی تھیں۔ شرفو میاں نے، "مصلحت" دیکھ کر، قمر کی نسبت ۱۶ سال کی عمر میں خلیق سے باقاعدہ کر دی تھی، وہ اسی خاندان کے ایک غریب باپ کا بیٹا تھا، شرفو میاں نے سوچا اگر قمر کی شادی، برابر کی ٹکر والے کسی آدمی کے لڑکے سے کی گئی تو، یہ جائداد سلامت نہ رہ سکے گی۔ کیونکہ خاندان کے لڑکے نجیب الطرفین ہونے کے باوجود، عام طور پر اوباش اور عیاش تھے، اور چونکہ خود کھاتے پیتے گھرانے کے فرد تھے، اس لیے دباؤ میں بھی نہیں آ سکتے تھے خلیق غریب باپ کا بیٹا تھا، اسے خانہ داماد بھی بنایا جا سکتا تھا، اور دباؤ میں بھی رکھا جا سکتا تھا، نسبت کے بعد، پچاس روپے مہینہ شرفو میاں نے خلیق کے تعلیمی مصارف کے سلسلہ میں برداشت کرنا شروع کیے تھے، صرف اسی احسان پر خلیق کا سارا خاندان دام ناخریدہ غلام بن گیا تھا، وہ ایسا ہی داماد چاہتے تھے جو غلام اور لڑکے کا کام دے سکے، اور جو ان کے رنگ میں رنگ کر قمر کا شوہر اور اس کا مالک بنے، سب سے بڑی خوبی خلیق میں یہ تھی کہ نہ کوئی بھائی تھا، نہ بہن، ایک بوڑھی ماں تھی، ایک بوڑھا باپ، لہٰذا، یہ اندیشہ بھی نہیں تھا کہ برسرِ اقتدار آنے کے بعد، شرفو میاں کی دولت اپنے خاندان میں تقسیم کرنا شروع کر دے گا، یہی وجہ تھی کہ شرفو میاں، خلیق کو جب دیکھتے تھے تو ان کی باچھیں کھل جاتی تھیں، اگرچہ دیکھنے اور باچھیں کھلنے کا موقعہ

کم ملتا تھا، کیونکہ وہ دوسرے شہر میں تعلیم حاصل کر رہا تھا، اور مستقل طور پر بورڈنگ میں رہتا تھا۔

بی اے کرنے کے بعد، خلیق کے والدین نے باقاعدہ نکاح پر زور دیا، لیکن اب صورت حال بدل چکی تھی، شرفو میاں ٹال مٹول کرنے لگے، انوار پیدا ہو چکا تھا، خاندان کا وارث خدا نے عطا کر دیا تھا، اب قمر کی شادی کے معنی یہ تھے کہ جو کچھ صرف انوار کو ملنا چاہئے، اس کا ایک معقول حصہ قمر اپنے ساتھ لے جائے کیونکہ اب بہرحال اسے سسرال میں رہنا تھا، اب یہ گھر اس کا نہیں تھا، اب اس گھر کا مالک انوار تھا۔

ایک سال اور اسی طرح گزر گیا۔

یہاں تک کہ اظہار عالم وجود میں آگیا!

اظہار کی ولادت نے شرفو میاں کو اور زیادہ حساس بنا دیا، جہاں اس نعمت پر پھولے نہیں سماتے تھے، وہاں اب قمر ان کی نظر میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگی تھی، اور خلیق کی تو صورت دیکھنے کے بھی وہ روادار نہ تھے،

اس گھر کے اس جائداد کے مالک، انوار اور اظہار تھے، انوار اور اظہار کے حصہ میں سے قمر کچھ کاٹ کر لے جائے یہ ایسا ہی تھا جیسے وہ انوار و اظہار کا ایک ایک پارچۂ گوشت چھری سے کاٹ کر لے جائے،

اب وہ اپنی رائے میں اور زیادہ سخت ہو گئے تھے،!

لیکن بے بس بھی تھے۔

قمر نے ہوش سنبھالتے ہی گھر کا سارا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا،

اور یوقعہ یہ ہے کہ بڑی خوبی سے یہ بوجھ اٹھا لیا تھا، لبیمہ اور شرفو میاں دونوں کو خانگی ذمہ داریوں سے سبکدوش کر دیا تھا،

یہاں تک تو شرفو میاں کو کوئی اعتراض نہ تھا کہ اسی طرح، مکمل اختیارات کے ساتھ قمر کام کرتی رہی، سوا کھانے کپڑے کے اسے دینا کیا پڑتا تھا، یہ سودا گراں نہ تھا، لیکن یہاں سے خلیق کی دلہن بن کر جائے، اور اپنے ساتھ جہیز میں، سونے چاندی، ہیرے، جواہر، ریشم، کمخاب، اور زرنقد کا انبار لے جائے، یہ اب ناممکن تھا، ؟ یہ ساری چیزیں اب انکار و اظہار کی بیویوں کا حصہ تھیں، !

یہ بات کہ نہایت سادگی کے ساتھ، معمولی سا جہیز دے کر قمر کو رخصت کر رخصت کر دیا جائے "، ممکن تھی، لیکن عملاً ناممکن، بھلا خاندان والے کیا تھو تھو کرینگے ایک لڑکی اور وہ اس طرح رخصت کی جائے ؟ اور خاندان والوں کی پرواہ نہ کی جائے، سادگی کے ساتھ، شرع کی آڑ لے کر، معمولی سا جہیز دے کر رخصت کر دیا جائے، پھر بھی، ساری جائداد منقولہ اور غیر منقولہ میں، لڑکی کی حیثیت سے قمر کا جو حصہ ہے، اسے کس طرح ضبط کیا جا سکتا ہے ؟

بظاہر شرفو میاں ہنستے تھے، بولتے تھے، لیکن ان کا دل روتا رہتا تھا فکر سے گھلے جا رہے تھے، سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کیا جائے۔

حالات کی ناموافقت میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا تھا، !

خلیق نے صرف بی اے کرنے پر اکتفا نہ کیا، بلکہ امتحان مقابلہ میں بیٹھا، اور سول سروس کا ممبر بن گیا، اور ایک اچھے منصب پر احمد نگر کے قریب

ہی ایک دوسرے شہر میں نائب ہو گیا، ! اس کے معنی تو یہ تھے کہ جائداد تو جائداد اب قمر کو جہیز سے بھی محروم نہیں کیا جا سکتا،

قمر اپنے باپ سے محبت کرتی تھی، باپ کو متفکر دیکھ کر وہ خود پریشان ہو جاتی تھی، لیکن روایات خاندانی کے تحت باپ کے سامنے اسے مجال گفتگو نہ تھی بار ہا جی چاہا کہ پوچھے،

ابو آپ پریشان کیوں نظر آتے ہیں، ؟

کس فکر نے آپ کو افسردہ کر رکھا ہے ؟

لیکن دل کی بات زبان پر نہ آسکی، —— آہی نہیں سکتی تھی،

---

(۲)

خلیق کے والدین کی طرف سے نکاح کا، اور شرفو میاں کی طرف سے ٹال مٹول کا سلسلہ جاری رہا، !

یہاں تک کہ قمر کی عمر ۲۰ سال کی ہو گئی، !

اب نعیمہ میدان میں اتریں اور انھوں نے ایک دن اپنے شوہر نامدار سے کہا۔

"ویسے تو بڑے اللہ والے بنتے ہو، لیکن یہ پاپ جو کر رہے ہو، خدا کو اس کا بھی کچھ جواب دے سکو گے، ؟"

شرفو میاں خدا کے قائل بھی تھے، اور اس سے ڈرتے بھی تھے۔ !

لیکن اس لیے کہ اس کی خوشنودی حاصل کر کے دین دنیا کی نعمتیں حاصل

اس لیے نہیں کہ اس کی خوشنودی کے لیے اپنی متاع دنیا قربان کردیں۔ جھلاتے ہوئے لہجہ میں بیوی کو جواب دیا۔

میں نہیں ڈرتا خدا سے تو تم ڈرتی ہو، پابندی سے نماز تک پڑھنے کی توفیق نہیں، خدا کا شکر ہے یہاں کسی وقت کی نماز قضا نہیں ہوتی، ماتھے پر گھٹہ تک پڑ گیا ہے سجدے کرتے کرتے، !

نعیمہ نے جواب میں کہا۔

وہ تو میں بھی دیکھ رہی ہوں، لیکن قمر کی عمر ماشاء اللہ ۲۰ برس کی ہوگئی برسوں ہوئے نسبت بھی ہو چکی، مگر آخر شادی کیوں نہیں ہوتی؟ "

ہو جائے گی، !"

وہی تو پوچھتی ہوں کب ہوگی؟ "

"ہر کام اپنے وقت پر ہوتا ہے۔"

"اور وہ وقت کب آئے گا جب میں مرجاؤں گی، جب وہ بوڑھی ہو جائے گی؟ "

"لاحول ولا قوۃ، خدا عورتوں سے پناہ میں رکھے، !"

"اے ہے ایسے ہی عورتوں سے بیزار تو شادی کیوں رچائی تھی دھوم دھام سے، لڑکی کے باپ کیوں بنے تھے؟ "

"غلطی آدمی ہی سے ہوتی ہے، !

"غلطی کا نباہ اصل آدمیت ہے، ـــــــ جو غلطی کر چکے ہو اسے نباہو، میں اپنی بچی کا وبال نہیں لینا چاہتی، یہی پہننے کھانے کے دن ہوتے

ہیں، اس گھر میں اس کی حیثیت ایک مزدور سے زیادہ اور کیا ہے؟ صبح منہ اندھیرے اٹھتی ہے، اور رات کو سب کے سونے کے بعد سوتی ہے، ہر کام اس کے ذمہ ہے، کہنے کو وہ گھر کی مالک و مختار ہے، لیکن سچ پوچھو تو باندی سے زیادہ کام کرنا پڑتا ہے بیری بچی کو، میں یہ ظلم نہیں دیکھ سکتی اس کی شادی کرو، اور رخصت کر دو اسے'! "

" (جھلاتے ہوئے) اس کی شادی کرو، اور رخصت کر دو اسے'! —— —— کہاں سے؟ "

" کہاں سے؟ یعنی؟ "

" یعنی کیا- شادی بغیر روپے گے کر دوں؟ جہیز نہ دوں؟ دوسری تیاریاں نہ کروں؟ "

" تو روپیہ تمہارے پاس نہیں ہے؟ "

" نہیں ہے آج کل، کام میں لگا ہوا ہے، کاشتکاروں پر بھی خاصی رقم باقی ہے وصول ہو تو پروگرام بناؤں'! "

" بھاڑ میں گیا تمہارا پروگرام، —— یہ اتنی بڑی تجوری جو سامنے رکھی ہے کیا اس میں سانپ بچھو ہیں؟ بینکوں میں جو دولت پڑی سڑ رہی ہے، وہ کیا میرے کفن کے کام آئے گی؟ —— بس کچھ نہیں جانتی، اگلے مہینہ قمر کی شادی ہو گی، اور ضرور ہو گی'! "

" اگلے مہینے؟ —— کچھ دماغ چل گیا ہے؟ "

" ہاں چل تو گیا ہے، لیکن میرا نہیں تمہارا! "

"اگلے مہینے کس طرح ہو سکتی ہے؟"

"جس طرح ہوتی ہے'!"

"نہیں اس قدر جلد نا ممکن ہے'!"

"نا ممکن تمہارے نزدیک ہوگا، بندوبست کرتے ہو تو کرو، ورنہ میں لڑکے (خلیق) کو بلا کر لڑکی (قمر) کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دوں گی۔ اور قاضی کو بلا کر دو بول پڑھوا دوں گی، پھر دنیا تھوکتی رہے گی کہ شرفا میاں کی لڑکی کسی غریب کی لونڈیا کی طرح بیاہی گئی ہے'!"

"تمہیں آج ہو کیا گیا ہے؟"

"مجھے بہت دن سے کچھ ہو گیا ہے لیکن آج ضبط کا بند ٹوٹ گیا'!"

"عجیب عورت ہو'!"

"ہاں اور کیا میں ہی تو عجیب ہوں اور تم؟"

"تم کیا؟"

"خود تم کیا ہو؟" ———— میں کہتی ہوں خلیق جیسا لڑکا چراغ لے کر ڈھونڈو گے تو نہیں ملے گا، ایسا لائق، ایسا ہونہار، ایسا اطاعت مند ایسا نیک، ایسا شریف' ————

"ہاں بھئی کیوں بکے جاتی ہو، جانتا ہوں وہ اچھا لڑکا ہے!"

"اور اس کا باپ؟ ———— بیچارے آج آئے تھے، کہہ رہے تھے بس ہمیں نہ مال چاہیئے نہ دولت، نہ جہیز، نہ زیور، نہ فرنیچر، نہ دھوم دھام، ہمیں تو لڑکی چاہیئے، لڑکا سرکاری ملازم ہے اچھی خاصی تنخواہ پا رہا

ہے، گو وہ شریف اور نیک ہے، لیکن بہن زمانہ بہت خراب ہے، اس کی عمر بھی ۲۴ سال کی ہو چکی ہے، کب تک اس نسبت پر یہ بیٹھا رہے گا، کہیں ادھر ادھر نگاہ پڑ گئی تو خاندان کی ناک کٹ جائے گی،!" میں نے تو وعدہ کر لیا بھئی،!"

"وعدہ کر لیا؟"

"تو کیا انکار کر دیتی؟"

"کیا وعدہ کیا، تفصیل نہ لبے وقوف عورت،!"

"تفصیل کاہے کی، خدا چاہے گا اگلے مہینے کی پندرہویں تاریخ کو نکاح ہو جائے گا قمر کا خلیق سے،!"

"تم پاگل ہو، ———— اس قدر جلد؟"

"تو کیا انوار اور اظہار کے پوتے اور نواسے جب پیدا ہوں گے تب شادی کرو گے، ؟"

شرفو میاں شرمندہ ہو کر خاموش ہو گئے،

بیوی سے پیچھا چھڑا کر باہر آئے تو خاندان کے کئی واجب الاحترام بزرگ موجود تھے اور یہ سب وفد کی صورت میں اس لیے آئے تھے، کہ شرفو میاں کو جلد از جلد قمر کی شادی خلیق سے کرنے پر آمادہ کریں۔ اس وفد میں خلیق کے والد بھی موجود تھے،!

شرفو میاں نے محسوس کر لیا اب یہ بلا سر سے ٹلتی نہیں نظر آتی، بظاہر بالکل انجان بن کر سب کا خیر مقدم کیا، لیکن فوراً ہی مطلب کی باتیں شروع ہو گئیں،

شرفو میاں نے اپنی معذوریاں پیش کیں، لیکن جب بیوی کی نظر میں وہ قابل قبول نہ تھیں، تو دوسرے لوگ کیسے تسلیم کر لیتے، گفتگو میں کبھی گرمی پیدا ہوئی، کبھی نرمی، کبھی تلخی، کبھی ملائمت، کبھی ایسا معلوم ہوتا، معاملہ ختم ہو جائے گا۔ کبھی ایسا نظر آنے لگتا جیسے بگڑی ہوئی بات پھر بن جائے گی،

بدقسمتی سے اس وفد میں حکیم صاحب بھی شامل تھے، بلکہ وہی اس کے لیڈر تھے، ان صاحب کا نام حکیم فخرالدین تھا، رشتہ میں یہ شرفو میاں کے ماموں ہوتے تھے، حکیم اس لیے کہلاتے تھے کہ طبیب تھے، ان کی حذاقت کی دھوم تھی، ڈاکٹروں سے مقابلہ کرتے تھے اور سرخرو ہوتے تھے، شرفو میاں، ماموں کی حیثیت سے ادب کرتے تھے، اور اس حیثیت سے کہ بار بار ان پر دمہ کے دورے پڑتے رہتے تھے، اور ہر مرحلہ پر حکیم صاحب ہی مسیحا بن کر نمودار ہوتے تھے اور ملک الموت کے پنجہ سے چھین لیتے تھے، فیس لینے کا تو کوئی سوال ہی نہیں، دوا تک مفت دیتے تھے، لہٰذا ان کے بار احسان سے دبے ہوئے تھے، چنانچہ جب انھوں نے فیصلہ کن انداز میں یہ کہا کہ،

"آج تاریخ مقرر ہو جانی چاہیئے"! اور خلیق کے باپ نے اس راز کا انکشاف کیا کہ نعیمہ نے تو اگلے مہینہ کی پندرہ تاریخ اپنی طرف سے مقرر بھی کر دی ہے، تو شرفو میاں کے لیے سر تسلیم خم کر دینے کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا، نہایت بے دلی کے ساتھ فرمایا۔

"ماموں جان کا ارشاد میرے لیے فرمان کی حیثیت رکھتا ہے، اگر

ان کی بھی یہی رائے ہے کہ اگلے مہینہ کی پندرہ تاریخ کو نکاح ہو جائے تو یہی سہی، !"

خلیق کے والد نے ایک شوشہ اور چھوڑا۔

"شرفو میاں صرف نکاح ہی نہیں ——————

بات پوری ہونے سے پہلے شرفو میاں نے جھلاتے ہوئے لہجہ میں کہا۔

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ ؟"

وہ بولے،

"میرا مطلب ہے رخصتی بھی ——————

حکیم صاحب کو مائل بہ تائید دیکھ کر شرفو میاں نے کہا۔

"جناب آپ ہر بات مجھ سے نہیں منوا سکتے، بے شک ماموں جان کے حکم سے میں نے یہ منظور کر لیا ہے کہ نکاح ہو جائے گا، رہی رخصتی، تو اس کے لیے کچھ مدت درکار ہو گی، !"

یہ کہہ کر شرفو میاں نے بے بسی کے ساتھ حکیم صاحب کی طرف دیکھا، انھوں نے سوچا اہم ترین معاملہ تو طے ہو گیا، نکاح ہو جائے تو رخصتی کیسے نہ ہو گی، یہ بات مان لینے میں کوئی قباحت نہیں بلکہ اسے مان لینا چاہیے چنانچہ انھوں نے خلیق کے والد سے کہا۔

"بھائی صاحب اس پر ضد نہ کیجیے، رخصتی اگر دو چار ماہ کے بعد بھی ہو جائے تو مضائقہ نہیں آخر شرفو لڑکی کا باپ ہے اسے کچھ تیاریاں کرنی ہیں، ہاں، ہاں، اور شاندار طریقہ پر لڑکی کو رخصت کرنا ہے، ایک

ہی تو لڑکی ہے ——————— نہیں صاحب! میں انصاف کا ساتھ دوں گا، شرفو میاں تمہاری بات منظور، نکاح تاریخ مقررہ پر ہو جائے، رہی رخصتی وہ نکاح کے دو چار ماہ کے بعد ہو جائے گی،" !"

شرفو میاں "نیا ربوں" کا نام سن کر کانپ گئے، لیکن خاموش رہے مجلس برخاست ہو گئی، اندر جا کر بیوی پر خوب برسے، لیکن فیصلہ ہو چکا تھا، اور اب حکیم صاحب کی مداخلت سے یہ اٹل فیصلہ بن گیا تھا

ایک مہینہ گزرتے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے، بہت جلد اگلے مہینہ کی پندرہ تاریخ آ گئی، اور شرفو میاں کے گھر میں عزیزوں، اور رشتہ داروں کا تانتا لگ گیا - !

قمر کی شادی ہو رہی تھی، !

لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ اس شادی سے وہ خوش تھی یا ناخوش صحیح طور پر جو بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اس رشتہ سے نہ وہ خوش تھی نہ ناخوش،

اس لیے کہ اس نے، کبھی خلیق کو نہیں دیکھا تھا،

کبھی اس سے نہیں ملی تھی، نہ اس سے بات چیت کا موقعہ پیش آیا تھا -

خلیق کی تعلیم، اخلاق، سعادت، شرافت، نیکی، اور انسانیت کے گن گھر کے اندر اور باہر گائے جاتے تھے، ان کی بھی صرف بھنک اس کے کانوں میں پڑ سکی تھی، !

وہ یہ تو محسوس کر رہی تھی کہ اس کی زندگی میں انقلاب آ رہا ہے "!

لیکن یہ انقلاب خوش آئند ہے یا مصائب کا پیش خیمہ؟ اس سے قطعاً ناواقف تھی "!

وہ جانتی تھی آج سے میری زندگی ایک دوسرے شخص کے ساتھ نتھی کر دی ہے، لیکن یہ شخص کیسا ہے؟ نہ یہ اسے معلوم تھا، نہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ تھا، کیونکہ رشتہ دار لڑکیوں سے نہ اس کی بے تکلفی تھی، نہ زیادہ آمد و رفت اور میل جول، اور یہ رشتہ دار لڑکیاں خود بھی خلیق کے بارے میں بہت کم معلومات رکھتی تھیں، کیونکہ وہ ایک غریب باپ کا بیٹا تھا، لہذا اس کے ہاں آمد و رفت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا، !

بہرحال قمر نے نہایت سکون اور استقلال کے ساتھ اس آنے والے انقلاب کا خیر مقدم کیا، نہ اس نے کوئی امید قائم کی، نہ کسی مایوسی کو جگہ دی، وہ اس پر تیار تھی کہ جس روز حکم ملے گا، اس گھر کو چھوڑ کر دوسرے گھر میں منتقل ہو جائے گی -

نکاح کی رسم دھوم دھام سے انجام پائی، !

قمر خلیق کی بیوی بن گئی "!

نعیم کی خوشی قابل دید تھی، ____ ماما کا جوش، !

انوار اور اظہار بھی اس تقریب میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے

سے تھے، اس لیے کہ بہن سے انھیں بہت محبت تھی، کیونکہ بہن کا برتاؤ ان کے ساتھ ماں سے زیادہ مشفقانہ تھا،!

رسم نکاح انجام پانے کے دوسرے روز سے حالات پھر معمول پر آگئے، وہی مصروفیت، وہی انہماک کار، خلیق اپنی ملازمت پر چلا گیا، انوار اور اظہار تعلیم میں لگ گئے، شرفو میاں اپنے زمینداری کے دھندے میں مصروف ہو گئے،

کئی بار خلیق کے والد نے رخصتی کا مطالبہ کیا، لیکن شرفو میاں بطریق حسن ٹال گئے۔

یہاں تک کہ ایک سال کی مدت گزر گئی،

اور آج تار پر یہ اطلاع ملی کہ دورہ پر جاتے ہوئے اس کی جیپ ایک لاری سے ٹکرا گئی، حادثہ اتنا سخت تھا کہ آناً فاناً خلیق کا انتقال ہو گیا۔!

شرفو میاں نے تار پڑھا——!

پہلا رد عمل تو اس جواں مرگ کی بے وقت اور ہنگامی موت پر تاسف کا تھا،!

لیکن معاً یاد آگیا کہ خلیق نے عین اس وقت مر کر جب رخصتی کا سارا سامان تیار ہو چکا تھا بہت بڑا احسان کیا ہے، ان کی جائداد بچ گئی،

قراب بیوہ ہے،!

اور اس خاندان کی ریت یہ ہے کہ عقد بیوگاں کا ننگ کسی حالت
میں گوارا نہیں کیا جا سکتا، ـــــ!'
تو اب یہیں رہے گی۔
یہیں مرے گی۔!
بے ساختہ دل سے آواز نکلی۔
یا اللہ، واقعی تو کتنا رحمان و رحیم ہے'!'

(۳)

قمر باورچی خانہ میں بیٹھی کھانا پکا رہی تھی، گھر میں گو مامائیں اور خادمائیں تھیں، لیکن کھانا لازماً اسی کو پکانا پڑتا تھا، خاص طور پر باپ کا، چونکہ وہ بزعم خود دائم المریض بنے ہوئے تھے، لہٰذا حکیم ماموں کی ہدایت کے مطابق اپنا اعلیٰ قسم کا کھانا، وہ الگ پکواتے تھے، جس میں پکانے والی کا کوئی حصہ نہ تھا، ہاں حسب ہدایت انوار و اظہار کے لیے بچا ہوا حصہ ضرور الگ رکھ دیا جاتا تھا، !

قمر باورچی خانہ میں بیٹھی کھانا پکا رہی تھی، !

نعیمہ اس کے قریب ہی پیڑھی پر بیٹھی کدوکش سے گاجریں چھیل رہی تھیں، شرفو میاں گاجر کا حلوا بڑے شوق اور رغبت سے کھاتے تھے،

لہٰذا موسم میں دو تین مرتبہ یہ فضول خرچی، اپنی ذات کے لیے وہ گوارا کر لیتے تھے، !

یکایک شرفو میاں آئے اور باورچی خانہ کی دہلیز پر کھڑے ہو گئے، آج تیتر کی باری تھی، اور اس کی بوٹیوں میں مسالہ لگا کر وہ دیگچی میں ڈالنے ہی والی تھی، گھی کڑ کڑانے لگا تھا، !

شرفو میاں دہلیز پر اس طرح کھڑے ہو گئے، جیسے دیکھ رہے ہیں، قمر کیسے پکا رہی ہے، وہ مسکرانے لگی، اور جلدی جلدی مسالہ لپیٹ کر اس نے بوٹیاں دیگچی میں ڈال دیں،

یکایک شرفو میاں کے منہ سے آواز نکلی،

" قمر، میری بچی، ——————

نعیمہ نے ٹوکا۔

اے ہے آج تو بڑا پیار آ رہا ہے بچی پر، !،

قمر کا چہرہ کچھ سرخ سا ہو گیا، وہ مسکرانے لگی، اب نعیمہ کی باری تھی، شرفو میاں نے اسے آواز دی،

" نعیمہ ——————

نعیمہ نے گاجر چھیلتے چھیلتے کہا۔

" اے کچھ کہو گے بھی، یا پگلا سے ہی جاؤ گے، کبھی قمر، کبھی نعیمہ —————— کیا ہے، ؟"

شرفو میاں کی مٹھی میں ایک مڑا ہوا سا کاغذ تھا، وہ مٹھی اور زیادہ

شدت کے ساتھ بھینچ گئی، پھر انھوں نے جیب سے رومال نکالا، اسے آنکھوں پر رکھا، اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے، یا یہ کہنا چاہیئے بلبلا بلبلا کر رونے لگے، جیسے بچے روتے ہیں۔!

قمر نے جلدی سے دیگچی اتار دی، اور نیچے رکھ دی کہ جل نہ جائے پھر وہ بے تابی کے ساتھ اٹھی اور باپ کے پاس آکر کھڑی ہوگئی، باپ کو روتا دیکھ کر خود اس کی آنکھیں بھی ضبط نہ کر سکیں، اور ان سے آنسو کے قطرے ٹپکنے لگے، یہ خلاف معمول حرکت دیکھ کر نعیمہ کے اوسان بھی خطا ہوئے گاجریں ایک طرف رکھ وہ بھی شوہر کے پاس آکر کھڑی ہوگئیں، اور گھبرائے ہوئے لہجہ میں پوچھا،

"خدا کے لیے بتاؤ، کیوں اس طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہے ہو؟ سب خیریت تو ہے ——— ؟"

شرفو میاں کو جواب دینے کی ابھی فرصت نہ تھی، ان کا گریۂ بے اختیار جاری تھا، اور انھیں روتا دیکھ کر گھر کی مامائیں، خادمائیں، ان کے چھوٹے چھوٹے بچے، سب آ آکر گرد جمع ہوگئے، کسی کو نہیں معلوم تھا، شرفو میاں جیسا بے فکرا آج رونے پر کیوں ادھار کھائے بیٹھا ہے، لیکن چونکہ وہ رو رہے تھے، لہذا سب کا فرض تھا کہ حق نمک ادا کریں اور اپنی آنکھوں کو پرنم اور اشکبار کرلیں، اور اس فرض کے ادا کرتے میں کسی طرف سے کوتاہی یا غفلت نہیں ہوئی،

آخر نعیمہ نے ایک مرتبہ پھر لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا،

خدا کے لیے بتاؤ کیا بات ہے، تمہارے اس طرح رونے سے میرا جی ہول رہا ہے، میرے ہاتھ پاؤں سنسنانے لگے ہیں چکر آ رہا ہے مجھے، ———

شرفو میاں نے رومال آنکھوں پر سے ہٹایا، اور وہی ہاتھ قمر کے سر پر رکھ کر اسے اپنی طرف کھینچا، اور اس کا سر اپنے سینہ سے لگا کر گلوگیر آواز میں فرمایا،

"میری بچی، میری بیٹی" ———

اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکے، پھر بے تحاشہ رونے لگے۔

نعیمہ ایک قدم بڑھ کر اور قریب آ گئی، اس نے شرفو میاں کا ہاتھ پکڑ کر، جھنجوڑتے ہوئے ذرا سخت لہجہ میں کہا۔

یہ کیا تماشہ بنا رکھا ہے تم نے، ؟ ——— کچھ تو منہ سے بولو، آخر کیوں رو رہے ہو؟ اور اس رونے کا میری شہزادی سے کیا تعلق ہے؟

شرفو میاں نے، رندھے ہوئے لہجہ میں کہا،

"خلیق ———

نعیمہ، اور دوسرے حاضرین (قمر کے سوا) سوالیہ نظروں سے شرفو میاں کی طرف دیکھنے لگے کہ اب پردہ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟ اب کیا فرماتے ہیں؟

یکایک نعیمہ کے دل میں خیال آیا کہ چونکہ رخصتی میں ٹال مٹول

ہو رہی ہے، اور خلیق، اب اونچے سرکاری عہدے پر مامور ہو چکا ہے، ایک سے ایک اچھے گھرانے میں شادی کر سکتا ہے، ضرور کہیں اس نے معاملہ کر لیا ہے، اور قمر کو طلاق دے دی ہے، یہ سوچ کر انہیں دھچکا تو لگا، لیکن بہرحال اپنے حواس بجا کر کے بجھے ہوئے لہجہ میں کہنے لگیں۔

"شاید خلیق نے انتظار سے تنگ آکر طلاق دے دی، ——

دے دی تو کیا ہوا، کیا میری لڑکی کوئی بجار و ہے، اس سے ہزار درجہ بہتر داماد مجھے مل جائیں گے،"!

اب موقعہ رونے کا نہیں   کا تھا،!

اب موقعہ خاموشی کا نہیں بالیسی کا اعلان کرنے کا تھا۔!

یہ موقع مہربان قدرت نے کس قدر جلد فراہم کر دیا تھا۔!

شرفو میاں نے قمر کے سر سے اپنا دست شفقت ہٹا کر برہم لہجہ میں کہا۔

"کیا بکتی ہو، ——

نعیمہ بھی اس وقت دبنے کے موڈ میں نہ تھی،

"تو کیا جھوٹ بکتی ہوں"!

شرفو میاں نے بلند آہنگی کے ساتھ کانپتے ہوئے کہا۔

"خدا کی بندی، خلیق نے اگر طلاق دے دی ہوتی تو بھی کسی نئے داماد کا کیا سوال تھا؟ لیکن وہ تو مر گیا، اس کی جیپ کسی لاری سے ٹکرائی، اور وہیں آن کی آن میں بلکہ چشم زدن میں اس نے جان دے دی۔

اب قمر بیوہ ہے، ــــــــ کیا بیوہ لڑکی کے لیے بھی تو داماد ڈھونڈھو ونتے گی احمق، ــــــــ

یہ کہہ کر اٹھا ہوا دست شفقت پھر قمر کے سر پر رکھا، اور ہچکوں اور ہچکیوں رونے لگے، نعیمہ کو شوہر کی یہ باتیں سخت ناپسند ہوئیں یہ استدلال بھی پسند نہ آیا، لیکن موقعہ تو فریاد و ماتم اور نوحہ و شیون کا تھا نہ کہ بحث و گفتگو کا، بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا،

ہائے میری بچی، ــــــ خلیق مر گیا، ؟

شرفو میاں نے روتے روتے بھی اس سوال کا جواب دینا ضروری سمجھا،

ہاں، ــــــ مر گیا،

اور وہ پھر رونے لگے،

اور اکیلے وہی کیا، سارا گھر ماتم کدہ بن گیا۔ کون تھا جو رو نہیں رہا تھا، !

کون تھا جس کی آنکھوں سے آنسو نہیں رواں تھے، ؟

ہاں ایک قمر تھی، جو صورت تصویر باپ کے پہلو بہ پہلو خاموش کھڑی تھی، اس کی آنکھ سے آنسو کا ایک قطرہ بھی نہیں ٹپکا تھا،

وہ گم صم کھڑی تھی، !

اتنی ہی دیر میں اس کا چہرہ گلرنگ سفید پڑ گیا تھا۔

اسے خلیق کے مرنے کی نہ خوشی تھی، نہ کوئی خاص غم، وہ نہ اس کی

صورت آشنا تھی، نہ رو آشنا س، بلکہ ایک حد تک یہ خبر سن کر پہلے پہل اس سے سکون سا محسوس کیا تھا!

ایک نامعلوم انقلاب جو اس کی زندگی کے دروازے پر دستک دے رہا تھا، خود بخود لوٹ گیا،

زندگی کا ایک اجنبی سا تصور گھر آکر پلٹ گیا،

یہ زندگی جو اپنے گھر میں وہ بسر کر رہی تھی، اچھی تھی یا بُری اس پر اس نے کبھی غور نہیں کیا تھا، لیکن ۲۲ سال تک اسی سے آشنا رہی تھی، اور اس کی عادی ہو گئی تھی، اسے چھوڑ کر ایک نئی زندگی میں جہاں کی ہر چیز انجانی تھی، اور اجنبی تھی، داخل ہوتے ہوتے وہ گھبراہٹ سی محسوس کر رہی تھی - !

خلیق کے انتقال نے یہ گھبراہٹ رفع کر دی!

پھر بھی اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا، ایسا ستا ہوا نظر آ رہا تھا جیسے کسی نے رومال نچوڑ لیا ہو،

کیوں ـــــــ؟

اس لیے کہ باپ کے منہ سے اپنے لیے "بیوہ" کا لفظ سنکر وہ دہشت زدہ ہو گئی تھی،!

خلیق کے مرنے کا اب اسے غم ہوا، !

بیوگی کے مقابلہ میں ہر دکھ، ہر مصیبت، ہر تکلیف برداشت کرنے کو وہ تیار تھی، اب ـــــــ ایک انجانی اور اجنبی دنیا میں داخل

ہونے پر بھی ـــــــ !،

بیوہ کا نام سنتے ہی اس کا بدن لرزنے لگا۔

کسی بیوہ عورت کو دیکھ کر اس کا خون جمتا ہوا محسوس ہونے لگتا تھا،

کسی بیوہ عورت کو دیکھ کر وہ دل ہی دل میں خدا سے دعا مانگنے لگتی تھی،

خدایا کسی عورت کو بیوہ نہ بنایو۔!

اس کے خاندان میں کئی ادھیڑ اور بوڑھی بیوائیں موجود تھیں محض بیوہ ہونے کے جرم میں ان غریبوں کی جو درگت بنتی رہتی تھی، وہ اس کے سامنے تھی، !

یہ بیوہ عورتیں اچھوت سمجھی جاتی تھیں، !

خاندان کی کسی تقریب مسرت میں ان کا وجود برداشت نہیں کیا جاتا تھا، !

کسی شادی بیاہ کی محفل میں کوشش کی جاتی تھی کہ یہ نہ آنے پائیں۔ اور اگر اس گھر میں یہ محفل ہورہی ہو جہاں یہ ہیں تو کوشش کی جاتی تھی کہ دلہن پر ان کا سایہ نہ پڑنے پائے، !

محبت سے بے تاب ہو کر کوئی بیوہ عورت، اگر اپنی بھتیجی، بھانجی یا کسی اور لڑکی کو دلہن بنا دیکھ کر ضبط نہ کر سکتی اور قریب پہنچ جاتی تو نہایت ذلت کے ساتھ وہاں سے نکال دی جاتی، نہ اس کی عمر کا لحاظ کیا جاتا نہ بڑے پن کا

اسے طعنے دیے جاتے، !

اسے منحوس قرار دیا جاتا، صاف الفاظ میں اس سے کہا جاتا کہ تم ڈائن ہو اپنے شوہر کو کھا گئیں، ادھر کس لیے آئی ہو'؟،

اور وہ بیچاری، ایک مجرم کی طرح الٹے پاؤں چلی جاتی،!

خلیق کا حادثۂ مرگ ـــــ قمر بھی سوچ رہی تھی کہ میں اب بیوہ ہوں میں بھی اس صف میں پہنچ گئی، جہاں زندگی حرام ہے'،!

میں اپنے بھائیوں کی شادی میں شرکت نہیں کر سکوں گی'!

میں اپنے بھائیوں کی بیویوں کو ڈولے سے نہیں اتار سکوں گی،

خاندان کی تقریبات مسرت میں مجھے داخلہ کی اجازت نہ ہوگی،

میں بھی منحوس سمجھی جاؤں گی،!

مجھے بھی طعنے دیے جائیں گے،!

میں بھی ڈائن قرار دی جاؤں گی، جس نے اپنے شوہر کو کھا لیا،!

یا اللہ کیا اس کے بعد بھی میں زندہ رہ سکوں گی؟"

دفعتہً اس کا ذہن ستی کی رسم کی طرف گیا، وہ سوچنے لگی،

میرا، اور میری طرح، ہر مسلمان کا، اور مسلمانوں کی طرح ہندوؤں کا، اور عموماً ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد کا خیال ہے کہ یہ بڑی ظالمانہ رسم تھی، انسانیت پر اکبر کا، اور اس کے بعد انگریزوں کا یہ بہت بڑا احسان ہے کہ اس رسم کو پوری قوت کے ساتھ بند کر دیا گیا۔

کیا واقعی ستی کی رسم ظالمانہ تھی؟

بظاہر اس سے بڑھ کر لرزہ خیز اور ظالمانہ بات کوئی نہیں ہو سکتی کہ

بیوی مرے ہوئے شوہر کے ساتھ زندہ جلا دی جائے، !

لیکن ایک بیوہ کو جو طعنے سننا پڑتے ہیں، جو ذلیل زندگی بسر کرنا پڑتی ہے، جس طرح اس سے اچھوتوں کا سا برتاؤ کیا جاتا ہے جس طرح اسے منحوس خیال کیا جاتا ہے، جس طرح تقریبات مسرت میں اس کا بائیکاٹ کیا جاتا ہے، جس طرح اس کی زندگی اجیرن کر دی جاتی ہے، جس طرح قدم قدم پر اس کے لیے خود کشی کے سامان فراہم کیے جاتے ہیں، ان حالات کی روشنی میں ستی کی رسم سے زیادہ عادلانہ اور رحم سے بھری ہوئی، کوئی اور چیز ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

ایک مرتبہ عورت شوہر کی چتا کے ساتھ جل گئی،

یہ ہر روز، بلکہ بعض دفعہ دن میں کئی کئی مرتبہ مرنے کی مصیبت سے تو ستی کے بعد نجات مل جاتی ہے،

ان لوگوں کے انسانیت دوست ہونے میں شبہہ نہیں، جنھوں نے ستی کی رسم ایجاد کی تھی، !

بیوہ عورت کے مسائل کا حل اس سے عمدہ کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا،

جس سماج نے یہ مسئلہ پیدا کیا ہے، اسی سماج نے اس کا حل بھی پیدا کر لیا ہے، جو بظاہر کتنا ہی تلخ، اور ناخوش گوار کیوں نہ ہو، لیکن عملاً اس کے مفید ہونے میں شبہہ نہیں، !

بیوہ عورت کو کہیں پناہ نہیں مل سکتی، ——— سوا آگ کے شعلوں کے، !

وہ سوچ رہی تھی، قدرت کا یہ کتنا بڑا ظلم ہے کہ میں بیوہ تو ہو گئی لیکن ستی نہیں ہو سکتی۔!

یا اللہ اب کیا ہوگا، ؟

میں بیوہ ہوں،، !

اب میرے ساتھ بھی وہی سلوک ہوگا جو بیوہ عورتوں کے ساتھ ہوتا رہتا ہے،، !

یہ سوچتے سوچتے، اس کے پیروں میں لرزش ہوئی، سر چکرانے لگا، آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا، باپ کے سینہ سے اگر وہ ٹکنے کی کوشش نہ کرتی تو ضرور پختہ فرش پر دھڑم سے گرتی، اور کاسۂ سر لہولہان ہو جاتا،، !

اس کی یہ حالت دیکھ کر، بجلی کی سی تیزی سے نعیمہ لپکی، اس نے قمر کو گرنے سے روکا، اتنے میں شرفو میاں بھی مدد کو تیار ہو گئے، ماما ئیں، اور خادمائیں بھی ہاتھ بٹانے کو موجود ہو گئیں، سب نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور جلدی سے لے جا کر، کمرہ میں بستر پر لٹا دیا۔

نعیمہ نے حقارت بھری نظروں سے شوہر کو دیکھا، اور گویا ہوئی،

اب تو جی ٹھنڈا ہوا لڑکی کا یہ حال دیکھ کر ؟ اتنی آمادگی، اور عجلت کے ساتھ یہ خوش خبری سنانے کی اسے ضرورت کیا تھی ؟۔

______ کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو، ڈاکٹر کو بلاؤ گے، یا
میں خود برقعہ اوڑھ کر باہر نکلوں، دانت بیٹھ گئے ہیں میری نازوں
کی پالی بچی کے، وہ بیہوش پڑی ہے، ______

---

(۴)

شاید نعیمہ شرفو میاں کی اور خیر لیتی، لیکن وہ جلدی سے باہر چلے گئے، کہ ڈاکٹر کو بلوائیں، لیکن باہر جا کر سوچا، اس گھر میں آج تک کسی عورت کی نبض ڈاکٹر نے نہیں دیکھی، پردہ میں ہاتھ ڈال کر بھی نہیں، اب تو صرف نبض نہیں بلکہ، منہ، ہاتھ، آنکھ، سب کچھ دیکھنے کی ضرورت ہے، ——— نہیں ڈاکٹر نہیں آئے گا، وہ اس فیصلہ پر پہنچے ہی تھے کہ قدرت ایک مرتبہ پھر دستگیری پر آمادہ ہو گئی۔

جس طرح خلیق کی وفات کا تار شرفو میاں کے پاس آیا تھا، اسی اس کے باپ کے پاس بھی آیا تھا، وہاں سے یہ خبر بہت جلد عام

ہوگئی، حکیم صاحب سراپا اخلاق و انسانیت بزرگ تھے، وہ بیٹھے مطلب کر رہے تھے، مریضوں کا انبوہ جمع تھا، لیکن یہ خبر سنتے ہی مطلب برخاست کر کے، پہلے وہ خلیق کے ہاں تعزیت کے لیے گئے، پھر وہاں سے سیدھے اپنی ٹمٹم میں بیٹھ کر شرفو میاں کے ہاں آئے، یہاں اس وقت پہنچے، جب شرفو میاں گویا بیوی کے ہاتھ سے پٹ کر باہر آئے تھے، اور چہ کیمز میں پڑے تھے، ایک طرف قمر بیہوش پڑی تھی، اور اسے ہوش میں لانے کے لیے بہرحال کسی معالج کے خدمات کی ضرورت تھی، دوسری طرف وہ اپنے روایات خاندانی کو توڑ کر، کسی ڈاکٹر کو بلانا نہیں چاہتے تھے کہ اندھیرے میں روشنی کی کرن چمکی، اور حکیم صاحب تشریف لے آئے، ساری مشکل حل ہوگئی، حکیم صاحب ابھی تعزیت کے پورے الفاظ بھی نہ کہہ پائے تھے، کہ شرفو میاں نے کہا۔

" قبلہ، قمر کی حالت بہت نازک ہے، وہ بیہوش ہوگئی ہے، اس کے دانت بیٹھے ہوئے ہیں، نبض بھی بہت کمزور ہے،"!

پھر وہ رونے لگے، اور روتے ہوئے گویا ہوئے،

"ہائے میری جوان جہان لڑکی، جو مجھے جان سے زیادہ عزیز تھی، اس جوانی میں یہ غم اسے دیکھنا لکھا تھا، ———— ماموں جان اب وہ نہیں بچ سکتی، مر جائے گی، ضرور مر جائے گی"!

حکیم صاحب نے بزرگوں کی طرح ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"کیا بکتے ہو، مر کیسے جائے گی، ؟ مرنا انہیں چاہیے جو زندگی کی بہاریں دیکھتے دیکھتے بوڑھے ہو چکے ہیں، اس نے ابھی دنیا کا کیا دیکھا ہے، وقتی غم ہے، بیہوش ہو گئی، انشاء اللہ ابھی ہوش میں آجائے گی، چلو، مجھے لے چلو بچی کے پاس ——

مشرفو میاں آگے آگے، اور حکیم صاحب پیچھے پیچھے گھر میں داخل ہوئے، ان کے داخل ہوتے ہی غلغلہ مچ گیا، حکیم صاحب آ گئے، حکیم صاحب آ گئے، ان کی مسیحا نفسی کی اتنی دھوم تھی کہ نعیمہ نے بھی اطمینان کا سانس لیا، وہ قمر کے کمرہ سے دوڑی دوڑی باہر آئی، اور ماہی بے آب کی طرح تڑپتے ہوئے، حکیم صاحب کا دامن اپنے ہاتھ میں لے کر،

"ماموں —— خدا کے لیے میری بچی کو بچا لیجیے۔ !"

نعیمہ کا حال دیکھ کر حکیم صاحب کا دل بھر آیا، انھوں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"بیٹی، پریشان کیوں ہوتی ہو اچانک غم اور صدمہ کے موقعہ پر آدمی بیہوش ہو جاتا ہے، آؤ، میں دیکھوں، ——

نعیمہ اور مشرفو میاں کے ساتھ حکیم صاحب قمر کے کمرہ میں داخل ہوئے، !

وہ ایک تنگ مسہری پر بیہوش پڑی تھی، بہت توجہ اور انہماک بہت توجہ اور انہماک سے حکیم صاحب نے قمر کا معائنہ کیا،

ایک کاغذ پر کچھ دوائیں لکھ دیں، اور شرفو میاں سے کہا۔

کسی کو بھیج کر میرے دواخانہ سے یہ دوائیں ابھی منگوالو، ——
میں اسوقت تک یہاں سے نہیں ہٹوں گا، جب تک بچی کو ہوش نہ
آجائے، اور اس کی حالت خطرہ سے باہر نہ ہوجائے۔!،

شرفو میاں نے وہ رقعہ خادمہ کے حوالہ کیا، وہ دوڑی دوڑی
گئی، اور برونٹھے میں کھڑی ہو کر پردہ کی آڑ سے، ملازم کو دیا، اور تاکید
کی،

"ہوا کی طرح جاؤ اور ہوا کی طرح آؤ یہ دوائیں لے کر،!"

ملازم بھی ثمر کی بیہوشی سے گھبرایا ہوا تھا، اس نے کہا۔

"ابھی لو، —— چٹکی بجاتے ہیں لایا،!

ادھر حکیم صاحب کے منہ سے خطرہ کا لفظ سنکر، نعیمہ نے پیکر اضطراب
بن کر سوال کیا۔

"میرے ماموں، خدا اور رسول ص کا واسطہ سچ سچ بتا دیجئے کیا
میری بچی کی حالت خطرناک ہے،!"

حکیم صاحب متقی اور پرہیزگار قسم کے آدمی تھے، انھوں نے شرفو
میاں کی طرح ظاہری طور پہ مذہب کا جامہ نہیں پہنا تھا، بلکہ
حقیقی معنی میں دیندار آدمی تھے، خدمت خلق ان کی زندگی کا مشغلہ
تھا، نادار اور مفلس مریضوں کو نہ صرف دوا مفت دیتے تھے
بلکہ ان کی مالی امداد بھی کرتے تھے، ایسے انتہا مصروف زندگی بسر کرنے

گے عادی تھے، لیکن بڑی سے بڑی مصروفیت بھی، ان کی نماز قضا کرنے کا سبب نہیں بن سکتی تھی، بلکہ بعض قریبی لوگوں کا کہنا تھا، تہجد تک بھی ناغہ نہیں ہونے پاتی تھی، جیسا پاک دل تھا، ویسی ہی پاک صورت بھی تھی، خود بخود ان کے پاس بیٹھ کر، ان کی باتیں سننے کا جی چاہتا تھا، ان کی شخصیت میں، صورت میں، کردار اور سیرت میں بلا کی کشش تھی، یہی وجہ تھی کہ مایوس العلاج مریض بھی ان کی دو باتیں سنکر پر امید ہو جاتا تھا، نازک سے نازک حالت میں بھی اگر حکیم صاحب پہنچ جائیں تو مریض یہ سمجھتا تھا کہ ——— نبض مریض پنجہ عیسیٰ میں آگئی ، ! ———

نعیمہ نے سیدھے سادھے لفظوں میں اگر قمر کی صحت کے بارے میں سوال کیا ہوتا تو شاید پیشہ ورانہ طور پر حکیم صاحب دروغ مصلحت آمیز سے کام لے کر کہہ دیتے۔

نہیں کوئی خطرہ کی بات نہیں ہے، !"

لیکن نعیمہ نے خدا و رسول کا واسطہ دیا تھا، اور یہ واسطہ سننے کے بعد دروغ مصلحت آمیز بھی ان کے نزدیک کفر تھا، انھوں نے کہا۔

بیٹی، ——— بچی کی حالت واقعی خطرناک ہے، ———

نعیمہ رونے لگی،

میرے ماموں، ——— کیا وہ بچ جائے گی ؟"

معمر اور کہن سال آدمی کو بھی یک بیک نہیں سنانی چاہیے، دل کی دھڑکن بند ہونے میں دیر ہی کیا لگتی ہے'!"

ذرا سے رکے ذرا حکیم صاحب رکے، پھر فرمایا،

"ضرور تم نے یک بیک یہ خبر قمر کو سنائی ہے،!"

نعیمہ نے خوں خوار نظروں سے شرفو میاں کو دیکھا اور حزن کے گھونٹ پی کر رہ گئی، منہ سے کچھ نہ بولی، حکیم صاحب نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا،

اور ضرور تم لوگوں نے، اور شاید نعیمہ بیٹی تم ہی نے، اس کے سامنے فوراً ہی گریہ و بکا کا سلسلہ بھی شروع کر دیا ہوگا، اور ماتم بھی کرنے لگی ہو، سوچو تو سہی، ان باتوں کا قمر کے قلب نازک پر کتنا اور کیسا گہرا اثر پڑا ہوگا،!؟

اب نعیمہ ضبط نہ کر سکی، اس نے کہا،

ماموں کیا کہوں آپ سے، (شرفو میاں کی طرف اشارہ کر کے؛

یہ تو قبل از وقت سٹھیا گئے ہیں، تار پاتے ہی گھر میں آئے، وہ بیچاری کھانا پکا رہی تھی بیٹھی ہوئی، پاس کھڑے ہو کر اسے اپنے پاس بلایا، اور پھر بھوں بھوں رونا شروع کر دیا، پندرہ منٹ تک تو روتے رہے! پھر میرے پوچھنے پر بتایا کہ خلیق کا انتقال ہو گیا،

حکیم صاحب نے ملامت آمیز نظروں سے شرفو میاں کو دیکھا، اور فرمایا،

بڑی نادانی کی بات کی تم نے ؛ —— سمجھدار ہو کر ایسی حماقت ؟
چاہیے تھا نعیمہ کو بلا کر، تنہائی میں اسے یہ خبر سناتے، پھر طریقہ سے کئی وقفوں میں قمر کو بتاتے، پہلے اس کے سامنے پریشانی کا اظہار کرتے کہ کیا بات ہے خلیق کا کوئی خط نہیں آیا بہت دنوں سے، پھر تھوڑی دیر کے بعد بتاتے، ابھی اطلاع ملی ہے کہ جیپ اور لاری کے تصادم میں وہ زخمی ہو گیا ہے، خدا کرے بچ جائے، میں ٹرنک کال کرتا ہوں، پھر کہتے میں نے ٹرنک کال کیا ہے ڈاکٹر حالت نازک بتاتے ہیں، پھر گھنٹہ دو گھنٹہ کے بعد اس کے انتقال کی خبر سنا دیتے، ——
—— شرفو میاں اس طرح تو کوئی بڑی خوش خبری بھی نہیں سنائی جاتی !،
نعیمہ نے کہا،
آپ ہی دیکھئے، کتنی بڑی غلطی کر گزرے ہیں یہ '!'
حکیم صاحب نے نعیمہ کی تائید کرتے ہوئے فرمایا،
ہاں بھئی، کوئی شبہہ نہیں بہت بڑی غلطی سرزد ہوئی ان سے '! —
خیر اللہ نے اپنا فضل کیا، خطرہ ٹل گیا، بچی اچھی ہو جائے گی، لیکن مکمل طور پر تندرست ہونے میں کافی دن لگ جائیں گے '!
نعیمہ نے بے پروائی سے کہا،
"میری بچی زندہ رہے، میں اس کی ناز برداری، اور تیمار داری زندگی بھر کرتی رہوں گی '!"
حکیم صاحب نے پوچھا،

قمر نے کوئی جواب نہ دیا، بے بسی سے ماں کو دیکھا اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، نعیمہ نے اور زیادہ بے قرار ہو کر کہا،

"میری بچی تو کس لیے روتی ہے؟ ——— نہیں تو بیوہ نہیں ہے، تو نے تو اپنے شوہر کی شکل بھی نہیں دیکھی، تو نے کبھی اس سے بات بھی نہیں کی، خالی دو بول پڑھ لینے سے یہ اندھیر تو نہیں ہو سکتا کہ تو بیوہ سمجھ لی جائے"

قمر ٹکٹکی باندھ کر ماں کو دیکھنے لگی، شرفو میاں کو نعیمہ کی ان باتوں میں ایک نیا خطرہ مچلتا ہوا نظر آیا، یہ عورت تو اپنی مامتا کے جوش میں سارا کھیل بگاڑے دے رہی ہے، یہ لڑکی کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر دینا چاہتی ہے کہ یہ بیوگی صرف نام نہاد قسم کی ہے، اس کی زندگی کا سورج پھر طلوع ہوگا، وہ پھر دلہن بنے گی، حالانکہ یہ نہیں ہو سکتا، یہ نہیں ہونا چاہیے، بے بس انسان قدرت کے فیصلے کے آگے سر جھکا دینے پر مجبور ہے، گر بہ کشتن روز اول کے مصداق اس فتنہ کو انھوں نے یہیں کچل دینا چاہا، حکیم صاحب کے پاس بیٹھے بیٹھے شیر کی طرح دھاڑے،

"یہ کیا بکواس لگا رکھی ہے تم نے۔"

نعیمہ نے بے بسی کے ساتھ حکیم صاحب کی طرف دیکھا، اور کہا،

"ماموں خدا کے لیے اس جلاد کی زبان بند کیجئے، یہ میری بچی کی جان لے کر رہے گا، لیکن اس کے مرنے سے پہلے میں اپنی اور

اس کی جان ایک کر دوں گی،"

قمر کے ہوش و حواس اب بجا ہو چکے تھے، باپ اور ماں کی اس لفظی تکرار سے اس نے یہ نتیجہ اخذ کر لیا تھا کہ جب تک میری ماں زندہ ہے، میں اس طرح کی ہولناک اور بھیانک بیوہ عورت نہیں بن سکوں گی، جیسی میرے خاندان میں دوسری بیوائیں ہیں، یہ سہارا ابھی اس کے لیے کافی تھا، اس نے آہستہ سے ماں کا ہاتھ دبایا، جس کا مطلب یہ تھا کہ چپ رہو، جھگڑا مت کرو، بیٹی کا یہ اشارہ پا کر نعیمہ نے خاموشی اختیار کر لی، اور حکیم صاحب نے شرفو میاں کو ڈانٹا۔

"نہایت احمق انسان ہو، بالکل نہیں جانتے کون بات کس وقت کی جاتی ہے، خاموش ہو جاؤ، اگر خاموش نہیں بیٹھ سکتے، تو باہر چلے جاؤ۔"

شرفو میاں نے ہدایت کے آخری حصہ پر عمل کیا اور باہر تشریف لے گئے، باہر پہنچے تو تعزیت کے لیے کئی آدمیوں کو موجود پایا، پھر لوگوں کے آنے جانے کا سلسلہ شروع ہو گیا، ادھر زنان خانے میں ڈولیوں اور پالکیوں کا تانتا لگ گیا، دور، نزدیک، پاس پڑوس کی، بی بیاں پرسا دینے کے لیے آنے لگیں، نعیمہ نے سوچا، اگر مجلس ماتم قمر کے کمرہ میں قائم ہوئی تو اس کی حالت پھر غیر ہو جائے گی، انھوں نے دلاری اور رسولن کو بلایا، دلاری نوعمر تھی، رسولن عمر رسیدہ، رسولن سے کہا۔

"جتنی بیبیاں ہیں، انھیں میرے کمرہ میں بٹھاؤ، میں وہیں آتی ہوں، یہاں اگر کوئی آگیا تو تمہاری خیر نہیں۔"

رسولن تعمیل حکم کے لیے چلی گئی، اس کے جانے کے بعد دلاری سے کہا۔

"بیٹی تو میری شہزادی کے پاس بیٹھ، اس سے باتیں کر، اس کا جی بہلا۔"

پھر انھوں نے قمر کو مخاطب کیا،

"میرے چاند، اگر تو میری زندگی چاہتی ہے تو اپنی جان پر کوئی صدمہ نہ لے، تیرے پاس میں کسی کو نہ آنے دوں گی، تو آرام سے یہیں لیٹی رہ، پرسا دینے کے لیے جو بی بیاں آئی ہیں، ذرا ان کے پاس ہو آؤں، تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد تیری خبر لینے آتی رہوں گی۔"

یہ کہہ کر نعیمہ نے ایک مرتبہ پھر قمر کو پیار کیا اور اپنے کمرہ میں چلی گئی۔

نعیمہ جب اپنے کمرہ میں پہنچی تو بارہ پندرہ بی بیاں آچکی تھیں، اور کہاروں کی آواز بار بار کسی نئی بی بی کی تشریف آوری کی خبر دیتی تھی، نعیمہ جب اپنے کمرہ میں پہنچی، تو جتنی بیبیاں موجود تھیں، وہ سب باری باری سے اس سے لپٹ لپٹ کر رونے لگیں، نعیمہ کے آنسو تو خلیق کے انتقال کی خبر سننے کے بعد سے اب تک نہیں رکے تھے، اس لیے اسے رونے میں یا آنسو بہانے میں کوئی خاص جدوجہد نہیں کرنا

پڑی، مشکل ان بیبیوں کو ہوتی جنھیں بہر حال رونا تھا، اور نعیمہ سے زیادہ رونا تھا، لیکن زمانہ انسان کو سب کچھ سکھا دیتا ہے، انھوں نے بھی حسب ضرورت اور حسب موقع رونے کا فن سیکھ رکھا تھا، چنانچہ گریۂ بے اختیار کے مظاہرہ میں انہیں بھی کوئی خاص تکلف نہیں کرنا پڑا،

جب سب بیبیاں آچکیں اور باری باری سے ہر ایک نے آنسو بہا لیے تو مطلع اس طرح صاف ہو گیا جس طرح بادلوں کے منتشر ہونے کے بعد چاند چمکنے لگتا ہے،

نعیمہ سے پان وغیرہ کھانے کے بعد ہر ہر بی بی نے اپنے طور پر حادثے کی تفصیل نہایت دلچسپی کے ساتھ پوچھی، لیکن نعیمہ کا جواب اتنا ہی مختصر تھا جتنا تار، !!

یہ موضوع جب زیادہ نہ چلا تو ایک نیا موضوع چھڑ گیا، یعنی،

"ہا! بیلے پیاری قمر، !"

دوسری طرف سے آواز آئی -

"رونا تو اس کا ہے کہ ابھی رخصتی بھی نہیں ہوئی تھی کہ یہ حادثہ پیش آگیا ہے"

ایک اور گوشہ سے آواز آئی،

یہ پہاڑ سی زندگی بیچاری کو سوگ میں کاٹنی پڑے گی -"

مثال میں پوپلے منہ والی ایک بی بی نے جن کی عمر ستر سال سے کم نہ

ہوگی، اپنے آپ کو پیش کیا، اور فرمایا۔
"میں سولہ سال کی تھی کہ وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے، ساری زندگی انھیں کی یاد میں بسر ہوگئی، اب تو بس ایک تمنا ہے کہ موت جلد آ جائے۔"

ہمدردی کی نظروں سے کئی بی بیوں نے ان بڑی بی کو دیکھا، پھر ایک صاحبہ بولیں،

"ہاں بھئی، شرافت نام اسی کا ہے، ایک مرتبہ جس کا منہ دیکھ لیا، پھر اسی کے نام پہ زندگی کاٹ دی، خدا بخشے میری بڑی بہن جن کا ابھی پچھلے سال ساٹھ برس کی عمر میں انتقال ہوا ہے، تیرہ سال کی عمر میں بیوہ ہو گئیں تھیں، لیکن بہن میں کہتی ہوں یہ پرانے لوگ کس مٹی کے بنے ہوتے تھے، اللہ بخشے تیرہ سال کی عمر میں بیوہ ہوئیں اور ساٹھ برس کی عمر میں مریں، لیکن مرتے دم تک پھر کبھی کسی نے نہ انھیں مسکراتے دیکھا، نہ ریشمی کپڑے پہنتے دیکھا، نہ زیور سے شوق باقی رہا، حد یہ ہے کہ کنگھی چوٹی اور سرمنہ تک انھوں نے چھوڑ دیا، جھبڑی جھبڑی سارے گھر میں گھوما کرتی تھیں۔"

بات میں بات نکلتی ہے، اتنی ساری باتیں اور مثالیں سننے کے بعد پاس بیٹھی ہوئی ایک خاتون جو اپنا تک ضبط سے کام لے رہی تھیں، بے قابو ہو کر آخر بول اٹھیں،

"خدا جنت نصیب کرے، ہماری خالہ جان کہ جس دن وہ

پیدا ہوئیں، اس دن ان کے ماموں کے ہاں لڑکا پیدا ہوا، اور اسی وقت دونوں کی منگنی ہو گئی، خدا کا کرنا کیا ہوا چھ مہینے کے بعد وہ لڑکا مر گیا، خالہ جان خدا انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے خیر سے جوان ہوئیں، بڑی خوب صورت تھیں، چندے آفتاب چندے ماہتاب، اور بہن جہاں بیری کا درخت ہوتا ہے، وہاں ڈھیلے آتے ہی ہیں، پیام آنا شروع ہو گئے، فلاں زمیندار کے لڑکے کا پیام آگیا، فلاں ڈپٹی کلکٹر کے لڑکے کی نسبت لے کر آگئے، ایک سے ایک پیام آیا، جب بہت سے پیام جمع ہو گئے، تو ایک دن ان کے ماں باپ یہ غور کرنے کے لیے بیٹھے کہ ان میں سے کسے منتخب کیا جائے، خالہ کو جو معلوم ہوا، انھوں نے فوراً ایک کاغذ پر اپنی ماں کو مخاطب کر کے لکھا،

" شریف عورت کی شادی دو مرتبہ نہیں ہوتی، میرے نزدیک نسبت اور شادی میں کوئی فرق نہیں ہے، جس سے میری نسبت ہوئی تھی اسے خدا نے اٹھا لیا میں اب بیوہ ہوں اور زندگی بھر بیوہ رہوں گی، اگر میری مرضی کے خلاف فیصلہ کیا گیا تو زہر کھا لوں گی۔"

ماں باپ نے لاکھ لاکھ سر ٹپکا، مگر خالہ جان نے نہ ماننا تھا، نہ مانیں، آخر اپنے شوہر کے غم میں گھل گھل کر مر گئیں، کہتے ہیں مرتے وقت ان کی عمر صرف ۲۵ سال کی تھی۔"

نعیمہ کو ان باتوں سے بڑی وحشت ہو رہی تھی، لیکن وہ زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتی تھی کہ خاموش رہے، کسی کو بولنے سے منع نہیں کر سکتی تھی، وہ چاہتی تھی اس تلخ موضوع پر گفتگو کا سلسلہ ختم ہو جائے، کچھ دوسرے قسم کی باتیں ہوں، اور یہ سلسلہ بند ہو جائے قدرت نے اس کی مدد کی، اس کے پاس بیٹھی ہوئی ایک سن رسیدہ خاتون نے ان بی بی سے مخاطب ہو کر جو اپنی خالہ جان کے گن گا رہی تھیں کہا۔

"ایسی باتیں نہ کرو کہ دوسرا بھی کچھ کہنے پر مجبور ہو جائے"

انھوں نے گھور کر اپنے حریف کو دیکھا اور کہا،

"کیا کہنا چاہتی ہیں آپ؟ کیا کہہ سکتی ہیں آپ؟ کیا میں نے اپنی خالہ جان کے بارے میں جو کچھ کہا ہے، وہ جھوٹ ہے؟"

وہ اور زیادہ جوش و خروش کے ساتھ گویا ہوئیں۔

"جھوٹ، بالکل جھوٹ!"

خالہ کی بھانجی کو بڑا غصہ آیا، اور انھوں نے چیلنج کرتے ہوئے کہا،

"اگر میں جھوٹ بولتی ہوں تو آپ بتا دیجیے سچ کیا ہے؟"

وہ سچ بتانے پر تل گئیں، انھوں نے کہا،

"سچ یہ ہے کہ پہلی مرتبہ جوان ہونے کے بعد محلہ کے بابو فتح علی پر عاشق ہوئیں، دوسری مرتبہ ایک اور پڑوسی نوجوان کنور احمد علی

کو دل دے بیٹھیں، تیسری مرتبہ اپنے ایک کرایہ دار اختر مرزا پر ہزار جان سے فریفتہ ہوئیں اور تینوں ہی سے ہر ایک کو نوازا، کس منہ سے شادی کرتیں اور لطف یہ کہ ان تینوں نے دغا دی، ورنہ وہ تو ہر ایک کے ساتھ بھاگنے پہ تیار تھیں، آخر اسی غم میں سدھار گئیں اس دنیا سے۔"

خالہ کی بھانجی کا چیلنج جس انداز میں قبول کیا گیا اور اس سلسلہ میں جو انکشافات ہوئے ان کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ دونوں حریفوں میں ہاتھا پائی شروع ہو جائے، پہلے بھانجی نے کہا،

"چل چڑیل!"

اس کے جواب میں وہ بولیں،

"چڑیل تو، تیری سات پشتیں"!

بس پھر کیا تھا، ادھر سے یہ آگے بڑھیں، ادھر سے وہ، ایک کے ہاتھ میں دوسری کا گریبان، دوسری کے ہاتھ میں ایک کی چوٹی، قریب تھا کہ سر پھٹول تک نوبت پہنچ جائے، لیکن نعیمہ نے مداخلت کی اور کہا،

"بی بیو، میرے ماتم کدے کو اکھاڑا نہ بناؤ، لڑنے کا ایسا ہی شوق ہے تو اپنے گھر جا کر لڑو، میرا دل دکھا ہوا ہے مجھے نہ ستاؤ،——"

نعیمہ کی یہ اپیل کارگر ثابت ہوئی اور ایک ایک کر کے تمام بیبیاں رخصت ہو گئیں،

(۶)

رفتہ رفتہ قمر کی حالت سنبھل گئی، اس نے تندرستی حاصل کر لی، شرفو میاں اب ذرا اس سے کٹے کٹے رہتے تھے، لیکن نعیمہ کی مامتا اس پر بھی تیار نہیں تھی کہ اس کا رداں میلا دیکھ سکے، اس کی خوشی کے لیے اسے خوش دیکھنے کے لیے، اسے خوش رکھنے کے لیے وہ سب کچھ کر گزرنے کو تیار تھی۔

لیکن بعض خاندانی رسمیں ایسی تھیں، جن پر، کلیجہ پر پتھر رکھ کر وہ عمل کرنے پر مجبور تھی، !

جس وقت قمر کی چوڑیاں بل کے بٹے سے توڑی گئیں، نعیمہ کا جی چاہا وہ بھی اپنے سہاگ کی اس نشانی کو توڑ دیں، لیکن ایسا نہ کر سکیں،

قمر کو ہمیشہ وہ زرکار و زرنگار لباس میں ملبوس رکھتی تھیں، لیکن اب اسے سادہ لباس پہنایا گیا تھا، رنگے ہوئے دوپٹے کتنے شوق سے اوڑھا کرتی تھی، اب وہ سفید دوپٹہ اوڑھنے پر مجبور تھی،

جب تک خلیق کا چالیسواں نہیں ہو گیا، نعیمہ خاموشی کے ساتھ یہ جاں فرسا حالت قمر کی دیکھتی رہیں، چالیسویں کے بعد، انھوں نے، قمر کے نہیں نہیں کرنے کے باوجود اسے چوڑیاں پہنائیں، اچھے کپڑے بھی زیب جسم کیے، اور رنگا ہوا دوپٹہ اس کے سر پر رکھ دیا،

قمر نے ماں کی اور باتیں تو مان لیں، لیکن رنگا ہوا دوپٹہ اوڑھنے پر تیار نہیں ہوئی اس نے کہا،

" نہ جانے کیا بات ہے خود میرا دل نہیں چاہتا، رنگا دوپٹہ اوڑھنے کا، اس پر ضد نہ کیجیے، ! "

نعیمہ نے سوچا، چلو کیا حرج ہے آج اگر نہیں اوڑھتی چند روز کے بعد سہی۔

لیکن ان کا یہ اٹل فیصلہ تھا کہ قمر کو نہ صرف رنگین دوپٹہ اوڑھنا ہے بلکہ کچھ مدت گزارنے کے بعد شادی بھی کرنی ہے۔

کسی قیمت پر بھی وہ اسے بیوہ تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تھیں، کسی قیمت پر بھی وہ اسے سوگ کی زندگی بسر کرتے نہیں دیکھ سکتی تھیں،

ان کی نظر میں قمر کی وہی حیثیت تھی جو ایک بن بیاہی لڑکی ماں کی

نظر میں رکھتی ہے۔

شرفو میاں اب گھر میں کم ہی آتے تھے، اور جب آتے تھے تو قمر سے ان کی مڈبھیڑ شاذونادر ہی ہوتی تھی، کیونکہ وقت کا زیادہ حصہ وہ اپنے کمرے میں صرف کرتی تھی۔ کچھ کتابیں اس کے پاس تھیں کچھ ماں کے ذریعہ اس نے انوار و اظہار کو بازار بھیج کر منگوالی تھیں، زیادہ تر مطالعہ کرتی رہتی تھی، نعیمہ بھی اس شوق میں یوں ممد و معاون تھیں کہ اس طرح لڑکی کا جی بہل جائے گا، اور اس کی طبیعت بٹی رہے گی،

ایک روز شرفو میاں نے کچھ دوستوں کی دعوت کی اور نعیمہ سے کئی قسم کے کھانوں کی فرمائش کی، نعیمہ کا بوجھ بٹانے پر، قمر تیار ہو گئی، اب اس نے باورچی خانہ میں بیٹھنا اور کھانا پکانا بالکل ترک کر دیا تھا، لیکن ماں کی خاطر سے کبھی کبھی چلی جاتی تھی، آج چونکہ کئی قسم کا کھانا پک رہا تھا، لہذا آج بھی وہ پہنچ گئی، اور کئی چیزیں اس نے پکائیں اسی اثنا میں شرفو میاں آگئے، ان کی نظر قمر پر پڑی تو بھونچکے رہ گئے، پہلے تو انھیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا کہ یہ قمر ہے اس لئے کہ کہیں سے بھی یہ بیوہ نظر نہیں آرہی تھی، نہ اترا ہوا چہرا، نہ سوگ کے آثار، نہ پھٹی پھٹی آنکھیں، نہ جھبرے جھبرے بال، اس کے برعکس چوٹی کنگھی ہوئی، صاف، اور قیمتی کپڑے زیب تن، ہاتھوں میں طلائی چوڑیاں، کانوں میں بندے، صرف دوپٹہ سفید تھا، لیکن اب

اس زمانہ میں سفید دوپٹہ بیوگی کی علامت نہیں رہا ہے، اکثر لڑکیاں اور شوہروں والی عورتیں سفید دوپٹہ شوق سے استعمال کرتی ہیں،——!،

قمر کو اس حالت میں دیکھ کر شرفو میاں کانپ گئے،

ویسے انھیں قطعاً اس پر اعتراض نہ تھا کہ قمر اچھے کپڑے پہنے، اچھے زیور استعمال کرے، اور خوش رہے، لیکن ان کی نگاہ دور بین دیکھ رہی تھی کہ قمر کا یہ انداز حیات علامت ہے اس بات کی کہ نعیمہ اسے بیوہ نہیں سمجھتی، جب بیوہ نہیں سمجھتی تو اس کی شادی کا ارمان بھی رکھتی ہے،

اور شادی، کبھی اور کسی حالت میں نہیں ہو سکتی،!

قمر بیوہ ہے، اور بیوگی میں اسے ساری زندگی بسر کرنا پڑے گی،!،

یہ وقت بولنے، اور لڑنے کا نہیں تھا، جس طرح آئے تھے، اسی طرح چلے گئے، دعوت وغیرہ سے فارغ ہو کر، رات کو اطمینان سے جب اپنے کمرہ میں آرام کے لئے پہنچے تو نعیمہ بستر پر دراز ہو چکی تھی، آج اس نے بہت کام کیا تھا، دن بھر کی تھکی ہوئی تھی، پپوٹے بھاری ہو رہے تھے اور نیند آ رہی تھی، اور کوئی دن ہوتا تو شرفو میاں ہرگز اسے نہ چھیڑتے، اب عمر کی اس منزل میں چھیڑ چھاڑ کا زمانہ ہی کہاں رہا تھا، بہرحال انھوں نے اپنے بستر پر لیٹنے کے بعد کہا۔

"کیا سو گئیں ؟"
نعیمہ نے آنکھیں بند کئے کئے جواب دیا،
بڑے زور کی نیند آرہی ہے، ــــــ سارا دن کام کرتے کرتے تھک گئی ہوں، کوئی کام ہو تو رسولن یا دلاری کو بلا لو"!
شرفو میاں کو جو کام تھا اس سے دلاری یا رسولن کو کیا تعلق ہو سکتا تھا، کہنے لگے،
بھئی ایک پان تو بنا دو، پھر شوق سے سو جانا، ہم پڑے پڑے بکری کی طرح اسے چبایا کریں گے"!"
بے دلی کے ساتھ نعیمہ اٹھی، اس نے پان کا بیڑا بنا کر شوہر کو دیتے ہوئے کہا،
"لو، ــــــ اچھا شوق ہے پان کا، آدھی رات کو بھی ساتھ نہیں چھوڑتا"
شرفو میاں نے بہت بھلمنساہت کے رنگ میں کہا۔
"نہ اتنے مزے دار بناؤ، نہ شوق قائم رہے، ــــــ ہاں یہ تو بتاؤ قمر کا کیا حال ہے اب؟"
نعیمہ نے تیکھی نظروں سے شوہر کو دیکھا اور بولی،
"خدا کا شکر ہے، اچھا ہے، ــــــ کیوں؟، اس کی یاد کیوں آگئی؟"
شرفو میاں پان چبانے لگے۔

(۷)

کچھ دیر بعد شرفو میاں نے پیکر شرافت بن کر نعیمہ سے کہا،
" اب تو تم سے ڈر لگنے لگا ہے، بگڑتی ہو تو ہوش میں نہیں
رہتی ہو، جو منہ میں آتا ہے کہتی چلی جاتی ہو، معلوم ہے شوہر کا رتبہ
کیا ہے؟ خدا کہتا ہے، اگر اپنے علاوہ میں کسی کے سجدہ کی
اجازت دیتا تو عورت سے کہتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔"
نعیمہ نے بھی بال دھوپ میں سفید نہیں کئے تھے، سمجھ گئیں، یہ
بلی کا مخملی پنجہ ہے جس میں نشتر سے زیادہ تیز ناخن چھپے ہوتے ہیں،
لہٰذا، وہ بھی ہر صورت حال کا مقابلہ کرنے کو تیار ہوگئیں جواب
میں کہا،

"نہ جانے کہاں سے سن آئے ہو یہ، میں نے تو بڑے بڑے مولویوں کے وعظوں میں یہی سنا ہے کہ خدا نے مرد اور عورت کے حقوق برابر رکھے ہیں۔"

شرفو میاں نے صلح کا جھنڈا لہراتے ہوئے کہا ——"

"بھئی اس میں جھگڑے کی کیا بات ہے، برابر رکھے ہیں تو بھی ہم تمہیں اپنا بڑا مانتے ہیں، گھر تمہارا، ہم تمہارے، اولاد تمہاری اگر کہو تو خط غلامی بھی لکھ دیں۔"

نعیمہ پھر چادر اوڑھ کر بستر پر لیٹ گئی، اس نے کہا۔

"جی بخشیئے، مجھے خط غلامی کی ضرورت نہیں، سونے دیجئے۔"

شرفو میاں گھبرائے کہ شکار تو ہاتھ سے نکلا جاتا ہے، فرمایا،

"خدا کی بندی ساری رات پڑی ہے، سو جانا، ہمیں بھی سونا ہے، لیکن کچھ باتیں تو سن لو۔"

نعیمہ نے چادر کا پلو منہ سے ہٹا کر کہا،

"سُن تو رہی ہوں، کچھ کہو بھی تو۔"

وہ گویا ہوئے،

"آج میں نے قمر کو دیکھا تھا، اسے دیکھ کر میرے کلیجہ پر گھونسہ لگا۔"

نعیمہ نے یہ سوچ کر کہ شرفو میاں آخر باپ ہیں، بیٹی کے حال پر وہ نہ کڑھیں گے، تو آخر کون کڑھے گا، ٹھنڈے لہجہ میں کہا،

"تم تو کبھی کبھی دیکھتے ہو، تب تمہارے سینے پر اسے دیکھ کر گھونسہ لگتا ہے، میں تو اسے ہر وقت نظر میں رکھتی ہوں، ذرا سوچو تو سہی میری کیا حالت ہوتی ہوگی، آرے چل جاتے ہیں کلیجے پر، اسے خاموش اور افسردہ دیکھ کر، قمر اب وہ قمر ہی نہیں رہی، نہ بات کرتی ہے، نہ ہنستی بولتی ہے، نہ گھر کے کاموں میں دلچسپی لیتی ہے، ہر وقت اپنے کمرہ میں پڑی رہتی ہے۔"

شرفو میاں نے طنز کی تلخی چھپانے کی بہت کوشش کی لیکن بے ساختہ ان کے منہ سے نکل گیا۔

"آج میں نے دیکھا کپڑے تو بہت بھڑک دار پہنے تھے، کنگھی چوٹی سے بھی درست تھی، یہ تو نہ ہونا چاہیئے، تم خود بھی غلط فہمی میں مبتلا ہو اور اسے بھی غلط فہمی میں مبتلا کر رہی ہو۔"

نعیمہ یہ الفاظ سنکر چادر ایک طرف پھینک اٹھ کر بیٹھ گئی، اس نے کہا،

"اگر کہو تو اسے زہر دے دوں؟ ——"

شرفو میاں نے آنکھیں پھاڑ کر کہا،

"نعیمہ خدا سے ڈرو، میں اسکا باپ ہوں، اسے زہر دلواؤں گا؟"

نعیمہ نے اور زیادہ بپھرتے ہوئے لہجہ میں سوال کیا۔

"آخر تم چاہتے کیا ہو؟ یہ روز روز کی دانتا کلکل مجھے پسند نہیں جو کچھ دل میں ہے صاف صاف کہہ دو۔"

پر مجبور ہو جاؤں، میری تمنا ہے کہ یہ آخری سفر تم سے پہلے اختیار کروں، کسی طرح بھی اپنے آپ کو اس پر آمادہ نہیں کر سکتی کہ تم میرے سامنے اس دنیا سے رخصت ہو، میری زندگی، میرا سہاگ، میری خوشی میرا ارمان، جو کچھ ہے وہ تمہاری زندگی سے وابستہ ہے، خدا کے لئے مجھ پر رحم کرو، میرا دل نہ توڑو، مجھے مایوس نہ کرو، تمہاری ان باتوں سے میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے، جانے کیا بات ہے قمر میری زندگی بن گئی ہے، میں ہمیشہ سے اپنی ساری اولاد میں اس کو زیادہ چاہتی رہی ہوں، اور جب سے غم کا پہاڑ اس پر ٹوٹا ہے، اس وقت سے میری حالت کچھ عجیب سی ہو گئی ہے، جب اسے دیکھتی ہوں، خود بخود آنکھیں پرنم ہو جاتی ہیں، مجھے وہ زمانہ یاد آتا ہے جب میری وہی عمر تھی جو آج قمر کی ہے، میرے دل میں کیسے کیسے ولولے اٹھتے تھے، کیسی کیسی امنگیں پروان چڑھتی تھیں، کیسی کیسی آرزوئیں اور حسرتیں انگڑائیاں لیتی تھیں، میں خوش رہنا چاہتی تھی، میں خوشگوار زندگی بسر کرنا چاہتی تھی، میرے دل کو ایک رفیق زندگی کی طلب تھی، جو ہر کٹھنائی میں، ہر مصیبت میں میرا بازو تھام سکے، مجھے سہارا دے سکے، میرا سہارا بن سکے، کیا یہی حسرتیں، اور آرزوئیں، یہی امنگیں میری قمر کے دل میں، میری بچی کے دل میں انگڑائیاں نہ لے رہی ہونگی؟ کیا وہ بھی وہی کچھ نہ سوچتی ہوگی جو اس عمر میں سوچا کرتی تھی، کنترو میاں بتاؤ، کس دل سے، کس زبان سے میں اپنی قمر سے کہہ دوں، تو اپنی حسرتوں کا گلا گھونٹ دے، اپنی آرزوؤں کو زندہ

درگور کر دے، اپنے ولولوں کو خاک میں ملا دے، شاید میں یہ سب کچھ کرنے پر تیار ہو جاتی، اگر اس نے اپنے شوہر کی صورت دیکھ لی ہوتی ایک آدھ بچے کی ماں بن گئی ہوتی، زیادہ نہیں سال دو برس سہاگ کی زندگی بسر کر لی ہوتی، لیکن وہ تو اتنی ہی معصوم ہے، جتنی ایک کومل کلی، اس نے اس دنیا کا کیا دیکھا ہے، شرفو میاں، اگر تم عقد بیوگان کے خلاف ہو تو میں بھی خلاف ہوں، ٹھیک ہے ایک شریف عورت کے لئے بہت مشکل ہے کہ کسی خاص مجبوری کے بغیر دوسری شادی کا تصور بھی کر سکے۔ لیکن میری خاطر سے، اپنی بچی کی خاطر سے اتنا مان لو کہ وہ بیوہ نہیں ہے خدا کی قسم اسے بیوہ کہنا ظلم ہے، بیوہ کہکر جب تم اس کی زندگی کا آخری فیصلہ کر دیتے ہو تو میں کانپ اٹھتی ہوں، آسمان پر فرشتے بھی لرز جاتے ہوں گے۔ ایک معصوم پر یہ ظلم، ایک بے گناہ کے ساتھ یہ زیادتی؟"

یہ کہتے کہتے نعیمہ کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں کے چشمہ سے آنسوؤں کا آبشار ابلنے لگا،

لیکن شرفو میاں جو بظاہر نعیمہ کی اس تقریر سے بہت زیادہ متاثر نظر آرہے تھے، سب کچھ سننے کے بعد بولے تو یہ بولے،

"نعیمہ، تم نے جو کچھ کہا، وہ میں نے دل کے کانوں سے سن لیا، یقین کرو، مجھے قمر سے اتنی ہی محبت ہے، جتنی تمہیں ہے، اس کا رواں بھی میلا دیکھتا ہوں، تو دل تڑپ جاتا ہے، آگ لگ جاتی ہے کلیجہ میں

ہوک سی اٹھنے لگتی ہے، میرے بس میں ہو تو اس کی ہر آرزو پوری کردوں اسے خوش رکھنے کے لئے بڑے اطمینان سے اور نہایت مسرت سے اپنی جان بھی قربان کر سکتا ہوں، لیکن ایک چیز ہے جو میرے وجود سے بھی زیادہ قیمتی ہے، تمھارے وجود سے بھی زیادہ گراں مایہ ہے، قمر سے بھی اور انوار و اظہار سے بھی قیمت میں بڑھ کر ہے، جانتی ہو وہ کیا چیز ہے؟ وہ ہے خاندان! ، نعیمہ آدمی پیدا ہوتا ہے اور مر جاتا ہے، لیکن جب بہت سی نسلیں پیدا ہوتی اور اپنے وقت پر مر چکتی ہیں، تب ایک خاندان کی تشکیل ہوتی ہے، ایک خاندان کی تعمیر پر بہت سی جانیں صرف ہوتی ہیں، تب کہیں جا کر وہ مکمل ہوتا ہے، اس کے خاص روایات ہوتے ہیں، خاص رسمیں ہوتی ہیں، خاص اصول ہوتے ہیں، خاص قدریں ہوتی ہیں، ان سب کا مجموعہ خاندان کہلاتا ہے، میں مر جاؤں گا میری جگہ انوار لے لیگا، تم مر جاؤگی تمھاری جگہ قمر لے لے گی، خدانخواستہ انوار نے بھی سفر آخرت اختیار کیا تو اظہار اس کی جگہ بیٹھ جائے گا۔ لیکن میری جان! اگر خاندان مر گیا تو اس کی جگہ کون لے گا؟، اس کے مرنے کے ساتھ میں، تم، انوار، اظہار، قمر، میرے باپ، ان کے باپ، ان کے باپ کے باپ جو زندہ ہیں وہ، جو مر چکے ہیں وہ، سب نابود ہو جائیں گے، سب مٹ جائیں گے۔ میں تمھیں بہت چاہتا ہوں، لیکن خاندان سے کم، انوار و اظہار پر جان چھڑکتا ہوں، لیکن خاندان کے وقار پر انہیں قربان کر دینے میں تامل نہ کروں گا، قمر میری چہیتی بیٹی ہے اس کے لئے

ہیں آسمان کے تارے توڑ کر لا سکتا ہوں، لیکن نعیمہ کان کھول کر سن لو، خاندان پر اسے بھی قربان کر سکتا ہوں، سمجھ گئیں میرا مطلب کیا ہے؟"

نعیمہ نے کوئی جواب نہیں دیا، شرفو میاں چادر اوڑھ کر لیٹ گئے، اور تھوڑی دیر میں خراٹے لینے لگے، ان کے دل کا سارا بوجھ اتر چکا تھا، لیکن نعیمہ جاگ رہی تھی، -

(۸)

صبح ہوتے ہوتے نعیمہ کی آنکھ لگی، شرفو میاں اسے سوتا چھوڑ کے
باہر گئے، جلدی جلدی ناشتہ کیا، پھر گھوڑا کسوایا، اور اپنے دیہات
کی طرف روانہ ہو گئے، جاتے جاتے اپنے کارپرداز منشی ابو محمد صاحب
سے کہا۔

"تین چار دن کے بعد آؤں گا، کچھ ضروری کام وہاں نپٹانا ہیں، بیگم صاحبہ
اگر کچھ کہیں تو یہی کہہ دینا، ——"

دیہات کے بنگلہ میں جا کر وہ قیام پذیر ہو گئے، شکار ان کا بہترین
مشغلہ تھا، اس میں لگ گئے، درحقیقت وہ چاہتے تھے کہ تین چار
روز تک ان کا اور نعیمہ کا آمنا سامنا نہ ہو، رات جو گفتگو ہوئی تھی،
اس نے ان کے دل کو ہلا دیا تھا، وہ تو وہی اتنی زبردست قوت ارادی

کے مالک تھے کہ پراگندہ نہ ہوئے ورنہ نعیمہ نے ہر طرح سے انہیں زچ کر دیا تھا، اپنا آخری فیصلہ سنا چکنے کے بعد مصلحت یہی تھی کہ وہ نعیمہ کے سامنے سے ہٹ جائیں، تاکہ کوئی مزید بحث و گفتگو اور لڑائی جھگڑے کی نوبت نہ آئے،

نعیمہ سو کر اٹھی، منہ ہاتھ دھو کر سیدھی قمر کے کمرہ میں پہنچی، دلاری وہیں ناشتہ لے آئی، ماں بیٹی نے مل کر ناشتہ کیا، قمر نے ایک پیالی چائے کی اور دو توسٹ کھائے لیکن نعیمہ نے اصرار کر کے اسے کچھ اور چیزیں بھی کھلائیں، پھر دلاری سے کہا ——،

میری بچی کی چوٹی گوندھ دے۔"

قمر نے کچھ تامل، کچھ احتجاج کی نظر سے ماں کو دیکھا، لیکن اس کے فیصلہ کن تیور دیکھ کر خاموش ہو گئی، دلاری نے بڑے ریاض کے ساتھ اپنی یہ ڈیوٹی انجام دی، پھر نعیمہ بیگم سامنے والی کوٹھری میں گئیں، جہاں ملبوسات کے بکس رکھے تھے، ایک اچھا سا اور خوب صورت سا سوٹ نکال کر لائیں، اور قمر کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ کپڑے بدل ڈالو بیٹی!"

قمر نے ایک مرتبہ پھر بے بسی سے ماں کی طرف دیکھا، اور اسی کوٹھڑی میں جہاں سے نعیمہ کپڑے لائی تھیں، وہ لباس تبدیل کرنے چلی گئی، ذرا دیر کے بعد برآمد ہوئی تو نعیمہ اسے دیکھ کر بھونچکی رہ گئی! اس نے کہا۔

"بیٹی یہ کیا!"

قمر نے جواب دیا۔

"اماں یہ سوٹ مجھے بہت پسند ہے، آج اس کو پہن لینے دو، کل کل وہ پہن لوں گی۔"

نعیمہ کے پسند کئے ہوئے سوٹ کے مقابلہ میں یہ بالکل سادہ اور معمولی سوٹ تھا، نعیمہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر خاموش ہوگئی، وہ چاہتی تھی کہ قمر کے دل سے یہ احساس مٹ جائے کہ وہ بیوہ ہے، اور اس کی زندگی یکسر بے رنگ ہو کر رہ گئی ہے، لیکن قمر ماں کے مقابلہ میں زیادہ حقیقت پسند تھی، ماں کے جذبہ کو سمجھتے ہوئے بھی وہ حد سے قدم باہر نکالنا نہیں چاہتی تھی، اس نے تسلیم کر لیا تھا کہ وہ بیوہ ہے اور اسے ایسی ہی زندگی بسر کرنی چاہیئے، اگر وہ اچھے کپڑے پہن لیتی تھی، چوڑیاں استعمال کر لیتی، تو اس لئے نہیں کہ ان چیزوں کا شوق تھا، صرف اس لئے کہ نعیمہ کو خوش دیکھنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہ تھی، واقعہ یہ ہے کہ نعیمہ نے اس پر آشوب زمانہ میں ساری دنیا سے رو گرداں ہو کر جس طرح بیٹی کا ساتھ دیا، اس کی مثال ملنا مشکل ہے،

چند روز کے بعد شرفو دیہات سے واپس آگئے، یہ بات تو نہیں تھی کہ ان میں اور نعیمہ میں بول چال بند ہو، لیکن قمر کے معاملہ میں دونوں کے درمیان کسی طرح کی بات چیت نہیں ہوتی تھی، شرفو میاں

اپنی جگہ یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ آخری فیصلہ انھوں نے صادر کر دیا ہے، اور نعیمہ کا یہ خیال تھا کہ جب خدا نے آخری فیصلہ نہیں کیا، تو شرفو میاں کون ہوتے ہیں آخری فیصلہ کا اعلان کرنے والے،

دن اسی طرح گزرتے رہے، یہاں تک کہ ایک روز ایسا واقعہ پیش آیا، جس نے ایک مرتبہ بھرے ہوئے گھر کو تہ و بالا کر دیا۔

واقعہ یہ ہوا کہ قمر کی چچا زاد بہن کی شادی تھی، ظاہر ہے، شرفو میاں کے بھائی بھی ہر اعتبار سے دوسرے شرفو میاں ہی تھے، بڑے دبدبہ طنطنہ کے آدمی، مال و دولت کی ان کے پاس بھی کمی نہ تھی، دو لڑکیاں تھیں، دو لڑکے تھے، لڑکوں کی شادیاں ہو چکی تھیں، دو لڑکیوں کی شادیاں آج یک وقت ہو رہی تھیں، لڑکے اور لڑکی کے مابین تفریق کے شرفو میاں کے بھائی بھی قائل تھے، لیکن بہت زیادہ نہیں، جس پیمانہ پر لڑکوں کا بیاہ کیا تھا، اس سے کم پیمانہ پر سہی، لیکن کافی تزک و احتشام کے ساتھ یہ تقریب منائی جا رہی تھی۔

قدرتاً اس موقع پر شرفو میاں سب سے پیش پیش تھے، سارا انتظام انہیں کے ہاتھ میں تھا، اور جس طرح باہر کے معاملات کا چارج ان کے ہاتھ میں تھا، اسی طرح اندرون خانہ انتظام و انصرام کی ذمہ داری نعیمہ پر تھی، نعیمہ کے ساتھ قمر بھی آئی تھی، گھر کی عورتیں اور لڑکیاں اس سے محبت سے پیش آئیں، لیکن اس میں رحم اور ترس کا عنصر غالب تھا، ایک عرصہ کے بعد قمر گھر کی گھٹی گھٹی فضا سے نکل کر ڈھول، باجے

تاشے، اور شہنایوں کی دنیا میں آئی تھی، شرفو میاں کے بھتیجوں کی بیویاں قمر کی ہم سن تھیں، اور بچپن کی سہیلیاں بھی، اور جن لڑکیوں کی شادیاں ہو رہی تھیں، ان سے بہناپا تو تھا ہی لیکن تعلقات بھی ایسے انتہائی بے تکلفانہ قسم کے تھے، یہ بہوئیں اور بیٹیاں بھی اور دوسرے عزیزوں کی جو بہوئیں اور بیٹیاں اس تقریب کے سلسلہ میں آگئی تھیں وہ سب روایاتِ قدیمہ اور روایاتِ خاندانی کی بڑی سختی سے پابند تھیں، خاص طور پر پردہ کا جہاں تک تعلق تھا، یہ واقعہ ہے کہ ان کے گھر دلا میں پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا،

ایک کمرہ میں گھر کی اور خاندان کی بہوئیں اور بیٹیاں جمع تھیں، اور آپس میں ہنسی مذاق اور دل لگی کی باتیں کر رہی تھیں، شرفو میاں کے بڑے بھائی کی بہو کا نام شاہینہ اور چھوٹی کا سکینہ تھا، بڑی لڑکی کا نام رضیہ اور چھوٹی کا صفیہ تھا، شاہینہ نے رضیہ کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

"اب کیوں مزاج ملیں گے تمہارے، بہت بڑے آدمی کی بیوی بن کر جا رہی ہو، راج کرو گی۔"

سکینہ نے صفیہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اس کا دولہا بھی قد میں چاہے بالشت بھر سے زیادہ نہ ہو، لیکن آدمی وہ بھی بہت بڑا ہے۔"

اس فقرہ پر سب کو ہنسی آگئی، ایک ساتھ بہت سے قہقہے

کمرہ میں گونجنے لگے، عفیفہ نے برا سا منہ بنا کر کہا۔
"بھئی ہمیں یہ باتیں اچھی نہیں لگتیں، ہم جلتے ہیں۔"
سکینہ نے اس کا دامن پکڑ لیا،
"بس خفا ہو گئیں، اتنے ہی ہیں، اچھا بیٹھو اب کچھ نہیں کہیں گے۔"
عفیفہ روٹھی روٹھی سی بیٹھ گئی، رضیہ نے قمر سے پوچھا۔
"کہو کیسی گزر رہی ہے!"
قمر نے ایک آہ سرد کے ساتھ جواب دیا۔
"اچھی گزر رہی ہے۔"
رضیہ نے رحم آمیز نظروں سے اسے دیکھا اور بولی،
"ہائے یہ عمر اور یہ بیوگی، پہاڑ سی زندگی سامنے پڑی ہے، یہ کس طرح کٹے گی؟ ——"
قمر نے جواب دیا،
"پہاڑ کی طرح!"
رضیہ نے غم آگئیں نظروں سے اس کی طرف دیکھا، اور خاموش ہو گئی،
قریب ہی ایک اور نوجوان عورت بھی بیٹھی تھی، اس کا نام نصرت تھا رضیہ کی بہت قریبی عزیزہ تھی، اس نے مسکراتے ہوئے قمر کی طرف دیکھا اور کہا۔
"مشکل ہے"
عفیفہ نے دریافت کیا۔

"کیا مشکل ہے؟"

"یہ پہاڑی زندگی کیسی اور سے کٹ تو کٹ جائے، لیکن قمر سلطانہ کے بس کا یہ روگ نہیں۔۔۔"

قمر کی تیوریاں چڑھ گئیں، لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا، صفیہ کو شاید اس نئے موضوع سے لطف آنے لگا تھا، اس نے پوچھا،

"یہ تم نے کیسے جانا؟"

نصرت نے جواب دیا۔

"خدا کو دیکھا نہیں لیکن عقل سے پہچانا ہے، قمر سلطانہ کو دیکھنے کے بعد بھی اگر نہ پہچان سکوں تو مجھ سے بڑھ کر بے وقوف کون ہو سکتا ہے؟"

وحشی ہرنی کی طرح ادھر اُدھر قمر نے مدد کے لئے دیکھا، لیکن کسی نے بھی اس کا ساتھ نہ دیا، سب ہنسنے لگ گئیں، صفیہ نے نصرت کو ذرا اور اکساتے ہوئے کہا،

"اچھا بھئی مان لیا، تم نے ہماری قمر سلطانہ کو دیکھا ہے اور اچھی پہچان بھی لیا ہے، لیکن کیا پہچانا ہے، یہ بھی تو بتاؤ!"

نصرت نے مسکراتے ہوئے کہا،

"خدا نظر بد سے بچائے، لاکھوں میں ایک ہیں، ان کے چاہنے والے تو زمین سے اور آسمان سے ابلیں گے اور ٹپکیں گے۔"

صفیہ نے ایک قہقہہ لگایا، پھر بولی۔

"لیکن ایک بیوہ عورت زندہ رہتے ہوئے بھی اپنی آرزوؤں کو دفن کر دیتی ہے، کم از کم ہمارے خاندان کا یہی دستور ہے۔"

نصرت نے جواب دیا۔

"بھئی یہ دستور کس خاندان کا نہیں ہے، ہر شریف خاندان میں اس پہ عمل ہوتا ہے، لیکن جو بیچاری بدصورت یا عمر رسیدہ ہوتی ہیں، ان پہ تو یہ دستور اس طرح فٹ آجاتا ہے جیسے تم پر یہ سوٹ فٹ آیا، لیکن جنھیں خدا نے حسن دیا ہے، جوانی دی ہے جوش شباب دیا ہے، وہ اپنے راستے خود پیدا کر لیتی ہیں ــــــ"

صفیہ نے بے پناہ حیرت کی نمائش کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"وہ کس طرح نصرت؟"

نہایت اطمینان سے نصرت نے کہا۔

"وہ اس طرح کہ کوئی گھر کے اندر اپنی تسکین کا ذریعہ پیدا کر لیتی ہے، اور اگر وہ تسکین کسی پھل کی صورت میں ظاہر ہو تو بے تامل اس کا گلا گھونٹ کر کسی کونے کھدرے میں دبا دیتی ہے یا ایک دن گھر والوں کو سوتا چھوڑ کر اپنے کسی چاہنے والے کے ساتھ خوشی خوشی اغوا ہو جاتی ہے"

صفیہ کو نصرت کی ان باتوں سے بڑی دلچسپی ہو رہی تھی، اس نے پھر اپنے اوپر ایک مرتبہ حیرت کی کیفیت طاری کی، اور دانتوں کے نیچے انگلی رکھ کر بولی۔"

"کیا کہہ رہی ہو نصرت؟ کہیں ایسا غضب بھی ہو سکتا ہے؟"

"جھوٹ ——"

نصرت اپنی باتیں ثابت کرنے پر تلی ہوئی تھی، اس نے کہا۔
"آج کا جھوٹ، کل سچ ثابت ہوگا، یہ تو تمہارے لئے کہتی ہوں دیکھ لینا، باقی رہی ہیں تو ایسے نہ جانے کتنے جھوٹ میری آنکھوں کے سامنے سچ بنے ہیں۔"

صفیہ نے اور زیادہ متحیر ہو کر پوچھا،
"سچ، ! نصرت سچ، ! یہ کیا کہہ رہی ہو؟"

انداز استغنار کے ساتھ نصرت نے جواب دیا،
"جھوٹ بولنے کی ضرورت کیا ہے، دیکھو میں بتاتی ہوں، اسے تو جانتی ہو، حماد قہ کو؟"

صفیہ نے اقرار کیا،
"ہاں کیوں نہیں جانتی!"

نصرت نے اپنے انکشافات کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔
"سچ کہنا صورت شکل کی کیسی ہے؟"

بغیر ذہنی تحفظ کے صفیہ نے جواب دیا،
"بہت اچھی'، ! ہم سب سے اچھی'، !"

نصرت نے مسکراتے ہوئے ایک اور سوال کیا،
"بھلا اسے بیوہ ہوئے کتنے دن ہوئے ہوں گے ——؟"

کچھ سوچتی ہوئی صفیہ بولی۔

"میرا خیال ہے تین برس تو ہو گئے ہوں۔ ——— !"

نصرت نے تائید کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں !، میرا خیال بھی یہی ہے، کہ تین سال ہو گئے ہیں ———
لیکن ان تین سال کی مختصر سی مدت میں کیا کیا گل کھل چکے ہیں ؟
یہ چند آدمیوں کے سوا جن میں ایک میں بھی ہوں، کوئی نہیں جانتا"

شاہینہ اب تک بے توجہی، بلکہ بے زاری کے ساتھ صفیہ اور نصرت کی باتیں سن رہی تھی، اب اسے بھی اشتیاق پیدا ہوا، اس نے کہا۔

"کیا کیا گل کھلے ہیں بھئی، ہمیں بھی تو بتاؤ ؟"

نصرت نے اس طرح، جیسے کوئی بالکل معمولی بات کہی جاتی ہے، کہا۔

"صرف دو بچوں کی ماں بنی ہیں صاوقہ بی بی، اور ویسے شوہر کے نام پہ دنیا کو بتے ہوئے بھی ہیں ! "

شاہینہ نے تقریباً چیختے ہوئے کہا،

"نصرت خدا سے ڈرو، کیوں کسی پر تہمت لگاتی ہو ! "

نصرت کو جلال آ گیا، اس نے کہا۔

"اپنی جوانی کی، اور تمھاری جان کی قسم کھا کر کہتی ہوں، یہ واقعہ سچا ہے ایک حرف بھی جھوٹ نہیں۔ "

صفیہ کو سوال کا موقع دیئے بغیر جلدی سے سکینہ نے پوچھا۔
"لیکن نصرت، اگر واقعی تم سچی ہو تو بتاؤ وہ بچے گئے کہاں ؟"
نصرت نے ایک قہقہہ لگایا، اور بولی،
"جس چارپائی پر صادقہ سوتی ہے، اسی کے نیچے دو ننھی ننھی قبریں ہیں
جن میں گلا گھونٹ کر پاپ کے نشان کو دفن کر دیا گیا۔"
صفیہ نے پوچھا،
"اتنا بڑا واقعہ ہو گیا اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی ؟ ——
یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟"
نصرت نے مزید وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔
"صادقہ اپنے کمرہ سے شاذونادر ہی باہر نکلتی ہے، ہے بھی ذرا بھاری بدن کی، چوری کا چھپا لینا اس کے لئے کچھ مشکل بھی نہیں، اور وہ عورت کریمن وہی ہمارے محلہ کی پرانی اور مشہور دائی، اسے اگر سو روپے کا نوٹ مل جائے تو وہ کیا نہیں کر سکتی ؟ ——"
شاہینہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا،
"بات کچھ سچی لگتی ہے، اس لئے کہ میں نے دیکھا ہے، جب بھی میں صادقہ کے ہاں گئی اگر کریمن کبھی اتفاق سے آگئی تو صادقہ نے ہاتھوں ہاتھ لیا ہے اسے۔"

"ارے کریمن بوا چائے تو پی لو۔"
"کھانا کھاتی جاؤ۔"

"بڑے اچھے پسندیدے پکے ہیں آج، ایک آدھ لقمہ تو چکھنی جاؤ۔"
اب سوچتی ہوں تو واقعی عبادت اور کہ بمن کا اتنا میل جول کیا معنی رکھتا ہے؟"

نصرت نے عارفانہ انداز میں گردن کو خم کرتے ہوئے کہا۔
"تم ہی سوچ لو ——"
شاہینہ بولی،
"لیکن بھائی، یہ تو مہاپاپ ہے، گناہ کرنا، اور گناہ کو چھپانے کے لئے قتل کرنا اور اس کے بعد بھی گناہ کئے جاتے رہنا، غضب ہے،
——"

صفیہ اتنی دیر سے خاموش بیٹھی تھی، اس کے ذہن میں کئی خیالات کلبلا رہے تھے،
اب ضبط کرنا ناممکن ہو گیا، آخر اس نے کہا۔
"لیکن نصرت یہ تو بتاؤ عبادت کے گھر میں جہاں تک مجھے معلوم ہے نہ کسی مرد کا آنا جانا ہے، نہ کسی کے لئے آمد و رفت جاری رکھنا ممکن ہے پھر یہ واقعہ اتنی باقاعدگی کے ساتھ کس طرح ہو گیا؟"
نصرت ہنسنے لگی، صفیہ نے ذرا چڑتے ہوئے کہا۔
"میرے سوال کا یہ جواب ہے۔"
نصرت نے پھر ایک قہقہہ لگایا، اور گویا ہوئی۔
"سادگی اور سادہ لوحی پر ہنسی آتی ہے، تم نے سنا نہیں، عقل عیار

ہے سو بھلیں بنا لیتی ہے ـــــــ بزرگوں کا قول سچ ہی تو ہے، ضرورت ایجاد کی ماں ہے، صادقہ کے گھر میں باہر سے کوئی نہیں آ سکتا، لیکن جو اندر ہے، اسے کوئی نکال بھی نہیں سکتا، نہ اس پہ شبہ کر سکتا ہے۔"

شاہینہ بول پڑی۔

"وہ کون شخص ہے؟"

صفیہ نے شاہینہ کی ہاں میں ہاں ملائی اور پوچھا،

"بناؤ کون شخص ہے وہ؟"

نصرت نے بڑے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"کریمن کا لڑکا! ـــــــ رحیم!"

رفیعہ جواب تک اس گفتگو سے بے تعلق رہی تھی، آخر اس گفتگو کے میدان میں اسے بھی کودنا پڑا، اس نے کہا،

"رحیم! ـــــــ"

پھر اپنے حافظہ پہ زور دیتی ہوئی بولی،

"ہاں میں نے اس کو دیکھا ہے، ـــــــ لیکن وہ تو صادقہ سے چھوٹا ہے، !"

"تو اس سے کیا ہوتا ہے، بچہ تو نہیں ہے، بہرحال جوان ہے، !"

"ہاں یہ بات تو ہے، !"

صفیہ نے مداخلت کرتے ہوئے کہا،

"لیکن وہ تو نوکر ہے، !"

نصرت نے اعتراضی لہجہ میں پوچھا،

"تو؟ ——— کیا نوکر آدمی نہیں ہوتا، !"

بے ساختہ شاہینہ کے منہ سے نکلا،

"چھی چھی کیسے پنچ لوگ ہیں! !"

نصرت نے اس بات پر توجہ نہ کرتے ہوئے کہا۔

ہماری اماں نے تو صادقہ کی ماں کو مشورہ دیا تھا کہ بہن لڑکی جوان ہے اس کا یوں بٹھا رکھنا ٹھیک نہیں شادی کر دو، !"

"پھر کیا کہا انھوں نے ؟"

"کہتیں کیا، اپنی بڑی ساری ناک لے کر بیٹھ گئیں، کہنے لگیں ہے ہے کہیں ایسا بھی ہو سکتا ہے، صادقہ نے آخرکار جواب دے دیا، اگر ایسا نہیں ہو سکتا تو ایسا ہو سکتا ہے، !"

یہ الفاظ کچھ اس اداکاری کے انداز میں کہے کہ سب کو ہنسی آگئی۔

نصرت نے پند و موعظت کے انداز میں کہا۔

"ایسے ایسے نہ جانے کتنے واقعات مجھے معلوم ہیں، لیکن زبان بند رکھتی ہوں، کسی کو رسوا کرنے سے کیا فائدہ ——— تم نے ان کا نام تو سنا ہوگا، شیخ نثار علی صاحب کا ؟"

"ہاں کیوں نہیں سنا، مشہور آدمی ہیں، !"

"یہ خبر بھی سنی ہوگی کہ ان کی ایک بیوہ لڑکی تھی، راشدہ، !"

"ہاں اس کا نام بھی سنا ہے، بلکہ شاید ایک آدھ مرتبہ کسی تقریب

کے موقعہ پر کہیں دیکھا بھی ہے، ! "

جانتی ہو۔ اس کا انجام کیا ہوا ؟ "

" کون نہیں جانتا، ؟ ——— مرگئی بیچاری، ! "

" کیوں کوستی ہو بیچاری کو، ——— مریں اس کے دشمن، ! "

رضیہ، صفیہ، شاہینہ، سکینہ سب نے باری باری سے حیرت اور خوف کی نظر سے نصرت کو دیکھا، پھر رضیہ نے سوال کیا،

" کیا مری نہیں زندہ ہے ؟ "

نصرت ہنستی ہوئی بولی،

" ہاں زندہ ہے، ! "

صفیہ نے فقرہ کسا،

نصرت نے اس طنز کی ذرا پروا نہ کی،

" جی ——— فرخ آباد میں، ———

سکینہ کہنے لگی،

" نصرت آج تمہیں کچھ ہوگیا ہے، ——— صادقہ کے بارے میں تم نے جو کچھ کہا اسے ہم مانے لیتے ہیں، واقعی ایسا ہی ہوا ہوگا جیسا تم کہتی ہو، قرائن بھی تمہاری تائید میں ہیں، لیکن راشدہ کے بارے میں تمہاری بات کس طرح مان لیں، اس کے جنازے میں شریک ہونے والے سیکڑوں لوگ موجود ہیں، کیا وہ سب جھوٹے ہیں، ؟ "

نصرت نے جس طرح ایک معلم، اپنے ناسمجھ شاگردوں کو سمجھاتا ہے، کہا،

"اصل واقعہ یہ ہے کہ اسی کریمن کے ذریعہ، راشدہ کی خط و کتابت ایک آدمی سے شروع ہوئی، یہ آدمی شیخ نثار کا کارندہ تھا، خط و کتابت نے رفتہ رفتہ باقاعدہ محبت کی صورت اختیار کرلی، ادھر سے آہ، ادھر سے نالہ، یہاں شیون، وہاں فغاں، کریمن تو ایسے لوگوں کی شکل کُٹ ہے ہی، انور مرزا نے پورے پانچ سو روپے اس کے ہاتھ پر رکھے، اور ایک روز رات کو، راشدہ انور مرزا کے گھر پہنچ گئی، اس رات کو پہلے سے انتظام کے مطابق، انور مرزا کا ایک دوست اسے اپنے گھر لے گیا کہ وہاں چھپی رہے گی، کسی کو پتہ نہیں چلے گا، دوسرے روز جب شیخ صاحب کو پتہ چلا کہ صاحبزادی مع زیورات کے غائب ہیں، تو آدمی عقل مند ہیں، بات دبا دی، فوراً ڈاکٹر صاحب کو بلایا، ان کے ہاتھ پر دو ہزار روپے رکھے، اور ان سے تصدیق کرالی کہ راشدہ کو ڈبل نمونیہ ہو گیا تھا، وہ مر گئی، پھر ایک چارپائی پر اس کی مصنوعی لاش، رکھ کر قبر میں دفن کر دی گئی، شیخ صاحب بدنامی سے بچ گئے، لیکن یہ غم لے بیٹھا بیچارے کو مستقل بیمار پڑ گئے، ———

عقیلہ نے سوال کیا،

"اور راشدہ؟ ——— وہ انور مرزا کے ساتھ چلی گئی؟"

شاہلیقہ نے اعتراض کرتے ہوئے کہا،

"بھئی یہ عجیب بات ہے، وہ انور مرزا کے ساتھ چلی بھی گئی، اور انور مرزا صاحب اب تک شیخ صاحب کے کارندے بنے ہوئے ہیں!"

اگر راشدہ کہیں ہے، اور وہ کہیں، تو پھر اغوا کرنے سے فائدہ کیا ہوا؟"

نصرت پھر ہنسنے لگی، اس نے کہا،

"بڑی نادان ہو تم لوگ بھی، پوری بات سنی نہیں، اور رائے زنی شروع کر دی،!"

"تو کیا ابھی کچھ باقی ہے؟"

"باقی ہی تو ہے، ــــــ ٹیپ کا بند تو تم نے سنا نہیں،!"

"وہ بھی سنا ڈالو،!"

"انور مرزا کے وہ دوست فرخ آباد کے رہنے والے تھے، اور یہاں کسی دوکان پر محاسب تھے، راشدہ کو یہ کہہ کر طے شدہ پروگرام کے مطابق لے گئے تھے کہ اسے اپنے ہاں چھپائے رہیں گے، لیکن کیا یہ کہ خود اسے اغوا کر لیا،!"

شاہینہ چیخ پڑی،

ہائے اللہ ــــــ

عقیلہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا،

"یہ کیا کہہ رہی ہو؟"

نصرت نے جواب دیا،

"ہاں سچ، ــــــ ایسا ہی ہوا، دوست، راشدہ کو لے کر چمپت ہو گئے، اور ایسے گئے، کہ آج تک پتہ نہ چل سکا، بیچارے انور مرزا کلیجہ پکڑ کر رہ گئے ــــــ اب یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے

کہ راشدہ کے قیمتی زیورات کا لالچ تھا، یا اس کے حسنِ عالم آشوب کی کشش بہر حال ہوا وہی جو میں تم سے کہہ رہی ہوں، !"

سکینہ نے کلیجہ پہ ہاتھ رکھ کر کہا،

"واہ ری دنیا، !"

شاہینہ نے بھی ایک آہ سرد بھری اور گویا ہوئی،

واقعی، ———

مجیدہ نے ہمدردی کے انداز میں کہا،

"نہ جانے بے چاری راشدہ کا کیا حال ہوا ہوگا؟ ——— کہاں ہے؟ کس حالت میں ہے؟ سکھ سے ہے؟ یا دکھ سہہ رہی ہے کون جانے؟"

"ہاں خدا کے سوا کون جان سکتا ہے، !"

لیکن شیخ صاحب نے بھی کمال کر دیا، !"

"واقعی کمال کر دیا، ان کی بیوی اور گھر کی بوڑھی اور پرانی خادمہ کے سوا گھر بھر یہی سمجھ رہا ہے کہ واقعی راشدہ نمونیہ کا شکار ہو کر اس دنیا سے رخصت ہو گئی، !"

"مجھے حیرت اس پر ہوتی ہے کہ کس باقاعدگی سے راشدہ کا دسواں بیسواں، چالیسواں شیخ صاحب نے کیا ہے، ؟"

"اور ہر موقعہ پہ روئے بھی ہیں پھوٹ پھوٹ کر، !"

"لیکن وہ آنسو تو سچے ہی ہوں گے، !"

"ہاں اس میں کیا شک ہو سکتا ہے'!"

"خدا رحم کرے بیچارے پر'!"

"رحم تو کر رہا ہے'، ـــــــ سخت بیمار رہیں اور دیکھ لینا کسی دن بیٹھے بیٹھے مر جائیں گے'، ـــــــ!"

"اب کوسنے بھی لگیں؟"

"میں کیوں کوسنے لگی، ڈاکٹر کا فیصلہ یہی ہے'!"

---

(۹)

یہ باتیں ہو رہی تھیں، کہ دولہنوں (رضیہ اور صفیہ) کا بیدار کرنے کے لیے زمانی بیگم تشریف لائیں، یہ شاہینہ اور سکینہ کی ماں تھیں خاصی موٹی اور سن رسیدہ عورت تھیں، ان کے ساتھ رضیہ اور صفیہ کی ماں، نعیمہ، اور خاندان کی بعض دوسری معزز خواتین بھی تھیں، !،

زمانی بیگم کمرہ میں داخل ہوتے ہی سب سے طرف غافل ہو کر رضیہ اور صفیہ پر ٹوٹ پڑیں، اور چٹاچٹ ان کی بلائیں لینے لگیں، یہ دونوں بھی ان بزرگ خواتین کو آتا دیکھ کر، اس طرح شرماتی ہوئی، لجاتی ہوئی بن کر بیٹھ گئیں، جیسے انہیں دنیا کی کوئی بات نہیں معلوم، !

زمانی بیگم نے رضیہ کی چندری ہاتھ میں لی، اس کے روئے زیبا پر ایک

نظر ڈالی، اس کی آنکھیں بند تھیں، کہنے لگی،

شرم کی پتلی ہے میری بچی، ——— خدا اسے ہمیشہ سہاگن رکھے، رنگ دیکھو ماشاءاللہ جیسے مہ شہاب ———

پھر وہ صفیہ کی طرف متوجہ ہوئیں، اس کی ٹھوڑی اٹھا کر اس کا روئے زیبا بھی ملاحظہ فرمایا، کہنے لگیں،

"کیوں ری چھوکری آنکھیں کیوں بند کئے ہے، کیا میں اتنی ہی بھیانک ہوں کہ میری صورت دیکھنا بھی منظور نہیں، ارے بھئی، کبھی ہم بوڑھے بھی تم لوگوں سے زیادہ خوب صورت تھے،!

صفیہ نے ہنسی روکنے کی بہت کوشش کی، لیکن ہونٹوں سے چھلکی کھائی تبسم چھپ نہ سکا، زمانی بیگم نے صفیہ کو مسکراتے دیکھ کر کہا،

بڑی کھلنڈری لڑکی ہے، سسرال والوں کو انگلیوں پر نچائے گی، (نعیمہ کی طرف متوجہ ہو کر) دیکھتی ہو بہن مسکرائے جا رہی ہے برابر، شیطان کی خالہ، !"

رضیہ اور صفیہ کے دیدار سے مشرف ہو کر واپس جانے کے لئے مڑی ہی تھیں کہ یکایک نظر قمر پر پڑی، اسے دیکھ کر ٹھٹکیں، پھر آگے بڑھیں اور اسے گلے سے لگا لیا،

"ارے قمر، !"

قمر نے ادب سے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سلام کیا۔

زمانی بیگم نے بڑی فراخ دلی اور سیر چشمی سے دعاؤں کا تانتا باندھ دیا۔

"اچھی رہو، خوش رہو، خدا تمھیں صبر دے، ہائے یہ عمر، اور یہ غم، دیکھتی ہوں تو کلیجہ پھٹ جاتا ہے'!"

یہ کہتے کہتے ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، نعیمہ کی آنکھیں بھی پرنم ہو گئیں، قمر کی آنکھوں میں تو پہلے سے آنسو جھلملا رہے تھے پھر یک بیک جیسے کوئی بات یاد آگئی، انھوں نے ایک نظر قمر پر ڈالی، پھر معترض نظروں سے سکینہ اور شاہینہ کو دیکھا، اور پھر کسی سے بغیر مخاطب ہوئے فرمایا،

"سہاگنوں میں بیوہ کا کیا کام؟"

پھر رضیہ اور صفیہ کے گھونگھٹ پر ایک نظر ڈالی اور گویا ہوئیں۔

"پھر ایسے موقعہ پر'!"

اس کے بعد قمر سے مخاطب ہوئیں،

"بیٹی تو یہاں کیوں چلی آئی'؟"

پھر نعیمہ سے کہا،

"بہن قمر کو یہ بات نہیں معلوم کہ سہاگنوں میں بیوہ کو نہیں بیٹھنا چاہئے، تو کیا تم بھی نہیں جانتیں؛ تم نے کیسے گوارا کر لیا اسے؟"

—— واہ بھلا یہ بھی کوئی طریقہ ہے'!"

پھر کمرہ سے جاتے ہوئے انھوں نے قمر سے کہا،

"آؤ بیٹی آؤ، تمھاری جگہ یہاں نہیں ہے'!"

قمر ایک بے بس معمول کی طرح زمانی کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گئی،

اتنے میں نعیمہ کی بپھری ہوئی آواز گونجی،

" زمانی بیگم، تمہیں میری بچی کا دل دکھانے کا، اس کی توہین کرنے کا، اسے ذلیل کرنے کا کوئی حق نہیں ہے'!"

زمانی بیگم نے حیرت بھری نظروں سے نعیمہ کو دیکھا، اور بولیں،

واہ یہ بھی اچھی رہی ـــــــ میں نے کون سی غلط بات کہی ہے،؟ کیا بیوہ عورتیں ایسے موقعوں پر سہاگنوں کے ساتھ بیٹھتیں ہیں یا بیٹھ سکتی ہیں؟ انہیں بیٹھنا چاہیئے؟ مانا کہ تم قمر سے محبت کرتی ہو، ہر ماں اپنی بچی سے محبت کرتی ہے، لیکن محبت کے یہ معنی تو نہیں ہیں کہ پشتہا پشت سے جو رسمیں چلی آرہی ہیں، جو اصول چلا آرہا ہے، اسے توڑ دیا جائے ـــــــ کم از کم میں تو اسے گوارا نہیں کرسکتی، خدا میری بچیوں کا سہاگ قائم رکھے، میں ایسی نحس بات کس دل سے گوارا کرلوں'؟"

نعیمہ بیگم نے قمر کا ہاتھ پکڑا، اور کہا،

چل بیٹی، یہ گھر اس قابل نہیں ہے کہ ہم یہاں آئیں، اب مرتے مرتے یہاں قدم نہیں رکھوں گی'!

(۱۰)

نعیمہ، قمر کا ہاتھ پکڑے دولہنوں کے کمرہ سے نکل کر صحن میں آئی اور دلاری کو آواز دی، وہ فوراً حاضر ہوئی، اس سے کہا۔

پالکی، ڈولی، یکہ، جو چیز سب سے پہلے مل جائے لے آئیں، میں یہاں ایک پل نہیں ٹھہر سکتی، ——— اری میرا منہ کیا تک رہی ہے جاتی ہے یا اتاروں جوتی پاؤں سے؟"

اب بھلا دلاری کے لئے مزید استفسار کا کہاں موقع تھا، فوراً نو دو گیارہ ہوگئی۔

زمانی بیگم سے رضیہ اور صفیہ کی ماں نے بڑے خوشامدانہ لہجہ میں کہا۔

"بہن یہ کیا غضب کر دیا آپ نے؟"
یکایک انھیں خیال آیا کہ زمانی بیگم بھی کوئی معمولی ہستی نہیں ہیں، ان کے دونوں لڑکیوں کی ساس، یعنی شاہینہ اور سکینہ کی ماں ہیں، اور لڑکوں کا یہ حال ہے کہ گو ابھی تک ماں باپ کے دست نگر ہیں لیکن بیویوں کے حد درجہ تابعدار ہیں، یہ اگر خفا ہو گئیں تو پھوپھی بھی روٹھ جائیں گی، وہ روٹھیں تو لڑکے بگڑ جائیں گے، اور باپ لڑکیوں کا ساتھ نہ دیں یہ ممکن نہیں، لہٰذا اپنے لہجے کو اور زیادہ نرم کر کے بولیں،
"میرا مطلب یہ ہے، کہ نعیمہ بہن بھی آخر، ان کی رشتہ ہیں، بھاوج ہیں، اور وہ دنیا میں کسی سے اتنا نہیں ڈرتے، جتنا بڑے بھائی دیشرفو میاں، سے ڈرتے ہیں، اور، قمر، ماں باپ کی چہیتی بیٹی ہے، مجھ سے کہہ دیتیں میں طریقہ سے قمر کو یہاں سے چلتا کر دیتی، نعیمہ بہن کو شکایت کا موقع بھی نہ ملتا، اب تو وہ غصہ میں آگئی ہیں، اور ان کا غصہ خدا کی پناہ — نہ جانے کیسا طوفان اب آ کر رہے گا، میرا تو یہ سوچ کر دل ہولا جا رہا ہے۔!"
زمانی بیگم کے دل میں خود بھی یہی خیالات پریشان گردش کر رہے تھے، روانی کلام میں وہ اتنی باتیں کر گئیں، پھر احساس ہوا کہ یہ کیا غضب ہو گیا، لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا، جو ہونا تھا ہو گیا، منہ سے نکلی ہوئی بات واپس نہیں لائی جا سکتی تھی، دل میں بہت شرمندہ تھیں، لیکن اس شرمندگی کا اظہار آن اور شان کے خلاف تھا، پھر

یہ اطمینان بھی تھا کہ اس خاندان سے میرا جو نازک رشتہ ہے، وہ میری بڑی سے بڑی غلطی کو بھی کم از کم میرے حق میں نازک صورت اختیار کرنے نہ دے گا۔ کہنے لگیں،

"تو کیا ہو گیا، ——— کچھ غلط کہا تھا میں نے؟"

"نہیں کہا تو صحیح تھا، لیکن ———

"نا بھائی، ہم لیکن ویکن کچھ نہیں جانتے، سچی بات ہمارے منہ پر آجائے پھر رکتی نہیں'!"

"لیکن اب ہوگا کیا؟"

"اے واہ بہن تم تو دبلی ہوئی جا رہی ہو اس فکر میں،

"آپ نے سنا نہیں وہ جا رہی ہیں یہاں سے'!"

"سن تو لیا، پھر؟ ——— یا تو وہ خفا ہو کر چلی جائیں گی، ورنہ شرکت کریں گی تو اس شرط پر کہ بیوہ لڑکیوں کو گھر کی بہوؤں اور دلہنوں کے پہلو بہ پہلو بٹھائیں گی، اچھی زبردستی ہے"

ادھر یہ باتیں ہو رہی تھیں، ادھر دلاری گھرائی گھرائی باہر پہنچی، اور اس نے نوکر سے کہا،

"اے سنتے ہو جلدی سے پالکی یا ڈولی منگا دو'!"

وہ منہ تکنے لگا،

"کیوں؟ ——— کون جائے گا؟"

دلاری نے خود ڈانٹ کھا کر آئی تھی، لہٰذا، بگڑے ہوئے موڈ

ہیں کہا۔

"ہماری بیگم صاحبہ اور بٹیا (نفرہ) جائیں گی اور کون جائے گا!"

نوکر پھر یہ سوال کیے بغیر نہ رہ سکا،

"لیکن آج؟ ابھی؟"

دلاری بگڑ گئی،

اور نہیں تو کب؟ پالکی آج اور ابھی آئے گی، جائیں گی کل،

کچھ دماغ چل گیا ہے مردوے کا،!"

مردوے کو غصہ تو آیا، جی چاہا، لگائے ایک لمپوڑا، لیکن بڑے

گھر کی ملازمہ تھی، خون کا گھونٹ پی کر رہ گیا، اور چپ چاپ چلا

گیا، ذرا دیر میں پالکی لے کر آ گیا، اور دلاری سے گویا ہوا۔

لیجئے سرکار آ گئی پالکی، ——— کوئی اور حکم،!"

وہ چڑ کر بولی،

"تیرا خانہ خراب مجھ سے حکم مانگتا ہے؟ لوکا لگا دوں گی منہ میں،

لو اور سنو یہ منہ اور مسور کی دال،!"

وہ چپ ہو گیا، پالکی ڈیوڑھی میں لگ گئی، اندر جاتے ہوئے وہ

اس طرف سے گزری، جدھر شرفو میاں ایک آرام کرسی پر دراز،

عام معاملات و انتظامات کی نگرانی کر رہے تھے، پاس ہی چھوٹا بھائی

یعنی رضیہ اور صفیہ کے باپ ادب سے گردن جھکائے بیٹھے تھے، اس

خاندان کی ایک رسم یہ بھی تھی کہ چھوٹا بھائی چاہے مقدمہ لڑتا ہوا۔

ہائی کورٹ تک پہنچ جاتے، لیکن بڑے بھائی کے سامنے ایک لفظ بھی نہ اختلاف کا نکال سکتے ہیں نہ کسی طرح بے ادبی کا اظہار کر سکتا ہے، ان دونوں بھائیوں میں تو خیر تقسیم کے موقع پر کسی طرح کی بدمزگی کی نوبت نہیں آئی تھی، شرفو میاں نے چھوٹے بھائی کو وہ سب کچھ دے دیا تھا جو اس کا حق تھا، یہی وجہ تھی کہ دونوں کے تعلقات حد درجہ خوشگوار تھے، ہاں تو دونوں بھائی پاس پاس بیٹھے تھے۔ شرفو میاں آرام کرسی پر دراز تھے، اور برادر خوردہ سامنے کی کرسی پر پیکر سعادت بنے متمکن تھے، شرفو میاں اپنے شکار کے قصے نمک مرچ لگا کر خوب مزے لے لے کر بیان کر رہے تھے، بیچ بیچ میں قہقہے بھی لگائے جا رہے تھے، کیونکہ قہقہے لگانے کا حق صرف انہی کو تھا۔ روایات خاندانی کے تحت ۶۰ برس کا چھوٹا بھائی بھی ۷۱ برس کے بڑے بھائی کے سامنے نہ قہقہے لگا سکتا تھا، نہ دانت نکال سکتا تھا، اتنے میں شرفو میاں نے دل میں کوئی خطرہ محسوس کرکے، پالکی اور دلاری کو آگے پیچھے دیکھ کر چھوٹے بھائی سے پوچھا،

"یہ خالی پالکی کس کے لئے آئی ہے، ؟ ——— کیا کوئی واپس جا رہا ہے ؟"

"بھائی صاحب مجھے تو نہیں معلوم، میں تو برابر آپ ہی کے پاس بیٹھا ہوں! !"

شرفو میاں کوئی اور سوال کرنے والے تھے کہ دلاری لپکی لپکی آئی، اور مضطرب و پریشان لہجہ میں کہنے لگی۔

"اندر چلئے بلایا ہے'!"
شرفو میاں نے اپنا مزاحیہ موڈ قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا،
"کیوں چلیں؟ کس نے بلایا ہے؟"
وہ اور زیادہ آشفتہ خاطر ہو کر بولی،
"خدا کے لئے چلئے، نہ جانے کیا ہو جائے گا۔!"
اب تو شرفو میاں کے اور اُن سے زیادہ برادرِ خورد کے کان کھڑے ہوئے
شرفو میاں بے تابی کے ساتھ اٹھے،
"چلو بھئی، دیکھیں کیا معاملہ ہے'!"
کہ دلاری نے ان کے بھائی سے کہا،
"آپ کو بھی بلایا ہے۔!"
وہ خود ہی اس چکر میں پڑے تھے کہ مجھے اس موقعہ پر جانا چاہیئے یا نہیں؟ لیکن دلاری کی یہ بات سنکر یہ چکر رفع ہو گیا۔ وہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا،
چلو، ——— آیئے بھائی صاحب چلیں'!"
شرفو میاں کی ساری شوخی اور شیریں گفتاری، کسی ــــ نامعلوم خطرے کے پیشِ نظر رخصت ہو چکی تھی، بجھے ہوئے لہجے میں گویا ہوئے،
آؤ چلیں'!
دونوں اندر پہنچے، نعیمہ بیگم چلائی بی بیچ صحن میں کھڑی تھی، اس کے

پاس تھر، دونوں کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں، شوہر کی طرف حقارت کی ایک نظر ڈال کر نعیمہ نے اپنے دلبر سے کہا۔

چھوٹے میاں، تم سے تو مجھے کوئی گلہ نہیں، تم ان سے (اشرفو میاں) سے اتنے چھوٹے ہو کہ یہ ہمیشہ تمہیں اولاد کی طرح چاہتے رہے، یہ بھی جہاں تک یاد ہے تمہارے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا، لیکن آج اس گھر میں تمہاری بیوی کے سامنے، میری اور میری بچی کی جو ذلت زمانی بیگم کے ہاتھوں ہوئی ہے، وہ بدترین معاوضہ ہے، جو میری محبت اور خدمت کا تمہاری طرف سے مل سکتا تھا۔ میں نے تو قسم کھالی ہے کسی کے ہاں آنے جانے کی، لیکن رضیہ اور صفیہ کی شادی میں زندہ رہتے ہوئے شریک نہ ہونا میرے دل نے گوارا نہ کیا، قسمت کی ماری چلی آئی، تمر بھی ہمیشہ سے رضیہ اور صفیہ کو چاہتی آئی ہے، میرے دل نے گوارا نہ کیا کہ اسے گھر میں اکیلا چھوڑ آؤں، گو اپنی بدنصیبی کی وجہ سے وہ خود آنے میں تامل کر رہی تھی، لیکن زبردستی کر کے اسے بھی اپنے ساتھ لے آئی۔"

چھوٹے میاں نے اس طویل تقریر کے دوران میں کئی بار بولنے کی کوشش کی، لیکن موسلا دھار بارش کی طرح نعیمہ کی تقریر جاری تھی، کامیاب نہ ہو سکے، اب جو ذرا سانس لینے کے لیے وہ رکیں تو گویا ہوئے،

بھابی، اگر آپ نہ آتیں، یا قمر کو ساتھ نہ لاتیں، تو یہ تقریب ہو سکتی تھی، ؟ خدائے واحد کی قسم برات واپس کر دیتا ——————"

نعیمہ نے دکھتی رگ پکڑ لی،

"ہاں بھئی تم برات واپس کر دیتے، لیکن زمانی بیگم کے سامنے اور اپنی بیوی کے سامنے تم بھی بے بس ہو۔ تم ان "شرفو میاں پر ایک نظر ڈال کر" مردوں میں نکھٹو ہو جو بیویوں کو پاؤں کی جوتی بنا کر رکھتے ہیں، تمہاری بیوی کی موجودگی میں، زمانی بیگم نے کان پکڑ کر قمر سلطانہ کو رضیہ اور صفیہ کے کمرہ سے نکال دیا۔۔۔۔۔"

چھوٹے میاں چیخ پڑے،

بھابھی یہ آپ کیا کہتی ہیں۔۔۔۔۔۔ کیا اس دنیا میں کوئی ایسا بھی ہے جو اس گھر کے کسی حصہ سے، قمر کیا آپ کو ہاتھ پکڑ کر نکال سکے؟"

بہت ٹھنڈے لہجہ میں نعیمہ نے کہا،

بھئی، ہم ماں بیٹی کے ساتھ تو یہی ہوا۔۔۔۔۔۔ زمانی بیگم نے صاف الفاظ میں بغیر کسی رد رعایت کے قمر سے کہہ دیا،

"سہاگنوں میں بیوہ کا کیا کام، بیٹی تم یہاں کیسے آگئی؟ ۔۔۔۔۔؟"

پھر وہ مجھے تناڑنے لگیں،

"اگر قمر ایک رسم سے ناواقف تھی، تو آپ کو کیا ہو گیا تھا کہ اس بدشگونی پر تیار ہو گئیں، ؟"

اور قبل اس کے کہ میں کوئی جواب دوں، زمانی بیگم نے۔۔۔۔۔ اور بھی انہیں یہ اختیار ہونا ہی چاہیئے، آخر اللہ رکھے تمہارے بیٹوں کی ساس ہیں، میری بچی سے، میرے سامنے، اس کی چچی کے سامنے، اس کی چچازاد بہنوں کے سامنے کہہ دیا۔

"یہاں تمہاری جگہ نہیں ہے، ـــــ آؤ باہر آؤ"!"

اور میری بچی، میری شہزادی، میری جان، بے لبسی کی تصویر بنی اس ظالم عورت کے پیچھے پیچھے چل کھڑی ہوئی، چھوٹے میاں اب میں جاتی ہوں، اب اس گھر میں کبھی قدم نہیں رکھوں گی، اب یہاں آنا مجھ پر حرام ہے، تم سے کچھ ایسی زیادہ شکایت بھی نہیں ہے مجھے، تمہاری مجبوریوں کو اچھی طرح سمجھتی ہوں، بڑی تم پر ہمیشہ سے حاوی ہیں، زمانی بیگم تمہاری بیوی اور لڑکیوں پر بھی حاوی ہیں، ان دوہری طاقتوں کا تم مقابلہ نہیں کر سکتے"!

یہ کہہ کر شیر کی طرح گھور کر انھوں نے شرفو میاں کی طرف دیکھا، اور کڑے لہجہ میں دریافت کیا

"کیا تم بھی میرے ساتھ چلو گے؟"

اس برجستہ سوال کا برجستہ جواب شرفو میاں کے لئے حاضر جواب ہونے کے باوجود دینا ممکن نہ تھا، حالات نے اتنی تیزی سے پلٹا کھایا تھا، اور معاملات نے یک بیک ایسی خطرناک اور نازک صورت اختیار کرلی تھی کہ شرفو میاں سو مرتبہ سوچنے کے بعد بھی جواب دینے کے قابل نہیں تھے، وہ سکتہ کے عالم میں حیران و پریشان کھڑے تھے، نعیمہ نے کہا۔

"جس طرح میں چھوٹے میاں کی مجبوریاں سمجھتی ہوں، تمہاری مجبوریاں بھی میرے علم میں ہیں، تمہارے دل میں جو کشمکش ہو رہی ہے اس کا

مجھے احساس ہے اور کسی حد تک تم سے ہمدردی بھی ہے، میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے تم دونوں بھائیوں میں تفرقہ پڑے، لیکن یہ سن لو، جس طرح آج سے اس گھر کی دہلیز پھلانگنا میرے اوپر حرام ہے، اسی طرح تمہارے گھر میں قدم رکھنا بھی میرے لئے حرام ہے، میں ذلیل بن کر، یا اپنی بچی کو ذلیل برتاؤ کے حوالے کر کے کہیں نہیں رہ سکتی، میں یہاں سے سیدھی اسٹیشن جاؤں گی، وہاں سے جمال پور جاؤں گی، وہاں میرے باپ کا گھر ہے، وہاں میری قمر کو کوئی ٹیڑھی آنکھ سے نہیں دیکھ سکے گا، اور اگر دیکھے گا تو اس کی آنکھیں نکال لوں گی، میرا بھائی عالم ہے وہ خاندان کے نام پر ایسی بیہودگیاں برداشت نہیں کر سکتا، اور اگر تم میرے راستے میں آئے، تو سر پھوڑ پھوڑ کر راستے ہی میں جان دے دوں گی، اب تک تم نے میری خدمت اور اطاعت دیکھی ہے، آج سے میری نفرت اور سرکشی بھی دیکھ لو گے، اگر اس بڑھاپے میں طلاق دینا چاہو، تو میری طرف سے اجازت ہے، مہر ابھی سے معاف کئے دیتی ہوں، بس اب میرا تمہارا کوئی ناتہ نہیں، ہاں قیامت کے دن یہ مصنوعی داڑھی پکڑ کر ضرور خدا سے فریاد کروں گی ——————

چل قمر، چل دلاری، ——————"

قمر کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے، دلاری بھی رو رہی تھی، نعیمہ نے قدم آگے بڑھایا، ان کے پیچھے، قمر اور دلاری تھے،

یکایک چھوٹے میاں سامنے آ گئے۔

اور جاوج کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہو گئے،

"بھابھی ——————"

اس کے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکے ان کی آواز بھرا گئی،

نعیمہ نے ایک نظر چھوٹے میاں پر ڈالی، اور کہا،

"میرے دل میں تمہارے خلاف کوئی جذبہ نہیں ہے، میں تمہیں معاف کرتی ہوں! "

چھوٹے میاں نے کہا،

"بھابھی میں عفت (بیوی) کو طلاق دے دوں گا، میں کھڑے کھڑے زمانی بیگم کو اس گھر سے چلتا کر دوں گا، میں اپنے لڑکوں کو حکم دوں گا کہ وہ شاہینہ اور سکینہ کو طلاق دے دیں، اور اگر انھوں نے میرا حکم نہ مانا تو انھیں عاق کر دوں گا، اور اپنی ساری جائداد کار خیر کے لئے وقف کر جاؤں گا، اگر ان دونوں نے یعنی عفت نے، اور زمانی بیگم نے آپ سے معافی نہ مانگی، آپ ہی سے نہیں تم سے بھی معافی نہ مانگی، بھائی صاحب کا (شرفو میاں)، کا میں باپ سے زیادہ ادب کرتا ہوں، آپ کی وقعت میری نظر میں ماں سے زیادہ ہے، تم پہلے، پھر رضیہ اور صفیہ، ——————"

---

(۱۱)

نعیمہ نے کچھ کہنا چاہا، لیکن چھوٹے میاں نے سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا،

"بھابی نہ جایئے میرا کہنا مان لیجیے، اگر آپ چلی گئیں تو یہ گھر تباہ ہو جائے گا، میں خود اسے تباہ کر دوں گا، میرے خون، اور اس گھر کی بربادی کی ذمہ داری اپنے اوپر نہ لیجیے،!"

یہ کہہ کر چھوٹے میاں آگے بڑھے انھوں نے قمر کو نعیمہ کے پاس سے اپنی طرف کھینچا، اور اس کے سر پر ہاتھ رکھا، پھر جیب سے رومال نکال کر اس کے آنسو پونچھے، اور بڑے پیار بھرے لہجہ میں کہا،

"کیوں بیٹی، کیا تو بھی اپنے چچا کو چھوڑ کر چلی جائے گی،!"

پھر قمر کے جواب کا انتظار کئے بغیر، انھوں نے آواز دی،
"عفت یہاں آؤ، !"

چھوٹے میاں کو آتا دیکھ کر عفت اور زمانی بیگم پھر کمرہ میں چلی گئی تھیں، چھوٹے میاں بہت بیانگ دہل جو باتیں کی تھیں، ان کا ایک ایک حرف ان سب نے سنا تھا، یہ الفاظ سنکر عفت کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا، اور زمانی بیگم بھی اپنے قصرِ اقتدار کو ڈوتنا محسوس کرنے لگی تھیں، اور جب یہ آواز کان میں آئی کہ میں شاہینہ اور سکینہ کو طلاق دلوا دوں گا، تو زمانی بیگم بید لرزاں کی طرح کانپنے لگیں، اور زبیدہ و سکینہ کے بدن پر لرزہ طاری ہو گیا کسی کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ معاملہ یہ صورت اختیار کر لے گا، شاہینہ نے اپنی زندگی برباد ہوتے دیکھ کر زمانی سے کہا،

" اماں خدا کے لیے کچھ کیجئے، ابا (چھوٹے میاں) کا غصہ قیامت کا ہے، اگر انھوں نے وہی کیا جو کہہ رہے ہیں، تو میرا اور سکینہ کا انجام کیا ہو گا، ہائے آپ کی زبان بھی کیسی لبس بھری ہے، آخر آپ سے کس نے کہا تھا کہ قمر کو دیکھتے ہی، سہاگن اور بیوہ کا قصہ لے کر بیٹھ جائیں، ———
——— "

یہ چھوٹے میاں کے خطرناک اور لرزہ خیز اعلانات کا سلسلہ جاری تھا، اب سکینہ نے ماں سے التجا کی،
"سن رہی ہیں آپ؟ ——— ہائے اللہ یہ کیا کر دیا آپ نے؟ "

زمانی بیگم کی ساری طاقت لسانی جواب دے گئی تھی، وہ ایک مجرم کی طرح کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھیں خاندان، روایات خاندانی سب کچھ فراموش کر چکی تھیں، پھر جب چھوٹے میاں نے عفت تک کو طلاق دینے اور زمانی بیگم کو کھڑے کھڑے نکال دینے کا اعلان کیا، تو شاہ بینہ، اور سکینہ ہی نہیں، رضیہ اور صفیہ بھی لرز اٹھیں، یہ دونوں دولہن بنی گڑیا کی طرح بیٹھی تھیں، دونوں یک بیک اٹھیں اور ماں کے گلے سے آکر لگ گئیں، اور رونے لگیں، حقارت اور ذلت کی نظر سے زمانی بیگم کی طرف دیکھا اور کہا۔

”بڑے منحوس قدم ہیں آپ کے بھی“ ——— آپ تو شاید یہ فیصلہ کر کے آئی تھیں کہ ہمارے گھر کو ملیا میٹ کر کے جائیں گی، ———“

عفت نے ہاتھ جوڑتے ہوئے زمانی بیگم سے کہا،

”بس ابھی بگڑی بات بن سکتی ہے، !“

زمانی بیگم کی جان میں جان آگئی،

”کس طرح ؟“ ——— بتاؤ کیونکر ؟“

عفت نے کہا،

چلئے، قمر کو گلے لگا لیجئے، بھاوج (نعیمہ) سے معافی مانگ لیجئے!

شاہ بینہ نے تائید کی،

”ہاں اماں، یہی کرنا چاہیے، !“

سکینہ نے بھی تاکید کی،

اماں خدا کے لیئے دیر نہ کرو، !،

رضیہ بولی،

یہ سوچنے کا وقت نہیں ہے، !"

صفیہ نے کہا،

" وقت ہاتھ سے نکلتا جا رہا ہے، !"

عفت نے زمانی بیگم کا ہاتھ پکڑ کر کہا،

" آیئے، چلئے، !"

وہ بولیں،

" چلو، ——— میں کب انکار کرتی ہوں، !"

عفت اور زمانی بیگم باہر آئیں، چھوٹے میاں نے ان دونوں کو دیکھ کر نفرت اور حقارت سے منہ پھیر لیا،

شوہر کے سامنے پہنچ کر عفت نے کہا،

" واقعی، زمانی بہن سے بہت بڑی غلطی ہو گئی، وہ اپنی غلطی پر نادم ہیں، !"

چھوٹے میاں نے کہا،

" تم نے تو زمانی بیگم سے بھی بڑی غلطی کی، کہ یہ باتیں سنیں اور خاموش رہیں کیا تم بھی نادم ہو، !"

عفت جو ہمیشہ شوہر کو ایک منہ میں سو سو سنانے کی عادی تھی،

کہنے لگی،

"میں بہت نادم ہوں، ——— بہت زیادہ!!" میں صرف اس لیے خاموش رہی تھی، کہ بات نہ بڑھے، ورنہ سچ پوچھیے تو یہ باتیں سنکر میرا دل جل اٹھا تھا، !"

چھوٹے میاں نے طنز کرتے ہوئے کہا۔

"شکریہ، ——— لیکن یہ باتیں مجھ سے کیوں ہو رہی ہیں، بھابی سے، اور قمر سے کیوں نہیں کی جاتیں، !"

عفت نے قمر کو چھوٹے میاں سے چھین لیا، اور اسے پیار کرتے ہوئے کہا،

"کیا تو بھی خفا ہے؟"

اس نے شرما کر گردن جھکا لی،

پھر عفت نے نعیمہ سے مخاطب ہو کر کہا،

"بھابی میری کچھ خطا نہ تھی، اگر ہوا تو آپ سے ایک دفعہ نہیں ہزار دفعہ معافی مانگنا میرے لئے باعث فخر ہے، آپ میری بڑی ہیں، بزرگ ہیں، مجھے مار بھی لیں، تو اف کا لفظ نہیں نکل سکتا، میرے منہ سے، غلطی زمانی بیگم سے ہوئی، اور سچ کہتی ہوں، وہ بہت زیادہ نادم اور شرمسار ہیں، میری التجا قبول کر لیجئے، ——— معاف کر دیجئے انہیں، !"

چھوٹے میاں کی باتیں سنکر، نعیمہ کا آدھا غصہ رفع ہو گیا تھا،

عفت کی یا نہیں سنکر باقی بھی رخصت ہو گیا، وہ گویا ہوئیں،
"میں نے معاف کیا، !"
زمانی بیگم آکر نعیمہ سے لپٹ گئیں، اور ان کے گلے میں باہیں ڈال کر
کہنے لگیں،
"مجھے آپ سے یہی امید تھی، ـــــــ نہ جانے میری کیا شامت
آئی تھی کہ ایسے الفاظ منہ سے نکل گئے ؟ ۔ ، سوچتی ہوں تو خود مجھے
اپنے آپ سے نفرت ہونے لگتی ہے، جی چاہتا ہے زمین پھٹے اور
اس میں سما جاؤں، !"
شرفو میاں نے چھوٹے میاں کا ہاتھ پکڑ کر کہا،
اب یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو ؟ آؤ، باہر چلیں، !"
شرفو میاں اپنے ساتھ چھوٹے میاں کو لے گئے، اور ان کے جانے
کے بعد، پہلے سے زیادہ گرم جوشی کے ساتھ نعیمہ اور قمر کی آؤ بھگت
ہونے لگی۔
اب چائے کا وقت آگیا تھا، عفت نے کہا،
اس گڑبڑ میں چائے کا خیال بھی نہیں رہا، حالانکہ ہماری بھابی
(نعیمہ) کو دنیا میں اگر کسی چیز کا شوق ہے تو چائے کا، !"
زمانی بیگم مسکراتی ہوتی ہوئی بولیں،
"اور اگر دنیا میں کسی سے محبت ہے تو بس صرف قمر سے، !"
نعیمہ کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

اندر کمرہ میں بہت جلد یہ خبر پہنچ گئی کہ ————

ایک بہت بڑا اور ہیبت ناک ———— طوفان آیا تھا، لیکن ٹل گیا، زمانی بیگم کی ندامت، اور عفت کے تدبر نے سارا معاملہ ختم کر دیا، اور اب پھر وہی خوشگوار فضا قائم ہوگئی ہے، جو پہلے تھی، یہ خبر سنکر، شاہینہ، سکینہ، رضیہ اور صفیہ کے پژمردہ چہرے بھی پھول کی طرح کھل گئے،!

نصرت اب تک ایک گوشہ میں چپ چاپ خوبصورت تصویر خاموش بیٹھی سوچ رہی تھی، زمانی بیگم سے کہیں زیادہ باتیں تو اشاروں میں، میں نے قمر کو سنا دی ہیں، کہیں اب میری باری نہ آئے، زمانی بیگم کا تو رشتہ ایسا تھا کہ بچ گئیں، میری اگر شامت آئی، تو مجھے کون بچائے گا؟ خیر سے اب طوفان تھم چکا ہے، بچ نکلنے کا اس سے اچھا موقعہ کوئی اور نہیں ملے گا، قبل اس کے کہ عفت، زمانی بیگم اور قمر، اس کمرہ میں واپس آئیں، اور بات چلے .... مجھے یہاں سے رخصت ہو جانا چاہیے، یہی سوچ کر اس نے صفیہ اور رضیہ مخاطب ہو کر کہا۔

"اچھا بھئی اب چلتے ہیں، ————

صفیہ نے روکنا چاہا، لیکن معاً اس کے دل میں بھی وہی خیالات آ گئے جو ابھی خود نصرت کے دل میں پیدا ہوئے تھے، لہذا اس نے اپنا ارادہ واپس لے لیا، اور سرد لہجہ میں کہا،

"اچھا، ——————

رعنیہ نے ان دونوں کے تاثرات سے بے خبر تھی اس نے کہا،

"بیٹھو ———— جانا ہی ہے تو چائے پی کر چلی جانا"! "

نصرت گھبرا گئی، اس نے اضطراب کے ساتھ کہا۔

نہیں چائے نہیں پیوں گی، اب مجھے جانے دو"! "

ثنا ہینہ کھلکھلا کر ہنس پڑی،

"میں سمجھ گئی"! "

سکینہ نے سوال کیا،

"کوئی خاص بات ہے"

وہ بولی،

ہاں، ———— یہ نصرت بھی سوچ رہی ہیں کہ انھوں نے بھی کچھ کم نہیں ستایا ہے قمر کو، اگر کہیں یہ نظر میں آ گئیں تو کیا ہوگا، ————

کیوں نصرت یہی بات ہے نا؟"

نصرت نے ہنستے ہوئے کہا، !

"یہی سہی"! "

اور پھر وہ چلی گئی، !

(۱۲)

معاملہ خیر و خوبی سے ختم ہو گیا، رضیہ اور صفیہ کی شادی کے بعد بہت خوشگوار فضا میں نعیمہ اور قمر رخصت ہو کر اپنے گھر آئیں، گھر آنے کے بعد دونوں جب اپنے اپنے بستر پر رات کو سونے کے لئے لیٹیں، تو ہر ایک الگ آج کی اس صورت حال پر غور کر رہی تھی،

نعیمہ سوچ رہی تھی،

چھوٹے میاں نے کچھ میرا، کچھ بھائی کا، کچھ بھتیجی کا پاس کیا اور معاملہ دب گیا، لیکن ہر جگہ اور ہمیشہ تو ایسا نہیں ہو سکتا،

میں کب تک اس کی سپر بنی رہوں گی،

بیوگی کا داغ اس کے وجود پر لگ چکا ہے، جب تک اس کی شادی نہ

ہو جائے، یہ داغ مٹ نہیں سکتا،

لیکن کیا شادی کرنے پر شرفو میاں تیار ہو جائیں گے؟

میرا خیال ہے کہ وہ کسی طرح اس کام پر آمادہ نہیں ہو سکتے،

لیکن حرج کیا ہے صبح ان سے گفتگو کروں گی، شاید اللہ ان کے دل میں رحم ڈال دے۔

بڑی دیر تک نعیمہ یہی باتیں سوچتی رہی پھر سو گئی،

ادھر قمر اپنے کمرہ میں بستر پر لیٹی کروٹیں بدل رہی تھی، وہ سوچ رہی تھی،

آج اماں نے میرے لیے جس طرح جان کی بازی لگا دی، اس کی مثال دنیا میں مشکل سے مل سکتی ہے، کبھی بھولے سے بھی میرے دل میں یہ خیال نہیں آیا تھا کہ وہ مجھے اتنا زیادہ چاہتی ہیں، غضب خدا کا محض میرے لیے مجھ بدبخت اور بدنصیب کے لیے وہ اس گھر کو، اپنے دونوں لڑکوں کو اور اپنے شوہر کو چھوڑنے پر تیار ہو گئیں، میں نے ماں بیٹی کی محبت کے بہت سے مناظر دیکھے ہیں لیکن ایسا دل افروز، روح پرور، اور شاندار نظارہ آج تک دیکھنے میں نہیں آیا تھا، میری ماں عظمت کی دیوی ہے،

لیکن سوال یہ ہے کہ بکری کی ماں کب تک خیر منائے گی؟،

آج چچا جان کے ہاں جو کچھ ہوا، وہ آنے والے واقعات کی تمہید ہے، زمانی بیگم نے جو کچھ کہا وہ صرف ان کی آواز نہ تھی، شریفوں اور نجیبوں کے ہر خاندان کی متفقہ آواز تھی، بیشک چچا جان نے میدان میں آکر پانسہ پلٹ

دیا اور زمانی بیگم مجھ سے معافی تک مانگنے پر مجبور ہو گئیں، لیکن انھوں نے جو کچھ کہا تھا وہ ان کے دل کی آواز تھی، ہمارے خاندان کے ہر فرد کی ترجمانی تھی،

تقاضائے دانش یہ ہے کہ حقیقتوں کا انکار نہ کیا جائے، انہیں تسلیم کر لیا جائے، میری بیوگی ایک ٹھوس حقیقت ہے، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا جب انکار نہیں کیا جا سکتا تو تسلیم کر لینا چاہیئے، یہی مصلحت ہے، یہی معقولیت ہے۔

اماں جان چاہتی ہیں کہ مجھے بیوہ نہ کہا جائے، وہ خود بھی غلط فہمی میں مبتلا ہیں اور مجھے بھی مبتلائے غلط فہمی کرنا چاہتی ہیں، سفید کو سیاہ اور سیاہ کو سفید کہہ کر ایک آدمی اپنے دل کو جھوٹی تسلی دے سکتا ہے، لیکن سفید، سفید ہی رہے گا، اور سیاہ، سیاہ ہی رہے گا، اماں اپنی بے پناہ محبت کے باعث مجھے بیوہ تسلیم نہیں کرتیں، لیکن ساری دنیا کو سارے شہر کو، سارے خاندان کو، سارے کنبے کو، حتیٰ کہ میرے باپ تک کو مجھ سے اتنی محبت نہیں ہے جتنی میری ماں کو ہے، اسی لئے یہ سب میری بیوگی پر مہر تصدیق ثبت کر چکے ہیں، ان کا یہ فیصلہ اٹل ہے، اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو گی،

اماں جان کی ایک خواہش یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ میرا داغ بیوگی کسی سے میری شادی کر کے دھو دیں، لیکن یہ ان کی سادگی کی انتہا ہے،

جس خاندان میں بیوہ عورت اس طرح منحوس سمجھی جاتی ہے، وہاں کا کوئی

فرد ایک بیوہ عورت سے شادی کر کے کیوں اپنے لئے ایک نئی مصیبت مول لے گا؟، جس خاندان کی حالت یہ ہو کہ خاندان سے باہر نہ لڑکی لی جاتی ہو، نہ دی جاتی ہو، وہاں یہ سوال بھی پیدا نہیں ہو سکتا کہ کوئی ایسا شخص اماں کا داماد بن سکے گا جو اس عظیم و جلیل خاندان سے تعلق نہ رکھتا ہو،

پھر اس خوش فہمی میں مبتلا رہنے سے کیا فائدہ، خلیق مر گیا، میں زندہ در گور ہو گئی، ——— اب قسمت سے لڑنے اور دوسروں سے جھگڑنے کا کیا حاصل؟ ،

اگر یہ طے کر لوں کہ ایک بیوہ کی حیثیت سے مجھے آئندہ زندگی بسر کرنی ہے تو اس فیصلہ کے بعد مجھے سکون مل جائے گا، میں فارغ ہو جاؤں گی، پھر یہ ذہنی کشمکش جس نے مجھے پریشان کر رکھا ہے، خود بخود دور ہو جائے گی، دنیا ہنسے، گائے، ناچے، قہقہے لگائے، نشاط و مسرت کی گود میں کھیلے، سرمستی اور بے خودی کے جھولے، عیش کرے مجھے اس کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں،

میں اپنی ایک الگ دنیا بساؤں گی، ویرانگی کی دنیا، جہاں خوشی کا داخلہ ممنوع ہوگا، غم کی حکومت ہوگی، جہاں قہقہے لگانا جرم ہوگا، آنسو بہانا فرض، جہاں بہار کی رعنائیاں جھانک بھی نہ سکیں گی، صرف خزاں کا دور دورہ ہوگا یہ بھی ایک دنیا ہے، اس دنیا میں بھی بہت سے لوگ رہتے ہیں تو ایک میں بھی سہی،

بے شک اماں کو میرا یہ فیصلہ شاق گزرے گا، لیکن انہیں راضی

کر لوں گی ، صبح ہونے سب سے پہلا کام یہی کرنا ہے کہ اس مسئلہ پر ان سے گفتگو کرنی ہے،

شروع شروع میں وہ انکار کریں گی میری بات ماننے سے ، لیکن میں انہیں منا لوں گی، میں انہیں منانے کا گر جانتی ہوں، ——

—— آنسو، !

---

(۱۳)

رات کو شرفو میاں دیر سے آئے، لیکن صبح اٹھنے کے معاملہ میں ہمیشہ سے چوکس تھے، لہذا ٹھیک وقت پر اٹھ بیٹھے، ناشتہ سے فارغ ہو کر باہر جا رہے تھے کہ نعیمہ آئی، اس نے کہا،

میں کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں،

شرفو میاں جاتے جاتے بیٹھ گئے،

زہے قسمت، ——— فرمایئے کیا ارشاد ہوتا ہے!؟

نعیمہ نے پوچھا،

آخر قمر کے بارے میں تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟ کیا سوچا ہے؟"

شرفو میاں نے ڈبیہ سے پان نکال کر کھاتے ہوئے کہا،

"کوئی نئی بات تو نہیں سوچی ہے' ——— اور خدائی فیصلہ کے بعد انسان ضعیف البنیان سوچ بھی کیا سکتا ہے' ؟ اور اگر سوچے بھی تو کر کیا سکتا ہے ؟"

نعیمہ نے بہت درد بھرے انداز میں کہا،

"تم اپنی بیوی کو چاہتے ہو، لڑکوں پر جان دیتے ہو، لیکن، اپنی لڑکی سے کیوں نفرت کرتے ہو ؟"

شرفو میاں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، جیب سے رومال نکال کر پہلے اشک رواں خشک کئے، پھر کہا،

"نعیمہ مجھے گالیاں دے لو مگر یہ نہ کہو، ——— میں قمر سے محبت کرتا ہوں ؟ کیا تم خدا کو گواہ کر کے یہ کہہ سکتی ہو ؟ بیگم میں اسے بہت زیادہ چاہتا ہوں، فرق صرف اتنا ہے کہ تمہاری چاہت میں برابر کی حماقت شریک ہے، اور میری محبت میں عقل بھی شامل ہے' !"

نعیمہ نے کہا،

"سارا جھگڑا اس بات پر ہے کہ تم کہتے ہو، قمر بیوہ ہے، میں کہتی ہوں نہیں ہے' اس بات پر اگر ہم دونوں میں سمجھوتہ ہو جائے، پھر کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا"

شرفو میاں نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے خلا میں گھورتے ہوئے کہا،

"یہ سمجھوتہ تو پہلے سے ہے' جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے' میں

اسے بیوہ ہر گز نہیں سمجھتا، وہ کہاں سے بیوہ ہے، صرف نکاح سے کہیں عورت بیوہ ہوتی ہے ——"

"یہی تو میں بھی کہتی ہوں، لیکن تم مانو بھی تو، !"

"مان تو لیا، —— لیکن اس سے آگے؟"

"اس سے آگے یہ کہ جب وہ بیوہ نہیں ہے تو پھر اس کی شادی ہونی چاہیے، !"

"نعیمہ تمھاری خاطر میں سب کچھ کر سکتا ہوں، —— مان لیا میں شادی کرنے پر تیار ہوں لیکن داماد تم تلاش کرو، !"

"تم کس مرض کی دوا ہو پھر ——؟"

"وہی تو میں کہتا ہوں کہ تمھاری محبت میں حماقت بھی شریک ہے، خدا کی بندی تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تمھارے دیور کے گھر میں، محض جھوٹ موٹ، یعنی نام نہاد طور پر بیوہ ہونے کے باعث، قمر کی کیا گت بنی ——————؟"

"ہاں دیکھ لیا، —— خدا چھوٹے میاں کو سلامت رکھے، انھوں نے زمانی بیگم اور عفت دونوں کا مزاج درست کر دیا، !"

"وہ تو کر دیا، اور میں کہتا ہوں اچھا کیا، لیکن زمانی بیگم، میرے گھر میں یا چھوٹے کے گھر میں لب کشائی کرتے ہوئے ڈریں گی، کیا دوسروں کے گھر میں بھی ان کی زبان بند کی جا سکے گی، ——؟"

نعیمہ کے لئے اس سوال کا جواب فوراً دینا آسان نہ تھا، وہ سوچنے لگی،

مشرفو میاں نے کہا۔

"اور فرض کرلو، کسی ترکیب سے ہمیشہ کے لئے زمانی بیگم کی زبان بند کردی جائے، لیکن کیا خاندان بھر کی زبان کاٹی جاسکتی ہے'؟"

"اونہہ تمھارا خاندان' ——————"

"اس میں خفا ہونے کی بات نہیں، جو میرا خاندان ہے وہی تمھارا ہے اتنے دنوں سے جو سر پھوڑ رہا ہوں، وہ اسی بات پر تو کہ، ہم خاندان سے قطع تعلق نہیں کرسکتے"، اور جب خاندان سے قطع تعلق نہیں کرسکتے تو پھر اس کے اصولوں، ضابطوں، قاعدوں کی پیروی کرنی پڑے گی'، !"

"تو اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ——————"

"جی ہاں نعیمہ بیگم صاحبہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ خاندان کسی قیمت پر بھی یہ تسلیم نہیں کرسکتا کہ قمر بیوہ نہیں ہے، اور یہ خاندان، چونکہ عقد بیوگان کا مخالف ہے، لہذا کسی قیمت پر بھی اس خاندان کا کوئی فرد، قمر سے، اس کی خوب صورتی، اور خوب سیرتی کے باوجود شادی کرنے پر تیار نہیں ہوگا، —————— آیا سمجھ میں' !"

اب یہ تلخ حقیقت کچھ کچھ نعیمہ کی سمجھ میں آنے لگی تھی، اور جتنی جتنی آتے لگی تھی اسی تناسب سے پاؤں تلے سے زمین نکلنا شروع ہو گئی تھی، وہ محسوس کر رہی تھیں، واقعی یہ سوال تو بہت ٹیڑھا ہے،

لیکن نہیں، ابھی امید کی ایک ہلکی سی کرن باقی تھی، انھوں نے ڈرتے ڈرتے، اور جھجکتے جھجکتے سوال کیا۔

لیکن ایک بات اور بھی تو ہو سکتی ہے ؟"

" وہ کیا؟ ـــــــ کہہ ڈالو بڑے شوق سے سنوں گا ،!"

" یہ کہ ـــــــــ"

" ہاں ہاں کہو ، رک کیوں گئیں ، ؟ میں جانتا ہوں ، کیا کہنا چاہتی ہو ، اور کہتے ہوئے کیوں جھجک رہی ہو ؟ "

نعیمہ بیگم جھینپ گئیں ، کہنے لگیں ،

" اچھا بتاؤ ، میں کیا سوچ رہی ہوں ؟"

شرفو میاں نے تڑسے کہا ،

تم یہ سوچ رہی ہو کہ قمر کی شادی خاندان کے باہر کیوں نہ کر دی جائے ؟

ـــــــ سچ کہنا ہے نہ یہی بات ؟"

خفیف سے تامل کے بعد وہ بولیں ،

" ہاں ، ـــــــ تو اس میں حرج کیا ہے ؟ "

شرفو میاں اپنی جگہ سے ایک بالشت اچھل پڑے ، انھوں نے کہا ،

" کیا کہا ، اس میں حرج کیا ہے ؟ ـــــــ بتاؤں اس میں کیا حرج ہے ؟ "

نعیمہ نے ڈرتے ڈرتے پوچھا ،

" ہاں بتاؤ ، ! "

شرفو میاں نے طنز کرتے ہوئے فرمایا ۔"

" ہاں کوئی خاص حرج تو نہیں صرف اتنا ہے کہ اقرار و اظہار کی نسبتیں

منقطع کرنا پڑیں گی ــــــــ"

یہ سنکر نعیمہ بیگم کو چکر آ گیا، کیونکہ لڑکوں کی نسبت جہاں کی تھی، وہ لڑکیاں صورت اور سیرت کے اعتبار سے پسند تھیں، یہ تشویش ابھی دور نہیں ہوئی تھی کہ شرفو میاں نے ایک بلند پایہ ماہر نفسیات کی طرح ایٹم بم پھینکا،

"یا پھر یہ حرج ہے کہ جب میں مروں گا، تو خاندانی قبرستان میں دفن نہیں کرنے دیا جاؤں گا ــــــــ خیر اس کی تو مجھے پروا نہیں، تمہارے اور قمر کے سکھ کے لئے کیا میں اتنا بھی نہیں کر سکتا، !"

اس زبردست حملہ سے ابھی نعیمہ پورے طور پر سنبھلنے نہ پائی تھی کہ شرفو میاں نے ایک اور کاری، وار کیا،

"سارا خاندان ہمارا بائیکاٹ کر دے گا، مرنے جینے میں، خوشی اور غم میں کوئی ہمارا ساتھ نہیں دے گا، ــــــــ بہرحال جو حرج تھا وہ میں نے بتا دیا، اب جیسا تم کہو، !"

ظاہر ہے اتنا کچھ سننے کے بعد نعیمہ کے لئے کچھ کہنا آسان نہ تھا، ! مامتا کے جوش میں ابتک تصویر کے اس رخ پر ان کی نظر نہیں گئی تھی، شرفو میاں نے یہ دوسرا رخ جو پیش کیا تو وہ لرز گئیں، بے شک اس میں کچھ مبالغہ تھا، اسے انھوں نے بھی محسوس کر لیا تھا، لیکن یہ بھی سمجھ لیا تھا کہ مبالغہ الگ کرنے کے بعد بھی، حالات ایسے پیش آ سکتے ہیں، جن کا مقابلہ آسان نہیں ہے۔

آخر بالکل مایوس ہو کر نعیمہ نے وہی کیا جو ہر عورت ایسے مواقع پر کیا کرتی ہے، یعنی رونے لگیں '!'

شرفو میاں نے اپنی اور ان کی عمر کا لحاظ کئے بغیر جیب سے پھر ایک مرتبہ رومال نکالا، اور جس سے ابھی ذرا دیر پہلے وہ اپنے ظاہری اور مصنوعی آنسو پونچھ چکے تھے، اس سے نعیمہ کے قطرات اشک پونچھنے لگے!

"میری بچی، میری جان، تیری ہر بات میرے لئے خدائی حکم کا درجہ رکھتی ہے،" ——

پھر انھوں نے قمر کی ٹھوڑی اپنے ہاتھ میں لے کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور کہا ——،

"بتا، کیا کہنا چاہتی ہے؟"

"ماں کا یہ انکسار اور اظہارِ محبت دیکھ کر قمر کا دل اس کی عظمت کے سامنے سرنگوں ہو گیا اس نے رکتے رکتے کہا، ——

اماں میری بات سن کر آپ خفا تو نہ ہو جائیں گی؟"

نعیمہ نے پیار بھری نظروں سے اسے دیکھا اور کہنے لگیں،

"کیا میں تجھ سے بھی خفا ہو سکتی ہوں، نہیں میری بچی، کبھی بھولے سے بھی یہ خیال نہ کرنا۔"

ماں کے ان جذبات نے قمر کا ارادہ متزلزل کر دیا، وہ سوچنے لگی، جو کچھ کہنا چاہتی ہوں، نہ جانے اس کا ردِعمل کیا ہو گا؟، پھر یہ سوچ کر کہ جو کچھ کہنا ہے وہ زندگی اور موت کا مسئلہ بن چکا ہے، لہٰذا اس کو ملتوی بھی نہیں کیا جا سکتا، وہ آغازِ کلام کرنے والی تھی، کہ بیٹی کو خاموش دیکھ کر نعیمہ نے پھر محبت بھرے لہجہ میں کہا،

"اری تو خاموش کیوں ہو گئی، بتاتی کیوں نہیں؟"

قمر نے اپنے حواس بجا کیئے اور کہا ——

"میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ آپ نے میرے لئے زمانی بیگم اور عفت چچی

سے کل جو لڑائی لڑی تھی، اب اس کا اعادہ نہیں ہونا چاہئے"
نعیمہ کا چہرہ سفید پڑ گیا، انھوں نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا،
"قمر تو یہی کہنا چاہتی تھی؟"
قمر نے ماں کے سینہ پر سر رکھے رکھے دونوں بانہیں اس کی گردن میں حمائل
کر دیں اور بولی،
"ہاں اماں، میں یہی کہنا چاہتی تھی، میں جانتی ہوں، تم مجھ سے کتنی
محبت کرتی ہو، کل میں نے اندازہ کر لیا میرے لئے تم ساری دنیا کو چھوڑ
سکتی ہو، حتیٰ کہ اپنے شوہر اور میرے باپ تک کو بھی، لیکن اس کے باوجود
تم اس خاندان کو، اس کی ذہنیت کو، اس کی ریت کو، اس کے رسم و رواج
کو نہیں بدل سکتیں، کوئی نہیں بدل سکتا، اگر کفر نہ ہوتا تو میں کہتی، خدا بھی
نہیں بدل سکتا، لیکن اماں ہم اسی خاندان کے فرد ہیں، ہمارا مرنا اور جینا اسی
خاندان میں ہوتا ہے اور ہوگا، ہم اگر چاہیں بھی تو اسے نہیں چھوڑ سکتے تو اس
کے رسم و رواج کے سامنے سر جھکا دینا ہی عقلمندی ہے۔"
نعیمہ کی نظریں بیٹی کے چہرے پر تھی غضب اور قمر بڑی محبت سے ماں سے
گلے میں باہیں ڈالے کہہ رہی تھی،
"تم چاہتی ہو کہ مجھے بیوہ نہ تسلیم کیا جائے، یہ اس لئے چاہتی ہو کہ تمھاری
خواہش ہے کہ میری زندگی کا جو باب ختم ہو گیا وہ پھر سے شروع کیا جا سکے،
لیکن میری پیاری ماں، یہ انہونی بات ہے، یہ نہیں ہو سکتا، اور میں کہتی ہوں
کہ اس کا نہ ہونا ہی اچھا ہے، میں کئی دن سے غور کر رہی ہوں کہ تم یہ خیال

اپنے دل سے نکال دو"

نعیمہ نے قمر کے سر اور منہ کو اپنی دونوں باہوں میں لپیٹ کر اسے پیار کرتے ہوئے بادیدۂ پرنم سوال کیا،

"کیا میں اسے گوارا کر لوں کہ یہ پہاڑ سی زندگی تو اسی طرح گزار دے گی؟ زندگی کی ہر خوشی تیرے لئے بے معنی ہو جائے گی؟ میری بچی، ماں کے دل کو تو نے اب تک نہیں پہچانا، ایک ماں اپنی لڑکی کے لئے یہ کبھی نہیں گوارا کر سکتی؟"

قمر نے ماں کی گود میں اسی طرح لیٹے لیٹے کہا،

"میری اماں، میری محبت نے تمھیں بہت زیادہ جذباتی بنا دیا ہے، مجھ میں کون سے ایسے سرخاب کے پر لگے ہیں، دنیا میں نہ جانے کتنی عورتیں اور لڑکیاں جو مجھ سے زیادہ خوب صورت اور کم عمر ہوں گی، صبر اور شکر کے ساتھ بیوگی کی زندگی بسر کر رہی ہیں، میں کیوں نہیں کر سکتی؟ مجھے تو تمھارا سہارا حاصل ہے، ان بدقسمتوں کو گھر میں بھی نہ خوشی حاصل ہے، نہ سکون تم نے تو مجھے اس گھر کی رانی بنا رکھا ہے، تمھاری وجہ سے میں راج رجتی ہوں۔ بھائی میرے اطاعت گزار ہیں، باپ مجھ سے محبت کرتا ہے، ماں ہزار جان سے مجھ پر فدا ہے، کیا اس کے بعد بھی میں غمگین رہ سکتی ہوں؟"

نعیمہ نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ حیرت سے اپنی بے زبان لڑکی کی باتیں سن رہی تھی، اور اس بے زبان لڑکی میں اس وقت نہ جانے کہاں کی طاقت گویائی آگئی تھی، اس کا سلسلہ کلام جاری تھا، وہ کہہ رہی تھی،

"اس دنیا میں ایک لڑکی کے لئے ایک عورت کے لئے یہی چیز خوشی اور مسرت کا سبب نہیں ہے کہ اس کی شادی ہو، وہ اپنا الگ گھر بسائے، وہ ایک نئی زندگی بسر کرے"

نعیمہ نے درد بھری نظروں سے قمر کو دیکھتے ہوئے پوچھا،

"کیا اس کے علاوہ بھی کوئی چیز کسی لڑکی کو، کسی عورت کو خوش رکھ سکتی ہے؟"

قمر نے ماں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا،

"کیوں نہیں، کیا ایک لڑکی یا ایک عورت کو باپ کی سیوا کر کے، ماں کی خدمت کر کے، بھائیوں پر واری اور صدقے قربان ہو کر خوشی نہیں مل سکتی، مل سکتی ہے، میں اپنی ساری زندگی خواہ وہ طویل ہو یا مختصر، ماں باپ کی خدمت میں اپنی جان سے زیادہ پیارے بھائیوں کی خدمت میں بسر کروں گی اور کبھی میرے دل میں اگر تمہاری بیٹی ہوں تو کوئی ناپاک اور غلط خیال نہیں آئے گا۔"

نعیمہ نے ایک مرتبہ پھر قمر کو پیار کیا اور کہا،

"میں جانتی ہوں، میری بچی، میں تجھے بہت اچھی طرح جانتی ہوں، تجھ سے بڑھ کر نیک، پاک، صاف دل کوئی لڑکی مشکل سے ہوگی"

قمر نے مسکراتے ہوئے ماں کو دیکھا اور بولی،

"اگر واقعی تمہارا یہ خیال ہے تو پھر اب کبھی یہ نہ سوچنا کہ میری کتاب زندگی کا جو باب قدرت نے بند کر دیا ہے اسے پھر شروع کیا جا سکتا

ہے۔"

نعیمہ ایک آہ بھر خاموش ہوگئی قمر نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

"تھوڑے دنوں کے بعد میرے بھائیوں کی شادی ہو جائے گی، ان کی بیویاں آئیں گی، بچے ہوں گے، ان بچوں کو میں چھین لوں گی، وہ میرے بچے ہوں گے، میں اپنی ساری زندگی، ان کی تعلیم و تربیت میں صرف کر دوں گی، یہی میری زندگی کا حاصل ہوگا جس پر بجا طور پر میں فخر کر سکوں گی، بہنیں بھائیوں کے لئے کیا کچھ نہیں کرتی ہیں، اپنی یہ ناکام اور ناکارہ زندگی ان کے لئے وقف نہیں کر سکتی؟"

نعیمہ کے لب خاموش تھے، انگلیاں قمر کے بالوں سے کھیل رہی تھیں، اور وہ ایک عجیب کیفیت کے عالم میں کہے جا رہی تھی:

"جب تک تم مجھ سے وعدہ نہ کر لو کہ اس معاملہ میں میری مرضی پر چلو گی، اس وقت تک مجھے سکون نہیں ہو سکتا، میرے آنسو نہیں رک سکتے، میرے دل کا رونا بند نہیں ہو سکتا، اماں میں تمھیں کس طرح یقین دلاؤں کہ میرے دل میں خدا اور رسول کے بعد تمھاری ہی عزت اور عظمت ہے، میرے بس میں ہوتا تو اپنا کلیجہ چیر کر تمھیں دکھا دیتی کہ اس دنیا میں کسی کو بھی میں اتنا نہیں چاہتی جتنا تمھیں چاہتی ہوں" نعیمہ کی انگلیاں جو قمر کے بالوں میں گردش کر رہی تھیں کانپنے لگیں، لیکن وہ خاموش تھی، اس نے جواب میں ایک لفظ بھی نہ کہا۔ البتہ قمر کی تقریر جاری تھی، وہ کہہ رہی تھی:

"ابا تم سے بہت زیادہ حقیقت پسند اور دور اندیش ہیں، انھوں

نے پہلے ہی دن محسوس کر لیا تھا کہ اصل واقعہ کی نوعیت کیا ہے، لیکن تم اپنے جنونِ محبت کے باعث اصل حقیقت کو تسلیم کرنے سے اب تک انکار کئے جا رہی ہو، جب میں تمہیں اپنے لئے روتے دیکھتی ہوں تو جی چاہتا ہے خودکشی کر لوں، جب اپنے لئے میں تمہیں کسی دوسرے سے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر جھگڑتے دیکھتی ہوں تو جی چاہتا ہے زمین پھٹے اور میں اس میں سما جاؤں، جب تم میں اور ابا میں "تلخ" اور "تند گفتگو" ہوتی ہے تو الفاظ نہ سن سکنے کے باوجود سمجھ جاتی ہوں، میرے اوپر لڑائی ہو رہی ہے، ابا ایک ٹھوس حقیقت کے تسلیم کرنے پر بضد ہیں، اور تم اسے محض اپنی بیٹی کی خاطر ٹھکرانی چلی جا رہی ہو، یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا، ؟ اب تک تو مجھے دوسرے ہی منحوس سمجھتے ہیں، لیکن اگر تمہارا یہ رویہ جاری رہا تو میں اپنے آپ کو منحوس سمجھنے لگوں گی، بتاؤ کیا اپنے آپ کو منحوس سمجھنے کے بعد مجھے زندہ رہنے کا حق ہو گا ؟ "

فہمیدہ نے اپنے دونوں ہاتھ خوشامد اور پیار کے مشترک جذبہ سے قمر کے گالوں پر پھیرتے ہوئے کہا !

"میری بچی یہ تو کیا کہہ رہی ہے، جو تجھے منحوس کہتے ہیں، ان کی سات پشتیں منحوس ہیں، خدا نہ کرے تو کیوں منحوس ہونے لگی، اپنے لئے تیرے دل میں ایسا بے تکا خیال کیوں آیا ؟ "

قمر نے اسی طرح ماں کی گود میں لیٹے لیٹے اسے محبت بھری نظروں سے دیکھا اور کہا،

"اگر میں یہ دیکھوں کہ میری وجہ سے میرے باپ اور ماں میں اَن بن ہو رہی ہے، میرے خاندان میں اختلاف اور دشمنی پیدا ہو رہی ہے، میرے بھائیوں کے لئے ذہنی کوفت اور کشمکش کے سامان پیدا ہو رہے ہیں تو کیا مجھے اپنے آپ کو منحوس نہیں سمجھنا چاہیئے؟ کیا لڑکی اسی لئے ہوتی ہے کہ اس کی وجہ سے گھر اور خاندان میں دشمنی پیدا ہو جائے؟ ماں اور باپ کے تعلقات تلخ ہو جائیں؟ بھائیوں کے راستہ میں نئی نئی مشکلات پیدا ہو جائیں، ـــــــ کیا میری وجہ سے یہ سب کچھ نہیں ہو رہا ہے؟ اگر ہو رہا ہے اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا تو تم ہی انصاف سے کہہ دو کہ مجھے اپنے بارے میں کیا رائے قائم کرنی چاہیئے؟"

ماں نے درماندگی کے عالم میں بیٹی سے پوچھا،

"آخر تو چاہتی کیا ہے؟"

قمر نے بڑے نرم اور شائستہ لہجہ میں کہا،

"ہر معاملہ میں آنکھ بند کر کے تمھارے حکم پر چلنا میں اپنا فرض سمجھوں گی، لیکن اس ایک معاملہ میں، یعنی میرے ذاتی معاملہ میں تمھیں میری مرضی پر چلنا پڑے گا، تم کوئی ایسی بات نہیں کرو گی، جو میرے ارادہ کے خلاف ہو، جب تک تم یہ وعدہ نہیں کر لیتیں، مجھ پر خواب و خور حرام ہے۔"

پھر ذرا دیر رک کر قمر نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا،

"اماں یقین کرو اس فکر میں مجھے رات رات بھر نیند نہیں آتی، میری بھوک بند ہو گئی ہے، کھانا دیکھتی ہوں تو جی متلانے لگتا ہے، میں کس

طرح برداشت کروں کہ تمہارے اور ابا کے تعلقات تلخ ہو جائیں،
تمہارے قدموں کے نیچے میری جنت ہے، ابا کی خوشنودی تمہاری عاقبت
سنوارنے کا ذریعہ ہے، میں تمہیں خفا نہیں کر سکتی، تم ان کی خفگی مت
مول لو۔"

نعیمہ نے پھر ایک ٹھنڈی سانس لی اور خاموش ہو گئیں، قمر نے محسوس
کیا، وہ اس وقت سخت ترین ذہنی کشمکش میں مبتلا ہیں، اس نے سوچا فیصلہ
کا یہی وقت ہے، کہنے لگی،

"اماں، کیا تم بھی مجھے مایوس کر دو گی، ایک لفظ ہاں کہہ کر میرے محروم
مسرت دل کو خوشی سے معمور نہ کر دو گی؟ ——— بتاؤ ———
میرے سوال کا کیا جواب دیتی ہو، اسی پر میری زندگی کا، میری قسمت کا، ہر
چیز کا فیصلہ ہے۔"

نعیمہ نے قمر کو گلے سے لگا لیا، اس کی پیٹھ سہلاتی ہوئی گلوگرفتہ آواز
میں بولی۔

"میری بیٹی، میری بچی ———"

قمر نے بات پوری نہ ہونے دی، قطع کلام کرتے ہوئے کہا،

"نہیں اماں، میں کچھ نہیں سنوں گی، میرے سوال کا جواب ہاں یا نہیں
میں ملنا چاہیئے، اس کے بعد بے شک جتنی دیر تک جی چاہے، جو مرضی
ہو کہتی رہنا۔"

نعیمہ نے ایک مرتبہ اور پہلے سے زیادہ بھینچ کر اسے کلیجے سے لگایا اور

رزتی ہوئی آواز میں کہا،

"میں وہی کروں گی جو تو چاہے گی، ———"

اس کے آگے نعیمہ نے کچھ کہنا چاہا مگر نہ کہہ سکیں، گلا رندھ گیا، آواز بھرا گئی، قمر اٹھ کر بیٹھ گئی، اس نے ماں کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھا اور کہا،

"میری اماں، کتنی اچھی ہو تم، ——— ساری دنیا سے اچھی، ——— دنیا کی ہر ماں سے اچھی!"

اتنے میں یکایک دروازہ کھلا اور شرفو میاں آ گئے،

شرفو میاں کو دیکھ کر نعیمہ تو بیٹھی رہی، قمر جلدی سے کھڑی ہو گئی اور ادب سے سر جھکا لیا، شرفو میاں کے چہرے سے آج پہلی مرتبہ ندامت، شرمندگی، اور پشیمانی کی کیفیت نمایاں تھی، شاید انھوں نے دروازہ میں کھڑے ہو کر ماں بیٹی کی باتیں سن لی تھیں، پیار بھری نظروں سے انھوں نے قمر کو دیکھا، اور گلوگیر آواز میں کہا۔

"بیٹی، نعیمہ کی اور میری زندگی ہی تک نہیں، اس کے بعد بھی تو راج رچے گی، اسی ہفتہ میں میرا ہبہ نامہ تیار ہو جائے گا، اپنی آدھی جائداد تیرے نام ہبہ کر دوں گا، تیرا اس پر قبضہ ہو جائیگا تو اسکی مالک و مختار ہوگی، نعیمہ کی، میری، اظہار، انوار کسی کی دست نگر اور محتاج نہ ہوگی"

قمر نے آج زندگی میں پہلی مرتبہ نظر اٹھا کر باپ کو دیکھا اس نگاہ میں محبت بھی تھی، اور حیرت بھی۔

(۱۵)

شرفو میاں مردانے میں بیٹھے حقہ پی رہے تھے، اور شکار کا پروگرام بنا رہے تھے، یکایک کوئی بات یاد آئی، اور بیگم سے تبادلۂ خیالات کیلئے اٹھے، دروازے پر پہنچے تو خلاف معمول بھڑا ہوا پایا، اور کچھ باتوں کی آواز بھی کان میں پہنچی، ٹوہ لینے کی عادت تھی، یہ دیکھ کر کہ دروازہ بند ہے اور اندر، قمر اور نعیمہ میں باتیں ہو رہی ہیں، اپنا جذبۂ تجسس ضبط نہ کر سکے، پٹ سے لگ کر کھڑے ہو گئے، اور ماں بیٹی کی باتیں سننے لگے،

لڑکی کی محبت نے انہیں اندھا کر دیا تھا،

انوار اور اظہار کی ولادت سے پہلے وہ قمر کو چاہتے تھے، پیار کرتے تھے، لیکن جب سے یہ دونوں لڑکے پیدا ہوئے تھے، ان کا نقطۂ نظر بدل گیا تھا،

وہ قمر کو اپنا، اور اپنے بیٹوں کا حریف سمجھنے لگے تھے، !

وہ سوچتے تھے، جو جائداد، پشت ہا پشت سے ہمارے اجداد نے بنائی اور قائم کی ہے، اس میں قمر شریک ہو کر ایک معقول حصہ اپنے ساتھ لے جائے گی، اور اس معقول حصہ سے اپنے بھائیوں کو محروم کر دے گی،

سوچتے تھے میرے باپ کا نام چلانے والا، زندہ رکھنے والا، یا میں ہوں، یا چھوٹے، میرے بعد، میرا نام چلانے والے اور زندہ رکھنے والے انوار اور اظہار ہوں گے۔

قمر کا اس میں کیا حصہ ہوگا؟ کچھ بھی نہیں، !

پھر وہ کیوں شریک جائداد ہو، ؟ پھر وہ کیوں، جدی میراث میں حصہ بٹائے ؟

مذہبی خیالات کے حامل ہونے کے باوجود، داڑھی رکھا لینے سے اور پابندی نماز باجماعت ادا کرنے کے باوجود بعض وقت شرع پر جھنجلا بیٹھتے تھے کہ آخر لڑکی کو باپ کی جائداد سے حصہ دینے کی ضرورت ہی کیا تھی ؟ ہندوؤں پر انھیں رشک آنے لگتا تھا کہ ان کے ہاں یہ جھنجھٹ نہیں ہے، !

اور سچ بھی تو ہے باپ پر صرف اتنا لڑکی کا حق ہے کہ اسے

پالے پوسے، جوان کرے، اور کسی اچھے، نیک اور شریف آدمی سے شادی کر دے، اب وہ جانے اور اس کا شوہر، اس کے بطن سے جو اولاد ہوگی، وہ اپنے باپ کا نام روشن کرے گی، اپنی ماں کے باپ سے اسے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے،

یہی خیالات تھے جن کے باعث، ایک عرصہ تک وہ عمر کی شادی کے خلاف رہے، اور جب حالات اور بزرگان خاندان کی مداخلت نے مزید تاخیر کو ناممکن بنا دیا، تو بعد از خرابی بسیار صرف نکاح پر آمادہ ہوئے اور رخصتی کے لئے طرح طرح کے بہانے کر کے، اس مدت کو زیادہ سے زیادہ طویل بناتے رہے۔

ہر طرح سے اور ہر طرف سے ہاتھ کٹ چکے تھے۔

پہلی بد قسمتی یہ کہ ایک لڑکی کا باپ بننا پڑا۔

دوسری اس سے بڑی بد قسمتی یہ کہ لڑکی تمام کٹھنائیاں جھیلتی ہوئی پروان چڑھتی رہی، نہ اسے ہیضہ ہوا، نہ طاعون، نہ ونی، یہاں تک کہ جوان ہو گئی،

تیسری اس سے بڑی اور ہولناک اور ناقابل برداشت بد قسمتی یہ کہ اس کی شادی کرنا پڑی۔

اور عین اس وقت، جب چوتھی، سب سے بڑی اور آخری بد قسمتی یعنی رخصتی کا سامان مکمل ہو چکا تھا، بے سان گمان یک بیک، ایک ساتھ ساری بد قسمتیاں ختم ہو گئیں ——————

ایک اتفاقی حادثہ کا شکار ہو کر

خلیق مر گیا، ———
اس حادثہ نے انھیں نئی زندگی دے دی،
جاں نذر دینی بھول گئے اضطراب ہیں، دل ہی دل جشن مسرت منایا، ناچے
اچھلے، کودے، نہ جانے کیسی کیسی حرکتیں، اس لئے کہ اب خطرہ
ٹل گیا تھا، !
خلیق کی موت نے ہر خطرہ دور کر دیا تھا،.
ہر اندیشہ رفع کر دیا تھا،
اب قمر شوق سے جیئے، عمر نوح پائے، اس کا وجو[illegible]
ہو سکتا ہے، نہ اس کے بھائیوں پر، بلکہ سچ یہ ہے [illegible] گراں
اس سے زیادہ کام کرتی ہے،
اب اس کا وجود ایک بار گراں نہیں رہ گیا، گوارا ہے، قابل بر[illegible]
ہے، اب جدی اور خاندانی جائداد محفوظ رہے گی، اب قمر کا حصہ اگ[illegible]
نہیں ہو گا، !
اب گھر کا اور سامان منقولہ و غیر منقولہ کا بٹوارہ نہیں ہو گا، !
چنانچہ گو نعیمہ کے سامنے، قمر کے سامنے، بیٹیوں کے سامنے،
کے سامنے، حکیم ماموں کے سامنے، سارے خاندان کے سامنے،
کے سامنے انھوں نے خوب خوب آنسو بہائے، لیکن دل [illegible]
خوشی کے ترانے گونجتے رہے،

لیکن آج ؟
آج ان کی دنیا بدل گئی !
قمر ماں سے جو باتیں کر رہی تھی، شرفو میاں نے ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف سن لیا تھا، !
اور یہ گفتگو سنتے ہی ان کی آنکھیں کھل گئی تھیں، !
ان کی دنیا بدل گئی تھی
ان کے خیالات میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہو گیا تھا، !
آنکھوں کے پردے اٹھ گئے تھے، !
قمر کی عزت اور رفعت کا سورج چمکنے لگا تھا
روشنی کے آگے ہر چیز ماند پڑ گئی تھی، !
عزت اور وفاداری کے ساتھ، قمر نے اپنی ویران زندگی کا فیصلہ کیا تھا، اور اس فیصلہ کے جو اسباب بنائے تھے، ان میں جس ایثار کی جھلک نظر آتی تھی، اس نے قمر کی عزت و عظمت کو دفعتہً نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا، !
اور ماں باپ، اور بھائی کے جذبات کو وہ ضبط نہ کر سکے، لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے ساتھ، دوڑتے ہوئے اندر گھس آئے، اور بیٹی کو سچے دل سے کلیجہ سے لگانے پر مجبور ہو گئے۔
آج پہلی مرتبہ شرفو میاں کے دل میں کانٹا چبھا تھا،
آج پہلی مرتبہ شرفو میاں نے ضمیر کی خلش محسوس کی تھی، !

آج بالکل پہلی بار، شرفو میاں کے دل میں قمر کی بے پناہ محبت کا سیلاب امنڈا تھا، !

اور انھوں نے وہ فیصلہ کیا تھا، جس کی مثال اس خاندان میں نہیں مل سکتی، ——— ساری جائداد کا آدھا حصہ لڑکی کے نام، !——

لیکن اس فیصلہ پر وہ ملول نہیں تھے، پشیمان نہیں تھے، خوش تھے، اور کسی حد تک نازاں بھی، !

جہاں تک نعیمہ کا تعلق تھا، وہ بھی اس انقلاب پر، اس اچانک انقلاب عظیم پر سخت حیران تھی، اسے ہرگز یہ امید نہیں تھی کہ شرفو میاں آگے بڑھیں گے تو اس حد تک بڑھ جائیں گے، شدت تاثر میں وہ اس اس بات کو بھول گئی تھی کہ شرفو میاں کا اصول یہی تھا، یا تو اپنی جگہ سے جنبش تک نہ کریں گے، یا انگڑائی لے کر اٹھیں گے تو ایسی چھلانگ لگائیں گے کہ سب کو پیچھے چھوڑ جائیں گے، !

---

(۱۶)

قمر باپ کے سامنے زیادہ دیر تک نہ ٹھہری، آہستہ آہستہ پاؤں رکھتی باہر چلی گئی، اس کے جانے کے بعد نعیمہ نے کہا،

"پتھر میں بھی جونک لگ سکتی ہے، یہ آج مجھے معلوم ہوا،"

شرفو میاں نے بات کو مذاق میں ٹالتے ہوئے کہا،

جی ہاں، قمر آپ ہی کی تو لڑکی ہے میرا تو اس سے کوئی واسطہ نہیں،!"

نعیمہ کے ترکش میں بھی ایک تیر موجود تھا،

"اگر تھا، تو اب تک تمہارا رویہ اس کے ساتھ اتنا سنگدلانہ کیوں تھا۔؟"

شرفو میاں، خوش گوار فضا قائم ہونے کے بعد اب اس ناخوشگوار بحث کو زیادہ دیر تک جاری رکھنا نہیں چاہتے تھے، کہنے لگے،

"بھئی غلطی کس سے نہیں ہوتی، ہم سے بھی ہو گئی چلو معافی مانگ لیتے ہیں، حالانکہ اگر تم سے غلطی ہو جائے تو ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے مگر کیا مجال ہے جو معذرت کا لفظ نکل جائے تمہارے منہ سے'!"

نعیمہ نے مسکراتے ہوئے کہا،

"مجھ سے غلطی ہوتی ہی نہیں کبھی'!"

شرفو میاں ہنسنے لگے،

"ہاں بھئی فرشتوں سے، توبہ حوروں سے بھی کبھی غلطی ہوئی ہے'!"

نعیمہ نے چھالیہ ٹو سے میں ڈالتے ہوئے کہا،

"بس آ گئے اپنے رنگ پر، میں کہتی ہوں ' ———"

شرفو میاں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا،

"نا بھائی خدا کے لئے کچھ نہ کہو، صرف میری سن لو ——— سوال یہ ہے کہ میں نے اس وقت ابھی قمر کے سامنے جو اعلان کیا تھا، وہ گوش گزار ہوا یا نہیں؟"

نعیمہ نے چھالیہ، تمباکو، الائچی، چکنی ڈلی کا پھنکا منہ میں ڈال کر کتھہ چونا چاٹتے ہوئے پوچھا،

"اعلان کیسا؟"

شرفو میاں نے ایک قہقہہ لگایا اور فرمایا،

(۱۶)

قمر باپ کے سامنے زیادہ دیر تک نہ ٹھہری، آہستہ آہستہ پاؤں رکھتی باہر چلی گئی، اس کے جانے کے بعد نعیمہ نے کہا،

"پتھر میں بھی جونک لگ سکتی ہے، یہ آج مجھے معلوم ہوا"

شرفو میاں۔ نے بات کو مذاق میں ٹالتے ہوئے کہا،

"جی ہاں، قمر آپ ہی کی تو لڑکی ہے میرا تو اس سے کوئی واسطہ نہیں"!

نعیمہ کے ترکش میں بھی ایک تیر موجود تھا،

"اگر تھا، تو اب تک تمھارا رویہ اس کے ساتھ اتنا سنگدلانہ کیوں تھا۔؟"

شرفو میاں، خوش گوار فضا قائم ہونے کے بعد اب اس ناخوشگوار
بحث کو زیادہ دیر تک جاری رکھنا نہیں چاہتے تھے، کہنے لگے،
"بھئی غلطی کس سے نہیں ہوتی، ہم سے بھی ہوگئی چلو معافی مانگ لیتے
ہیں، حالانکہ اگر تم سے غلطی ہو جائے تو ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے
مگر کیا مجال ہے جو معذرت کا لفظ نکل جائے تمہارے منہ سے'!"
نعیمہ نے مسکراتے ہوئے کہا،
"مجھ سے غلطی ہوتی ہی نہیں کبھی'!"
شرفو میاں ہنسنے لگے،
"ہاں بھئی فرشتوں سے' توبہ حوروں سے بھی کبھی غلطی ہوئی ہے'!'
نعیمہ نے چھالیہ بٹوے میں ڈالتے ہوئے کہا،
"بس آ گئے اپنے رنگ پر، میں کہتی ہوں' ——"
شرفو میاں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا،
"نا بھائی خدا کے لئے کچھ نہ کہو، صرف میری سن لو ——
سوال یہ ہے کہ میں نے اس وقت ابھی تم کے سامنے جو اعلان کیا تھا،
وہ گوش گزار ہوا یا نہیں؟"
نعیمہ نے چھالیہ، تمباکو، الائچی، چکنی ڈلی کا پھنکا منہ میں ڈال کر
کتھہ چونا چاٹتے ہوئے پوچھا،
"اعلان کیسا؟"
شرفو میاں نے ایک قہقہہ لگایا! اور فرمایا،

"بھئی خدا کی قسم عجیب چیز ہو ——— تقسیم جائداد کے بارے میں اس خاکسار نے کچھ عرض کیا تھا وہ سمع مبارک تک پہنچا یا نہیں؟"

نعیمہ نے بڑے سے اگالدان میں بڑی سی پیک تھوکی اور فرمایا،

"ہاں سنا کیوں نہیں؟"

"پھر کیا رائے ہے؟"

"میری رائے کیا چیز ہے؟ رائے تمہاری، فیصلہ تمہارا، جو چاہو کرو'!"

"پھر بھی مشورہ دینے میں کیا حرج ہے' ——— کم از کم اتنا بتا دو کہ اختلاف تو نہیں ہے؟"

"بالکل نہیں' ——— قمر کے ہاتھ میں جائداد کا جتنا حصہ آجائے گا، وہی محفوظ رہے گا'!"

"دوکان کھڑے کر کے، یہ کیا کہا تم نے؟"

"انوار اور اظہار سے، مجھے تو امید نہیں کہ یہ جائداد سنبھال کر رکھیں گے،

ابھی شادی نہیں ہوئی، ابھی کوئی ذمہ داری سر پر نہیں پڑی، ابھی جیب خرچ تنگ کے میرے اور تمہارے پاس سے دست نگر ہیں، مگر وہ شاہ خرچیاں ہیں کہ خدا کی پناہ، میں نے تو سنا ہے مہاجنوں سے قرض لینا شروع کر دیا ہے'!"

" (پریشان ہو کر) نعیمہ کیا یہ سچ ہے؟"

" یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے، لیکن، خود ہی اندازہ کر لو، جتنا جیب خرچ تم دیتے ہو، اس سے یہ ٹھاٹھ ہو سکتے ہیں؟"

" (کچھ سوچتے ہوئے) نہیں یہ تمہاری غلط فہمی ہے، لڑکے فضول خرچ بے شک ہیں لیکن اب ایسا بھی نہیں ہو سکتا کہ مہاجنوں سے قرض لینے لگیں ——— شاید تمہارا اشارہ موٹر سائیکلوں کی طرف ہے، تو منشی ابو محمد کی سفارش پر میں نے ہی اجازت دے دی تھی، منشی جی کہنے لگے جوان لڑکے ہیں جی نہیں مارنا چاہیئے! ——— بہرحال یہ لڑکے فضول خرچ ہوں یا نہ ہوں، نالائق ہوں یا سعادت مند، جیسا کریں گے بھگتیں گے۔

" ہاں اور کیا، !"

" مگر میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ، تقسیم جائداد کا مسئلہ اپنی زندگی میں طے کئے دیتا ہوں تاکہ میرے بعد، کوئی جھگڑا، بھائیوں بھاییوں یا بھاییوں اور بہن میں نہ ہو، ——— نہ ہر شخص شرفو میاں ہوتا ہے کہ چھوٹا بھائی جس چیز پر انگلی رکھ دے، وہ کہہ دے بغیر حساب کتاب کے یہ تمہاری ہو گئی، نہ ہر شخص چھوٹے میاں ہے کہ شرفو میاں جو کہہ دیں وہ سر جھکا کر آمنا و صدقنا کہہ دے، میں ابھی سے دیکھ رہا ہوں، دونوں لڑکوں کی طبیعت اور مزاج میں اختلاف ہے، کبھی کبھی کھٹ پٹ بھی ہو جاتی ہے، پس عقل کا تقاضہ یہی ہے کہ اپنی زندگی میں سارا معاملہ طے کر دوں، !"

"ہاں تجویز تو ٹھیک ہے، ـــــــ لیکن ـــــــ"

"لیکن کیا؟"

"قمر کو جو دینے کو کہہ رہے ہو، اس سے کوئی نیا فتنہ نہ اٹھ کھڑا ہو، مجھے ڈر لگتا ہے، ؟"

"ڈر کیوں لگتا ہے ؟"

"سوچتی ہوں، کہیں ہنگامہ آرائی اور، ـــــــ"

"نہیں لبنیٰ یہ تمھارا وہم ہے، میری زندگی میں کوئی ہنگامہ آرائی کی جرأت نہیں کر سکتا ـــــــ"

"وہ تو ٹھیک ہے، لیکن انوار و اظہار کی سسرال والے جب یہ خبر سنیں گے تو ضرور لڑکوں کو بھڑکائیں گے، اور یہ تم جانتے ہی ہو کہ گو ابھی شادی نہیں ہوئی ہے لیکن، یہ دونوں، اپنی سسرال والوں سے کافی متاثر ہیں اور وہاں آتے جاتے بھی رہتے ہیں، !

"ہاں جانتا ہوں، ـــــــ اور میرے خیال میں وہاں آنا جانا معیوب نہیں ہے، رہا تمھارا یہ خیال کہ کہیں سسرال والے لڑکوں کو بھڑکانا نہ شروع کر دیں، ـــــــ"

"ہاں میں بھی ڈرتی ہوں"!

"اگر ایسا کریں گے، تو پشیمان ہوں گے، جائداد میری ہے میرے باپ کی ہے، میں جیا ہوں، کھڑے کھڑے اسے بیچ دوں کون روک سکتا ہے مجھے؟ وہ لوگ اپنی لڑکیوں کی شادی انوار اور اظہار سے

کر رہے ہیں، یا میری جائداد سے؟ ——— بہرحال میں نے جو فیصلہ کیا ہے وہ اٹل ہے، اس میں اب تبدیلی نہیں ہو سکتی، زیادہ سے زیادہ پندرہ دن میں یہ فیصلہ عملی اور قانونی جامہ پہن لے گا،!

---

(۱۷)

شرفو میاں میں ایک بات بڑی عمدہ تھی، جو کہہ دیا وہ کر گزرے، دوسرے ہی دن وکیل کو بلا کر اپنا یہ عندیہ بتایا، تیسرے دن وکیل نے مسودہ بنا کر دے دیا، چوتھے دن انھوں نے منظوری دے دی پانچویں دن رجسٹری ہو گئی، ایک گاؤں اپنے اور نعیمہ کے پاس رہنے دیا، باقی ساری جائداد منقولہ وغیر منقولہ کے دو حصے کئے، ایک حصہ انوار اور اظہار کو دے دیا، دوسرا قمر کو، جس قلعہ نما مکان میں رہتے تھے یہ بھی قمر کے نام لکھا دیا، ایک لاکھ روپیہ نقد تھا، پچاس ہزار دونوں بیٹوں کو دے، پچاس ہزار قمر کے نام جمع کر کے بینک کی پاس بک

اور چیک بک لاکر اس کے سامنے ڈال دی، منشی ابو محمد کو جو بڑے پرانے اور معتمد اور معمر کارکن تھے، قمر کی جائداد کا منتظم بنا دیا، انوار و اظہار سے کہا، جی چاہے خود اپنا کام سنبھالو، جی چاہے کسی اور کو نوکر رکھ لو، منشی ابو محمد صرف قمر کا کام کریں گے،

بظاہر یہ بہت معمولی بات تھی، لیکن عملاً ایک بہت بڑے طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہوئی، انوار اور اظہار کسی طرح بھی اسے برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ معاملہ الٹ جائے، یعنی جو کچھ انھیں ملنے والا تھا وہ قمر کو مل جائے اور جو قمر کا حصہ تھا وہ ان کے حصے میں آئے، نتیجہ یہ ہوا کہ یہ سعادت مند اور اطاعت گزار بیٹے باپ سے لڑنے کو تیار ہو گئے، شرفو میاں لغیمہ کے پاس بیٹھے حقہ گڑگڑا رہے تھے کہ انوار و اظہار آئے، اور بیٹھ گئے، شرفو میاں ایک جہاندیدہ اور تجربہ کار آدمی، لڑکوں کی صورت دیکھتے سمجھ گئے، یہ لوگ کیوں آئے ہیں، حقہ کا ایک کش لگا کر پوچھا،

"فرمایئے! آپ حضرات کی تشریف آوری کا مقصد کیا ہے؟ میرے لائق کوئی خدمت؟"

شرفو میاں سب سے حتیٰ کہ اولاد تک سے اسی طرح تکلفانہ انداز میں گفتگو کرنے کے عادی تھے، انوار نے اظہار کی طرف، اور اظہار نے انوار کی طرف دیکھا، گویا دونوں ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے کہ گفتگو کا آغاز تم کرو، آخر انوار نے لب کشائی کی، اور کہا،

"ہم آپ سے کچھ عرض کرنے آئے ہیں، ——"

شرفو میاں نے جواب دیا۔
"تو بیٹے کہتے کیوں نہیں؟"
قبل اس کے کہ انوار کچھ کہے، اظہار نے کہا،
"ہمیں آپ سے سخت شکایت ہے۔ ——"
شرفو میاں نے آسمان کی طرف دیکھا اور ٹھنڈی سانس بھر کر نعیمہ سے کہا۔
"سنتی ہو صاحبزادوں کی باتیں! باپ سے سخت شکایت ہے!"
پھر انوار اور اظہار کی طرف متوجہ ہوئے اور بولے،
"فرمایئے جناب! کیا شکایت ہے آپ حضرات کو اس خاکسار سے؟"
اظہار نے کہا۔
"آپ نے جائداد کی تقسیم جس طرح کی ہے، وہ ہمیں نامنظور ہے!"
انوار نے بھائی کی تائید کرتے ہوئے کہا،
"آپ کو ایسا نہ کرنا چاہیئے تھا، آپ نے ہمارا حق آپا (قمر) کو دے دیا اور آپا کا حق ہمارے حوالے کر دیا ——"
شرفو میاں نے بے پروائی سے حقہ کا ایک کش لگاتے ہوئے کہا۔
"تم لوگوں نے حق حق کی کیا رٹ لگا رکھی ہے، جب تک میں زندہ ہوں، اپنی ہر چیز کا مالک ہوں، جسے چاہوں دوں، لٹا بھی دوں

اپنی جائداد کو تو کوئی میرا ہاتھ پکڑنے والا نہیں، حق تو میرے مرنے کے بعد قائم ہو سکتا تھا، میری زندگی میں نہیں ———"

یہ دلیل نہ اظہار کو مطمئن کر سکی نہ انوار کو، دونوں نے تقریباً متفق اللفظ ہو کر کہا،

"تو پھر آپ تقسیم نہ کرتے، جب وقت آتا، ہم میں سے ہر ایک کو اس کا حق مل جاتا!"

شرفو میاں نے ایک قہقہہ لگایا اور بولے،

"گویا تمہارا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ کرنا تھا میں نے اپنی زندگی میں کیوں کیا، مرجاتا تو تم اپنا حق پا لیتے، ——— مجھے تم سے ہمدردی ہے لیکن بیٹو ایک بات غور سے سن لو، آدمی کا حق اپنی چیز پر ہوتا ہے دوسرے کی چیز پر نہیں، میری جائداد پر حق کا دعویٰ کرنے والے تم کون؟ جو کچھ میں نے دے دیا شریف ہو تو ممنون ہو کر لے لو، نہیں لینا چاہتے واپس کر دو، اللہ اللہ خیر سلا، ماشا اللہ جوان ہو، کماؤ، جائداد بناؤ، دولت پیدا کرو، وہ تمہاری چیز ہو گی، اس پر تمہارا حق ہو گا، اس میں سے ایک پائی بھی اگر میں مانگوں تو دھتکار دینا۔"

انور باپ کی ان باتوں سے جھنجھلا گیا، اس نے کہا،

"اس طرح تو آپ نے مقدمہ بازی کی طرح ڈال دی ہے۔"

شرفو میاں نے گھور کر دونوں بیٹوں کو دیکھا اور کہا،

"مقدمہ بازی؟ ——— مجھ پر مقدمہ چلاؤ گے؟ کچھ دماغ

چل گیا ہے؟ کس عدالت میں میرے خلاف کامیاب ہو سکتے ہو؟"

اظہار نے بھائی کی پشت پناہی کرتے ہوئے کہا۔

" آپ پر مقدمہ چلانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، لیکن بہر حال ایک وقت آئے گا، جب یہ معاملہ عدالت میں جائے گا، اور وہاں سے یقیناً دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو کر رہے گا۔"

شرفو میاں نے زہر خند کرتے ہوئے فرمایا۔"

"دنیا بہر حال اس پر لوٹتی ہے کہ کب باپ مرے گا اور کب یار لوگ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے، اچھا بھئی دعا کرو کہ تمہارا باپ اس دنیا سے جلد رخصت ہو تاکہ من مانی کر سکو، اگرچہ کامیابی کا امکان پھر بھی نہیں۔"

انوار نے باپ سے کہا۔

" بہر حال دیکھا جائے گا، یہ بات معلوم ہو گئی کہ آپ اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔"

شرفو میاں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا،

" ہاں بیٹے بس کام کی اتنی دیر میں بس یہی ایک بات تم نے کہی ہے"

نعیمہ بیگم اب تک خاموش بیٹھی باپ بیٹوں کی باتیں سن رہی تھیں، اب خاموش نہ رہ سکیں، انھوں نے کہا۔

" میں کہتی ہوں، لڑکو، تمھیں کیا ہو گیا ہے"

انوار نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

"آپ کا جہاں تک تعلق ہے ہمیں آپ سے پہلے بھی کوئی امید نہ تھی، اباجان نے جو کچھ کیا ہے وہ بے شک خلاف توقع ہے، اسی لئے اس کا صدمہ ہے۔"

شرفو میاں بول پڑے،

"تو بیٹے ننگے سر بیٹھا ہوں، جوتے مارو اور لگا دو دس پانچ، آخر کسی طرح تمہارا کلیجہ تو ٹھنڈا ہونا چاہیے، باقی ذرا ضدی آدمی ہوں، جو کچھ کرنا تھا کر چکا، اس میں ترمیم و تغیر کا اب کوئی سوال پیدا نہیں ہو سکتا۔"

نعیمہ بیگم نے شوہر کو مزید گفتگو کا موقع نہ دیتے ہوئے کہا۔

"لڑکو عقل سے کام لو، مال و دولت کی ہوس میں اندھے نہ بنو، بیشک بظاہر تمہارے باپ نے تم پر زیادتی کی ہے یعنی قمر کو زیادہ دیا ہے تمہیں کم دیا ہے، لیکن میرے بچو یہ بھی سوچو کہ قمر کو جو کچھ ملا ہے وہ ہے کس کا؟ ——————"

انوار نے جواب دیا،

"قمر کا اور کس کا؟"

نعیمہ بیگم نے پوچھا،

"وہ کس کے کام آئے گا!"

"آپ کی صاحبزادی کے!"

نعیمہ بیگم نے بیٹوں پر حقارت کی ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"کیوں نادانی کی باتیں کرتے ہو، قمر بیوہ ہو چکی ہے، اب زندگی بھر

سہاگن نہیں بن سکتی، نہ اس کے کوئی اولاد ہے، نہ ہوگی، یہ بھی جانتے ہو کہ بیری مرضی۔ تمہے خلاف خود اپنی مرضی سے اس نے ہر لذت اپنے اوپر حرام کر دی ہے، سادہ کھانا کھاتی ہے، کئی کئی دن گزر جاتے ہیں گوشت کی ایک بوٹی بھی اس کے منہ میں نہیں جاتی، موٹے جھوٹے کپڑے پہنتی ہے، اپنا سارا وقت یا کتابوں کے مطالعہ میں صرف کرتی ہے، یا قرآن کی تلاوت میں، یا نماز اور عبادت میں، اس کا جملہ ماہانہ خرچ زیادہ سے زیادہ پچاس روپے مہینہ کا ہے، آمدنی ہزاروں کی ہے، بتاؤ یہ آمدنی کس کے کام آئے گی؟ کیا وہ تم سے محبت نہیں کرتی؟ کیا وہ تم پر جان نہیں چھڑکتی، کیا وہ تمہاری شادی کے دن نہیں گن رہی ہے، شرفو میاں نے اسے جو نقد روپیہ دیا ہے، کیا اس میں اسے ہزاروں روپے کے قیمتی زیورات اور ریشمی پارچہ جات وہ اپنی آنے والی بھاوجوں کے لئے خرید کر نہیں لائی ہے؟ اتنے تنگ دل نہ بنو، اپنے باپ سے گستاخی نہ کرو، عقل سے کام لو، حقیقتاً تم کو کچھ نہیں ملا ہے، سب کچھ تمہیں دونوں کو ملا ہے، وہ یہ جائداد، یہ مکان، یہ زرنقد، یہ املاک، یہ سازوسامان اپنے ساتھ قبر میں نہیں لے جائے گی، سب کچھ تمہارے ہی لئے ہے، اور تمہارے ہی لئے چھوڑ جائے گی، کم از کم اسے اتنا حق تو دو کہ اس کا ہاتھ اونچا رہے، اس کی گردن اونچی رہے، وہ احساس کمتری میں مبتلا نہ ہونے پائے، چھوٹا بھائی بہن کی نظر میں اولاد کی طرح ہوتا ہے، وہ تم دونوں کو ہمیشہ سے اسی طرح چاہتی آئی ہے، اور زندگی کے آخری سانس تک اسی طرح چاہتی رہے گی

تم اپنے دل میں اس کے لیئے، قمر کے لیئے، اپنی غدار بہن کے لیئے کپٹ رکھتے ہو؛ اس سے جلتے ہو؛ حسد کرتے ہو؟ کیا یہ تمھیں زیبا ہے؟ تمھاری شرافت کا اور انسانیت کا تقاضا یہ تھا کہ تم باپ کے اس فیصلہ پر خوش ہوتے؛ اسے مبارک باد دیتے، کہتے، ہمیں کچھ نہیں چاہیئے، سب کچھ آپا کو دے دیجیئے، وہی اس گھر کی مالکہ ہے، اس کے بجائے باپ سے لڑنے آئے ہو؛ یہ نہ سوچا کہ ایک دن خدا کو منہ دکھانا ہے، اسے کیا جواب دو گے؛ تم نے تو خیر سے عربی بھی پڑھی ہے، کیا میں تمھیں بتاؤں کہ ماں باپ کے اکرام و احترام، ادب و اطاعت کے لئے خدا نے کیا حکم دیا ہے؟"

نعیمہ بیگم تقریر کر کے خاموش ہوئیں تو انوار نے نہایت بے پروائی کے ساتھ کہا،

"یہ جذباتی باتیں ہیں!"

اظہار نے بھائی کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا،

"یہ صرف ایک سنہرا خواب ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں ہمارے حق سے محروم کر دیا ہے، ہمارے ساتھ زیادتی کی گئی، ہم سے ناانصافی ہوئی ہے، اور دنیا کا کوئی قانون، ظلم زیادتی اور ناانصافی کو جائز نہیں قرار دے سکتا، جس خدا کا آپ نے نام لیا ہے، وہ بھی عدل کا حکم دیتا ہے، ظلم سے منع کرتا ہے۔"

شرفو میاں نے نعیمہ سے کہا،

تم نے بڑی اچھی تقریر کی تھی، یہ تقریر وعظ کی صورت میں اگر کسی مجمع کے سامنے ہوتی، تو بڑی داد ملتی، میرا حافظہ کمزور نہ ہوتا تو اسے چھپوا کر مفت تقسیم کرتا، لیکن بی بی کسی کا قول ہے، کہ —— ہر سخن وقتے و ہر نکتہ مقامے دارد —— غلطی یہ ہوئی کہ تم بھینس کے آگے بین بجانے بیٹھ گئیں، پھر بھی خدا کا شکر کرو کہ اس کے سینگ سے محفوظ رہیں۔"

اس کے بعد شرفو میاں نے انوار و اظہار سے کہا۔

"بیٹے کیوں اپنا وقت ضائع کرتے ہو؟ یا تو جا کر کسی وکیل سے مشورہ کرو، یا اطمینان سے اپنا کاروبار سنبھالو، مجھے تمھاری ماں سے کچھ ضروری باتیں کرنا تھیں، خواہ مخواہ ٹپک پڑے اور وہ باتیں رہ گئیں۔"

انوار اٹھ کھڑا ہوا، اس نے کہا،

"بہت اچھا ہم جاتے ہیں —— آؤ اظہار واقعی یہاں بیٹھنا وقت کا ضائع کرنا ہے۔"

انوار و اظہار غصہ اور برہمی کے عالم میں واپس چلے گئے، ان کے جاتے کے بعد شرفو میاں نے نعیمہ سے کہا۔

"اچھا بھئی ہم بھی چلے'!"

نعیمہ نے سوال کیا،

"یہ کون سا وقت ہے جانے کا؟ —— ٹھیک دوپہر کو کہاں جاؤ گے؟"

شرفو میاں نے اٹھتے ہوئے بتایا،

"شکار کے لیے اس سے بہتر اور موزوں وقت کون ہوگا، ؟"

نعیمہ کے ہونٹوں پر تبسم نمودار ہوا، وہ بولی،

تمہاری باتیں آج بھی وہی ہیں جو آج سے تیس سال پہلے تھیں، ذرا جو فرق آیا ہو!"

شرفو میاں نے فخر و ناز سے اپنی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اور آئندہ تیس سال تک بھی ان میں کوئی فرق نہ آئے گا،!"

نعیمہ نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا،

"خدا تمہیں سو برس کی عمر دے، ——————"

یہ کہتے کہتے وہ کچھ جذباتی سی ہوگئی، شرفو میاں نے اس کی کیفیت محسوس کرلی" اور" اس کا موڈ بدلنے کے لیے مزاحیہ پیرایہ میں گویا ہوئے،

"نعیمہ میری فکر نہ کرو، ابھی میں بہت زندہ رہوں گا، شکاریوں کی عمر خاصی طویل ہوتی ہے، البتہ تم سے ڈر لگتا ہے،——"

نعیمہ نے پوچھا،

مجھ سے ڈر لگتا ہے؟ —— یہ کیوں؟"

شرفو میاں گویا ہوئے،

اگر کہیں تم وقت سے پہلے ڈھلک گئیں، تو مجھے بھی بادل نخواستہ اس دنیا سے رخت سفر باندھنا پڑے گا،!"

نعیمہ کی جذباتیت اب تک قائم تھی،

"خدا کے لیئے اپنا ذکر لے کر نہ بیٹھ جایا کرو، عورت کی سب سے بڑی خوش قسمتی یہ ہے کہ شوہر کی زندگی میں دنیا سے رخصت ہو، !"

شرفو میاں نے بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا،

"ہو سکتا ہے، عورتوں کا یہی خیال ہو، لیکن میری رائے تو یہ ہے کہ دونوں کو ساتھ ساتھ رخصت ہونا چاہیے، کم از کم میرا پروگرام تو یہی ہے، !"

نعیمہ بات کو طول دینا نہیں چاہتی تھی، اٹھ کھڑی ہوئی، شرفو میاں نے اعتراض کیا،

"یہ کیا؟ ——— ہم بیٹھے ہیں، اور تم جا رہی ہو !"

وہ بولی،

"کھانا تیار ہو گیا ہوگا، کھا لو، آج قمر نے شامی کباب تلے ہیں تمہارے بیچے !"

شرفو میاں اچھل پڑے،

واہ بھئی واہ، شامی کباب، اور پھر قمر کے ہاتھ کے، ——— فوراً لاؤ،

نعیمہ جانے کے لیئے اٹھی ہی تھی کہ دلاری خوان میں کھانا لے کر آگئی،

شرفو میاں نے جلدی سے سرپوش اٹھایا، اور ایک کباب ہاتھ

لے کر، دوسرا منہ میں ڈال کر فرمایا۔

"ہماری بیٹیا نے بھیجے ہیں ——— بھئی خوب ہیں، لیکن وہ کنجوس کب سے ہوگئیں"؟ صرف چار؟ یہ تو نعیمہ کے لئے بھی کافی نہیں ہوں گے"؟

نعیمہ نے کہا،

تم کھاؤ، میری فکر نہ کرو، میں بعد میں کھا لوں گی"!"

دلاری نے بتایا،

بٹیا نے کہا ہے، کڑھائی سے گرم گرم کباب اترتے جائیں گے، اور پہنچتے رہیں گے، شروع کر دیجیے"!"

شرفو میاں نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا،

یوں کہو، ——— دیکھا نعیمہ ہماری قمر، کتنی دور اندیش ہے ——— لو کھاؤ بھئی،

یہ کہہ کر ایک گرما گرم کباب نعیمہ کی ہتھیلی پر رکھ دیا، وہ بولیں، "اللہ، اتنی بے تابی جیسے خدانخواستہ کئی دن کے فاقے سے ہیں"!"

اتنے میں دلاری ایک پلیٹ میں رکھ کر پھر کئی کباب لے کر آگئی، شرفو میاں نعیمہ کو چھوڑ کر اس طرف متوجہ ہو گئے"!

اس طرح جیسے زندگی میں آج پہلی مرتبہ کھانے بیٹھے ہوں،

نعیمہ نے جل کر کہا۔
"توبہ ہے، ——— اتنی جلدی کاہے کی ہے؟"
شرفو میاں نے لقمہ منہ میں رکھتے ہوئے کہا، "کہاں سے لاؤں صبر حضرت ایوب اے ساقی ———"
نعیمہ ہنسنے لگی۔

نالائق

(۱)

احمد نگر سے تین۳ میل کے فاصلہ پر ایک قصبہ محمد پور تھا، یہاں کے شرفا میں شیخ محمود حسین نمایاں نمایاں حیثیت کے مالک تھے، خاندانی جائداد بھی کافی تھی، اور، روپیہ کی تجارت بھی کرتے تھے، یعنی سودی کاروبار، اس فن میں شیخ صاحب نے اتنی مہارت حاصل کرلی کہ قصبہ کے وہ مہاجن جو پشت ہا پشت سے سودی کاروبار کرتے چلے آرہے تھے، شیخ صاحب کا نام سنکر ادب سے سر جھکانے پر مجبور ہو جاتے تھے، زمین، جائداد، باغ، مکان، زیور، ہر چیز پر نہایت دریا دلی سے روپیہ دیتے تھے، اور یہی دریا دلی بیچارے مقروض کے لیئے بلائے جان بن جاتی تھی، وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیئے اپنی چیز سے محروم ہو جاتا

تھا، جہاں تک اخلاق کا تعلق تھا، شیخ صاحب سراپا اخلاق و تواضع تھے لیکن جہاں تک کاروبار کا تعلق تھا ان کی آنکھ میں سور کا بال تھا، رحم، رعایت، مروت یہ الفاظ انھوں نے اپنے کاروباری لغت سے خارج کر دیے تھے، ان کی سرمایہ داری اور دولت مندی کی ساکھ سارے قصبہ پر ایسی بیٹھی ہوئی تھی کہ بڑے بڑے خاندانی امراء و روساء بھی جھک کر ملتے تھے، کیونکہ آڑے وقت میں اگر کوئی کام آسکتا تھا تو یہ شیخ صاحب تھے، دو بجے رات کو بھی ضرورت ہو تو اشرفیاں گن دینے میں تامل نہیں کرتے تھے، رئیسوں اور نواب زادوں کی وہ نئی پود، جو اب ابھر رہی تھی، اپنی عیاشیوں کے لیئے روپیہ کی محتاج تھی، ان میں سے جو یتیم نہیں ہوئے تھے، وہ تمسک لکھ کر، اور والد محترم کے انتقال کے بعد ادائی کا وعدہ کر کے جتنا روپیہ چاہتے تھے شیخ صاحب سے لیتے رہتے تھے، جو خدا کے فضل سے یتیم ہو چکے تھے، انھیں بڑے بڑے مصارف کے لیئے بھی شیخ صاحب کی دستگیری کی ضرورت تھی، ان زر پاشیوں سے شیخ صاحب کے بینک بیلنس میں بھی اضافہ ہو رہا تھا، اور جائداد بھی دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہی تھی، ہر سال کچھ لوگ امیر سے غریب ہو تے تھے، جائداد کے ایک حصہ سے دستبردار ہونے پر مجبور ہو جاتے تھے، اور شیخ صاحب اپنے دیئے ہوئے سودی قرض کے باعث ان تباہ حال رئیسوں اور زمینداروں کی املاک و جائداد کے مالک بن جایا کرتے تھے، اس اعتبار سے بھی شیخ صاحب خوش قسمت تھے کہ صرف ایک ہی لڑکا خدا نے دیا تھا، تقسیم سے انہیں اتنی چڑ تھی کہ اولاد تک میں وہ اپنے

زر نقد اور املاک کو تقسیم کرنا پسند نہیں کرتے تھے، اپنے باپ کے وہ تنہا جانشین تھے، اپنا بھی ایک ہی جانشین چاہتے تھے، خدا نے جہاں اور بہت سی آرزوئیں پوری کیں، یہ آرزو بھی پوری کر دی،

شیخ صاحب کی خواہش تھی کہ راشد ان کا ہاتھ بٹائے، چنانچہ جب اس نے انٹرنس پاس کر لیا تو انھوں نے کوشش کی کہ پڑھنا لکھنا چھوڑ کر کاروبار کی ٹریننگ لینا شروع کر دے، لیکن ارشد نے نہایت ادب سے یہ تجویز مسترد کر دی، کہ جب تک بی اے نہ کر لے، کسی طرف توجہ نہیں کر سکتا، ارشد کی اس خودسری کے آگے بادل نخواستہ شیخ صاحب کو سر جھکانا پڑا،

اور یہ ارشد تھا بھی کچھ عجیب و غریب قسم کا آدمی، اعتقاد جیسے عادات و خصائل، رنگ مزاج، گفتار و کردار، ہر اعتبار سے منفرد، بلکہ باپ کی ضد، شیخ صاحب کنجوس تھے، وہ دریا دل تھا، شیخ صاحب رحم اور مروت کے مفہوم سے نا آشنا تھے، ارشد کا دل رحم و مروت کا گنجینہ تھا، شیخ صاحب عزیزوں اور رشتہ داروں سے سلوک کرنا یا ان کی مدد کرنا گناہ کبیرہ سمجھتے تھے، لیکن راشد اپنے جیب خرچ کی مختصر سی رقم اسی کار خیر میں صرف کر دیتا تھا، شیخ صاحب کو قوم، ملت، ملک، مذہب، کسی چیز سے سروکار نہیں تھا، ارشد قوم کا فدائی، ملت کا جانثار، ملک کا چاکر، اور مذہب کا پرستار تھا، شیخ صاحب فقیروں کو دیکھتے تھے، تو خود بخود ان کی تیوری چڑھ جاتی تھی، ارشد کا دست جنون خود بخود جیب تک پہنچ جاتا تھا،

شیخ صاحب نے ارشد کو بی اے کرنے کی جو اجازت دے دی

تھی اس میں ایک مصلحت یہ بھی تھی کہ شاید، گھر کی مختصر سی دنیا سے نکل کر شہر کی وسیع، اور بورڈنگ کی رنگا رنگ زندگی میں داخل ہو کر، آنکھیں کھل جائیں، دنیا اور دنیا والوں کی صحیح تصویر آنکھوں کے سامنے آجائے،

اور اب ارشد بی اے کر کے گھر واپس آگیا تھا،

ارشد کی کامیاب واپسی نے شیخ صاحب کا دل خوشی سے معمور کر دیا تھا، وہ محسوس کر رہے تھے، شام زندگی شروع ہو چکی ہے، زندگی کا سورج ڈوبنے سے پہلے تمام داؤں بیٹے کو سکھا دینا چاہتے تھے، تاکہ اتنی محنت شفقت سے جمع کی ہوئی دولت رائیگاں نہ جائے، اس میں اضافہ ہوتا رہے اور پرکھوں کا نام روشن ہوتا رہے،

ارشد واپس آگیا تھا، ماں اسے دیکھ دیکھ کر صدقے قربان ہوتی تھی باپ کا خون بھی اسے دیکھ کر بلیوں بڑھ جاتا تھا، لیکن ——

لیکن جب اس کی نالائقیوں کا خیال آتا تھا، اس کی خود سری، خود رائی ضد اور ہٹ کے جلوے نظر کے سامنے آتے تھے، تو خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتے تھے، بعض وقت تو شبہہ ہونے لگتا تھا یہ میرا لڑکا بھی ہے یا نہیں؟ کمبخت نے ایک بات بھی باپ کی نہیں لی ہے، نہ صورت نہ سیرت، نہ طبیعت نہ مزاج، کہیں اتنی محنت سے بنائی ہوئی یہ عمارت اس کے ہاتھوں ڈھے نہ جائے، !

(۲)

رات کے کھانے کے بعد، شیخ صاحب، چارپائی پر لیٹ کر حقہ گڑگڑایا کرتے تھے، ان کی بیوی زبیدہ بانو پاس ہی دوسری چارپائی پر بیٹھ کر چھالیہ کترا کرتی تھیں، کبھی شیخ صاحب کوئی بات کہہ دیتے، کبھی زبیدہ بانو کسی بات کا تذکرہ کر دیتیں پھر وہ حقہ گڑگڑانے لگتے اور زبیدہ چھالیہ کترنے لگتی، یہاں تک کہ رات کے گیارہ بج جاتے، زبیدہ پہلے حقہ کی نے شیخ صاحب کے منہ سے بڑی احتیاط کے ساتھ نکالتی کہ کہیں جاگ نہ جائیں، پھر ایک کونے میں چلم الٹ کر حقہ بھی وہیں رکھ دیتی، اور بستر پہ آکر، کچھ دعائیں پڑھ کر دم کرتی اور سو جاتی،

آج بھی اس نے ایسا ہی کیا، لیکن جیسے ہی نے نکالی، شیخ صاحب کھڑبڑا کر اٹھ بیٹھے، وہ گھبرا گئی،

"کیا اب تک جاگ رہے ہو؟"

شیخ صاحب نے حقہ کا ایک کش لگایا،

"جی ہاں اب تک جاگ رہا ہوں، اور شاید رات بھر نہیں سو سکوں گا، !"

یہ سنکر زبیدہ سہم گئی۔

"خدا نہ کرے طبیعت تو ٹھیک ہے!"

شیخ صاحب نے جھنجلائے ہوئے لہجہ میں کہا۔

"کیا صاحبزادہ بلند اقبال و سعادت مند کی تشریف آوری کے بعد بھی طبیعت ٹھیک رہ سکتی ہے، مجھے بھی حیرت اور تمہیں بھی تعجب ہونا چاہیئے کہ زندہ کیسے ہوں، ؟

زبیدہ کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے،

"خدا کے لیئے بتاؤ تو سہی کیا کیا میرے لڑکے نے ؟، وہ تو بڑا نیک، بھولا اور سادہ مزاج لڑکا ہے، !"

شیخ صاحب نے طنز کرتے ہوئے فرمایا،

"ہاں واقعی وہ بڑا نیک، بھولا، اور سادہ مزاج لڑکا ہے، بس صرف یہ ہے کہ ذرا خود سر ہے، ضدی ہے، ڈھیٹ ہے، سرکش ہے، سو یہ کوئی ایسی خرابی نہیں ———— میرا کیا ہے

خود ہی آٹھ آٹھ آنسو روؤ گی، !"

زبیدہ کو رونا آگیا،

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم ؟ ——— کیا کیا ہے ارشد نے ؟"

شیخ صاحب : کچھ نہیں، باپ کے منہ میں کالک لگا دی تھوڑی سی،

زبیدہ : میں نہیں مان سکتی، وہ ایسا نہیں ہے، !

شیخ صاحب : تو میں نے خود مل لی ہوگی،

زبیدہ : (اپنے بستر پہ لیٹتے ہوئے) تمھیں تو نہ جانے کیوں دشمنی ہوتی جارہی ہے اس سے، خدا نے ایک تو لڑکا دیا ہے، اسی سے یہ ضد، یہ بحث، یہ دشمنی، ———

شیخ صاحب : (زبیدہ کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے) خان بہادر رضی الدین کا نام سنا ہے کبھی ؟ "

زبیدہ : کیوں نہیں سنا ہے، انہی کی لڑکی سے تو اللہ رکھے اسلم کا بیاہ ہوگا، ؟

شیخ صاحب : ہوچکا، ——— منہ دھو رکھو، !

زبیدہ : (پریشان ہوکر) کیا ان سے بھی الجھ پڑے تم ؟

شیخ صاحب : جی نہیں، میں خان بہادروں سے نہیں الجھا کرتا، یہ سعادت تو آپ کے فرزند دل بند کی قسمت میں لکھی تھی،

زبیدہ : تمہارا مطلب ہے کہ ———

شیخ صاحب : ہاں، ——— ارشد نے ان کی توہین کی، انہیں ذلیل

گیا،

زبیدہ : اے ہٹو بھی، خدا سے ڈرو،

شیخ صاحب : کیا تم مجھے جھوٹا سمجھتی ہو ؟ میں جھوٹ بولوں گا ؟

زبیدہ : بڑے سچے،

شیخ صاحب : اچھا میں جھوٹا سہی، لیکن ایک شوہر کی حیثیت سے نہیں دوست کی حیثیت سے مشورہ دیتا ہوں کہ صاحبزادے کی خبر لیجیے، انھیں راہ راست پر لائیے، ورنہ پھر میں بھی بُرا بیڑھا آدمی ہوں، ٹکڑے ٹکڑے نکال دوں گا حرامزادے کو! ساری جائداد وقف کر جاؤں گا، اور ایک حبہ بھی اس ناخلف کو نہیں دوں گا، !

زبیدہ : لیکن یہ بھی تو معلوم ہو کہ بات کیا ہے ؟

شیخ صاحب : بات کیا ہوتی، یہ ناخلف میرے پاس بیٹھا تھا، میں اسے کچھ کاروباری نکتے سمجھا رہا تھا، اتنے میں قسمت کے مارے خان بہادر صاحب تشریف لے آئے، میں نے ان سے کلو میاں کی سفارش کی، ———

زبیدہ : کلو میاں کون ؟

شیخ صاحب : میں میرے ایک دوست، چونکہ دوستوں سے لین دین کرنے کا میں قائل نہیں، لہٰذا ان کا باغ میں نے رہن نہیں رکھا، خان بہادر کے پاس کرا دیا، انھوں نے دس روپے سینکڑہ پر دو ہزار میں رہن رکھ لیا، کلو میاں نہ سود دے پائے، نہ اصل، اور ڈیڑھ

برس کی مدت گزر گئی، کل وہ میرے پاس آئے تھے کہ لڑکی جوان ہوگئی ہے اس کی شادی کرنا ہے، ایک جگہ بات چیت بھی پکی ہو گئی ہے، وہ چاہتے تھے خان بہادر صاحب دو ہزار اور دے دیں اور باغ لے لیں، میں نے سفارش کا وعدہ کر لیا، چنانچہ اتفاق کی بات خان بہادر صاحب خود ہی تشریف لے آئے، میں نے ان سے کلو میاں کی سفارش کی، انھوں نے فرمایا باغ پانچ ہزار سے زیادہ مالیت کا نہیں ہے، دو ہزار کلو میاں لے چکے ہیں تین ہزار چھ سو، سود کے بنتے ہیں، باغ کی قیمت اگر پانچ کے بجائے ساڑھے پانچ ہزار بھی لگا لی جائے تو بھی سو روپے انھیں اور دینا چاہئیں، زیادہ سے زیادہ اتنا کر سکتا ہوں کہ یہ سو روپے معاف کر دوں، ہاں اگر اپنا مکان بیع کرنا یا رہن رکھنا چاہیں تو دو ہزار دے سکتا ہوں،!

زبیدہ: واہ رے خاں بہادر صاحب، ——— اچھا پھر؟

شیخ صاحب: خاں بہادر کے منہ سے الفاظ نکلے ہی تھے کہ یہ الّو کا پٹھا بول پڑا، "دو ہزار اصل اور ساڑھے تین ہزار سود، یہ تو ظلم ہے آپ خدا کو کیا جواب دیں گے؟ ——— سنا زبیدہ بانو داماد اپنے خسر سے پوچھ رہا ہے: آپ خدا کو کیا جواب دیں گے؟ داماد خسر سے کہہ رہا ہے آپ ظالم ہیں،

زبیدہ: یہ تو برا کیا لڑکے نے؟

شیخ صاحب : ابھی سے قائل ہوگئیں، پوری کہانی تو سن لو، ——
خان بہادر صاحب بیچارے شرمندہ سے ہو گئے، لیکن مسکراتے ہوئے بولے، کیا اپنا حق لینا ظلم ہے؟ کیا اپنا حق لینے پر بھی خدا کے سامنے جواب دہی کرنی پڑے گی بیٹے؟' — بیٹے نے کہا، " کیا آپ سود کو حق سمجھتے ہیں؟ دس روپے سیکڑہ کیا معنی؟ دس پائی سود لینا بھی مہاپاپ ہے، ناقابل معافی گناہ، آپ جس حق کا ذکر کرتے ہیں، وہ حق نہیں ناحق ہے، خدا نے اور اس کے رسول ؐ نے صاف الفاظ میں سود کی حرمت کا اعلان کیا ہے؟ خان بہادر کے پاس بھی جواب تیار تھا کہنے لگے تمہارے باپ بھی تو لیتے ہیں سود، فرزند سعادت مند نے جواب دیا، خدا کی بارگاہ عدل سے مجرم نہ اس لئے بچ سکتا ہے کہ وہ کسی کا بیٹا ہے، نہ اس لئے کہ کسی کا باپ ہے، وہاں تو اعمال دیکھے جاتے ہیں، باپ بیٹے کا کیا سوال؟'

زبیدہ : (روتے ہوئے) ہائے میرے اللہ، کیا ہو گیا لڑکے کو؟
شیخ صاحب : بے شک رونا، ہم تم دونوں ساتھ مل کر روئیں گے، لیکن ابھی وقت نہیں آیا، ذرا اور انتظار کرو،
زبیدہ : خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کرو،
شیخ صاحب : کیا تمہارے سامنے بھی دل کی بھڑاس نہ نکالوں؟ چاہتی ہو کلیجہ پھٹ جائے، اور مر جاؤں؟

زبیدہ : نہیں نہیں ـــــــ اچھا کہو،

شیخ صاحب : خان بہادر نے فرمایا، لیکن اگر تم اس کاروبار کو حرام اور
ناجائز سمجھتے ہو، تو خود کیا کرو گے؟

میرے لختِ جگر نے اپنے ہونے والے خسر کو جواب دیا،
"خدا کا شکر ہے میں جائز طور پر روٹی کما سکتا ہوں، محنت کر کے
مزدوری کر کے ملازمت کر کے،!

خان بہادر صاحب نے پھر ایک سوال کیا،
"لیکن شیخ صاحب کے تنہا وارث تو تم ہی ہو، یہ مال، یہ جائداد، یہ
املاک، یہ زرِ نقد، یہ بینک بیلنس، یہ کفالتیں، یہ پرونوٹ، یہ سونے
چاندی کے مرہونہ زیورات، یہ قبالے، یہ سب کچھ کس کے ہوں گے؟
ان سب کا مالک کون بنے گا؟

ماتھے پر ہاتھ مار کر، زبیدہ پتھر کا دل کر کے سنو، تمہارے
نورِ نظر، اور میرے عصائے پیری نے جواب دیا،
"میں تو ان چیزوں میں ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا، یہ ساری چیزیں
غریبوں میں تقسیم کر دوں گا تاکہ ابا جان کی روح کو ثواب ملے، اور ان
کا بارِ گناہ کم ہو،!"

زبیدہ : یا اللہ، ـــــــ یہ میں کیا سن رہی ہوں،؟

شیخ صاحب : تمہارا شوہر گنہگار ہے، خطاکار ہے، عصیاں شعار ہے
وہ کندۂ جہنم بنے گا، ـــــــ

زبیدہ : خدا نہ کرے ——
شیخ صاحب : یہ میرے اور تمھارے بیٹے کا فتویٰ ہے،!
زبیدہ :۔ خیر اپنی باتیں تو بعد میں ہوتی رہیں گی، یہ بتاؤ خان بہادر صاحب نے پھر کیا کہا؟ —— واقعی خفا ہو گئے؟
شیخ صاحب : انھوں نے حقارت کی ایک نظر مجھ پر، اور نفرت کی ایک نظر ارشد پر ڈالی، پھر اٹھ کھڑے ہوئے، جاتے جاتے فرمایا، یہ تو آج معلوم ہوا کہ یہ گھر خانقاہ ہے، ہم جیسے گنہگاروں کے اب یہاں قدم نہیں آئیں گے،!"
زبیدہ : یہ تو بڑا غضب ہو گیا،
شیخ صاحب : قیامت کہو، —— میرے لئے تو یہ حادثہ قیامت سے کم نہیں،
زبیدہ : رہ رہ کے میری آنکھوں کے سامنے سلطانہ کی تصویر پھر رہی ہے، کتنی پیاری لڑکی ہے، کتنی باحیا، کتنی بااخلاق، کتنی نیک، اگر خان بہادر رشتے سے اکھڑ گئے تو سلطانہ بھی ہاتھ سے گئی۔"
شیخ صاحب : ہاں سلطانہ بھی گئی، اس کے ساتھ وہ قیمتی جہیز بھی گیا، جو اس کے ساتھ آتا، خان بہادر نے کہا تھا اس حرامزادے کو سلام کرائی میں پچاس ہزار کا چیک دیں گے، وہ پچاس ہزار بھی گئے، میرے سامنے جہیز کے سلسلہ میں زیورات تو زیورات نقرئی

اور طلائی برتن تک انھوں نے بنوائے تھے، وہ بھی گئے، اگر مجھے تمھارے پاکدامن ہونے پر ایمان نہ ہوتا، تو میرا قطعی فیصلہ یہ ہوتا کہ یہ میرا لڑکا نہیں ہے، ——

زبیدہ: (کانپ کر) خدا کے لیے چپ رہو، للّٰہ خاموش ہو جاؤ،

شیخ صاحب: چپ رہوں؟ خاموش ہو جاؤں؟ کیا تم بھی میرے دل کے گھاؤ دیکھنے سے انکار کرتی ہو زبیدہ؟ آہ! کاش میں خودکشی کر سکتا،

زبیدہ: لڑکا ہے، نوجوانی میں سب ہی ایسے ہوتے ہیں، اتنے مایوس کیوں ہوتے ہو؟ آ جائے گا راہ راست پر!

شیخ صاحب: آ چکا، —— وہ اب راہ راست پر نہیں آ سکتا،

زبیدہ: میرا کہنا بہت مانتا ہے میں سمجھا دوں گی اسے؟

شیخ صاحب: (کچھ مطمئن ہو کر) کیوں ایسی امید دلاتی ہو جو پوری نہیں ہو سکتی، لڑکا ہاتھ سے گیا،!

زبیدہ: مجھے موقعہ تو دو،

شیخ صاحب: لیکن خان بہادر صاحب کا کیا ہوگا؟

زبیدہ: انھیں بھی راضی کر لوں گی،

شیخ صاحب: وہ کیسے؟ —— مجھ پر کیا جادو چل گیا، سمجھتی ہو، سب ہی اسیر طلسم ہو جائیں گے،

زبیدہ: (مسکراتے ہوئے) کیوں نہیں ہوں گے،

شیخ صاحب : خان بہادر بہت خفا ہو کر گئے ہیں، ان کا منانا بہت مشکل ہے،

زبیدہ : دیکھ لینا چٹکی بجاتے ہیں نہ منا لوں تب کی بات،

شیخ صاحب : (خوش ہو کر) دیکھیں گے، تمہارے منہ میں گھی شکر، لیکن کرو گی کیا؟ کچھ ہمیں بھی تو بتاؤ،

زبیدہ : صبح پہلا کام یہ کروں گی کہ خان بہادر کے ہاں جاؤں گی،

شیخ صاحب : بہت اچھا جناب، ——— بسلامت روی و باز آئی،!

(۳)

خان بہادر رفیق الدین پیکرِ آتش بنے گھر پہنچے، اور فوراً اعلان کر دیا کہ ارشد نہایت نالائق، بیہودہ اور بدتمیز لڑکا ہے، سلطانہ ہرگز اس کی رفیقۂ حیات نہیں بنائی جا سکتی، یہ اعلان سنکر ان کی اہلیہ محترمہ قیصر بیگم بہت پریشان ہوئیں، اور الجھ پڑیں، کیونکہ ارشد سے وہ بہت مانوس تھیں، اور سلطانہ پر تو یہ اعلان بجلی بن کر گرا، بے شک اسے بہت دنوں سے ارشد سے ملنے، باتیں کرنے، اسے قریب سے دیکھنے کا موقعہ نہیں ملا تھا، لیکن ایسا بھی نہ تھا کہ وہ اس کو بالکل بھول چکی ہو، بچپن میں وہ اکثر اس گھر میں آیا کرتا تھا، اور کبھی کبھی سلطانہ سے باتیں

بھی کرتا تھا، اس کا مذاق بھی اڑاتا تھا، اسے چھیڑتا بھی تھا، یہ جب کی باتیں ہیں کہ نہ ابھی وہ پردہ میں بیٹھی تھی، نہ ارشد نے ابھی نوجوانی کی منزل میں قدم رکھا تھا، لیکن وہ کبھی کبھی کی معصوم ملاقاتیں، وہ کبھی کبھی کی بے لوث شرارتیں، وہ کبھی کبھی کا گدگدی پیدا کر دینے والا مذاق کچھ اس طرح سلطانہ کے دل پر نقش ہو گیا تھا کہ پھر کبھی نہ مٹ سکا، وہ بڑی ہوئی، پردہ میں بٹھا دی گئی، ارشد کا آنا جانا کم ہو گیا، پھر رفتہ رفتہ بند ہو گیا، کیونکہ وہ بورڈنگ میں داخل ہو گیا تھا، لیکن سلطانہ اسے نہ بھول سکی، وہ ہنستا، کھلکھلاتا، شگفتہ، شوخ، اور شریر چہرہ اکثر اس کی نظروں کے سامنے گھومتا رہتا، گھر میں کبھی اس کا ذکر ہوتا تو نہ جانے کیوں دل خوشی سے معمور ہو جاتا، اور پھر ایک دن جب زبیدہ بانو پیام لے کر آئیں، اور اس کی منگنی ارشد کے ساتھ ہو گئی، تو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے بہت بڑی دولت اس کے دامن میں ڈال دی ہے، ارشد اس کے خیال کی دنیا میں بسا ہوا تھا، کوئی تعلق نہ ہوتے ہوئے بھی وہ اکثر اسے یاد کیا کرتی تھی، اور نسبت طے ہو جانے کے بعد تو ہر وقت اسی ایک دھن میں مست رہتی، بے تکلف سہیلیاں جب کبھی جمع ہوتیں ہر پھر کے بات ارشد ہی کی چھڑ جاتی، ابھی تھوڑی دیر پہلے کی بات ہے، روبینہ کی تقریب سالگرہ میں راقعہ، یاسمین، نزہت وغیرہ جمع ہوئی تھیں، چہلیں، قہقہے، چھیڑ چھاڑ، شرارت، شور غل، ہنگامہ، عجیب دھما چوکڑی مچی ہوئی تھی، روبینہ سلطانہ کی خالہ زاد بہن تھی، دونوں میں بڑے گہرے تعلقات تھے، سلطانہ سے

روبینہ نے اصرار کیا کہ کچھ سناؤ، پہلے تو اس نے انکار کیا لیکن جب سب سہیلیاں پیچھے پڑ گئیں تو چارو ناچار سنانا پڑا، نغمہ طرازی کے بعد، یاسمین نے پوچھا،

"سچ کہنا سلطانہ، ارشد کو بھی کبھی یہ جادو بھرا گانا سنایا ہے؟"

سلطانہ نے ابھی کوئی جواب نہ دیا تھا کہ رافعہ بول پڑی۔

اور وہ جان کس چیز پر دیتے ہیں؟ اسی نغمہ طرازی نے تو بیچارے کو کہیں کا نہ رکھا،

نزہت بھلا کیوں خاموش رہتی کہنے لگی،

بس تو پھر مزے ہیں، ارشد صاحب کے ہاتھ میں طنبورہ دے دینا، اور خود غزل سرائی کیا کرنا ——— خوب گزرے گی،!

سلطانہ اب تک چپ تھی، لیکن کب تک چپ رہتی کہنے لگی،

"یہ تو ٹھیک ہے میں خوب گاتی ہوں، اور میرا گانا جس طرح سب کو پسند آتا ہے، ممکن ہے ارشد صاحب کو بھی پسند آ جائے، ———

نزہت نے سوال کیا،

"ممکن کیوں ہے ——— کیا یہ واقعہ نہیں ہے؟"

سلطانہ نے بڑی سنجیدگی سے کہا،

"نہیں ——— میرا گانا اب تک انہیں سننے کا موقعہ نہیں ملا، نہ شاید آئندہ کبھی مل سکے،!

یاسمین نے اعتراض جڑا،

"کیوں؟ کیا ان کے سامنے گانا گاتے ہوئے شرماؤ گی؛

یاسمین کے جواب میں سلطانہ بولی،

"شرمانے نہ شرمانے کا سوال ہی نہیں، اصل مصیبت یہ ہے کہ انھیں گانے سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے، سن لیا، سن لیا، نہ سنا، نہ سنا،

رافعہ نے پوچھا،

"پھر کس چیز سے دلچسپی ہے جناب ارشد صاحب کو!؟"

سلطانہ نے جواب دیا،

"رقص سے، ——— انھیں رقص بہت پسند ہے، لہذا، میرے مقابلہ میں نزہت کی کامیابی زیادہ یقینی ہے"!

رافعہ نے پھر سوال کیا،

"تمہارے مقابلہ میں؛ ——— کیا کوئی کمپیٹیشن ہو رہا ہے؛"

وہ بولی، ہاں وہ تو ہوگا، اور ضرور ہوگا، اگر معاملہ پسند ہی پر ٹھہرے گا تو میں شکست کھا جاؤں گی، اور نزہت جیت جائے گی"!!

نزہت چڑتی ہوئی بولی،

"جی معاف کیجیے، یہاں کسے ضرورت پڑی ہے ارشد صاحب کو منہ لگانے کی، باقی اگر تمھیں ایسا ہی شوق ہے تو پھر سیکھ کیوں نہیں لیتیں؛ جہاں گانا سیکھ لیا ہے وہاں ناچ بھی سہی، بلکہ یہ دونوں چیزیں اگر مل گئیں تو پھر شراب دو آتشہ بن جاؤ گی"،

بڑی دیر تک ان سہیلیوں میں اسی طرح کی چھیڑ چھاڑ ہوتی رہی، سلطانہ

خوش خوش گھر آئی، اور ابھی اپنی خیالی خوشی سے جی بھر کے لطف بھی نہیں لے سکی تھی کہ خان بہادر رضی الدین صاحب نے اس کے قلب ناتواں پر ایٹم بم پھینک مارا، باپ کا یہ اعلان سنکر اس کا خون سوکھ گیا، کتنی آرزوؤں، کتنی تمناؤں کے بعد جب ساحل مقصود قریب آیا تو کشتی بھنور میں پھنس گئی، ہچکولے کھانے لگی، جو دامن بڑی مشکل سے ہاتھ میں آیا تھا، ایک ہی جھٹکے میں چھوٹ گیا،

خان بہادر بادل کی طرح گرجتے رہے، قیصر بیگم انھیں ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتی رہیں، لیکن وہ تو ہتھے سے اکھڑے ہوئے تھے، صرف اپنی کہے جا رہے تھے، اور بیچاری سلطانہ با دیدۂ پرنم اپنی قسمت کا فیصلہ سن رہی تھی، —— چپ چاپ، خاموش،!

(۴)

زبیدہ بانو نے صبح کے ناشتہ کے بعد، ارشد کو اپنے کمرہ میں طلب کیا، وہ آیا، اور خاموشی سے ماں کے قدموں میں بیٹھ گیا، زبیدہ نے پوچھا،

"کیوں بیٹے، کیا تمھیں اپنی ماں کا دل توڑنے میں، باپ کا دل دکھانے میں لطف آتا ہے؟ کیا میں نے اسی لئے تمھیں پالا پوسہ اور پروان چڑھایا تھا، رات بھر جاگ جاگ تمہارے دکھ درد کا اس لئے خیال رکھتی تھی کہ بڑے ہو کر میری ساری امیدیں، آرزوئیں پامال کر دو، کچل دو،؟

یہ کہتے کہتے زبیدہ بانو رونے لگیں، ارشد بے تابی کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا، اس نے جیب سے رومال نکالا، ماں کے آنسو پونچھے اور کہا،

"امی میں نے ایسی کوئی بات تو نہیں کی ہے، آپ کو خوش رکھنے کے

بیٹے۔ میں بڑی سے بڑی قربانی کر سکتا ہوں، جس دن آپ کا دل توڑنے کا ارادہ کروں گا، وہ میری زندگی کا آخری دن ہوگا، ـــــــــ"

زبیدہ بانو کی ماتما آنکھوں میں سمٹ آئی انھوں نے پیار بھری نظروں سے اسے دیکھا اور کہا،

"جھوٹا کہیں کا، ـــــ"

لیکن ارشد بہت سنجیدہ تھا، اس نے ایک تاثر کے عالم میں کہا،

"مجھ میں بہت غرا بیاں اور کوتا ہیاں ہیں امی جان، ہو سکتا ہے کبھی جھوٹ بھی بول جاتا ہوں، لیکن آپ کو تو میں اپنے لئے خدا کا نمائندہ سمجھتا ہوں، آپ سے جھوٹ بولنے کا مطلب یہ ہوا کہ میں اتنا جری ہوں کہ خدا سے بھی جھوٹ بول سکتا ہوں، یہ خیال دل سے نکال دیجئے، میں آپ سے کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا، آپ کو خوش رکھنے کے لئے سب کچھ کر سکتا ہوں، ـــــــ

کچھ اعتماد اور کچھ شک کی نظر سے دیکھتی ہوئی زبیدہ بیگم بولیں،

"پھر تو نے خان بہادر صاحب کو کیوں خفا کر دیا ؟"

بے پروائی اور استغنا کے ساتھ ارشد نے جواب دیا ؛

"خان بہادر اپنے گھر کے ہوں گے، وہ اگر حرام خوری کرتے ہیں تو میں کیوں ان کی ہاں ہاں میں ملاؤں، امی جان، انھوں نے جس سفاکی اور سنگ دلی کا مظاہرہ کیا ہے، اس کے بعد تو مجھے ان سے نفرت ہو گئی ہے ذرا سوچیے تو سہی، کلو میاں بیچارے کو دو ہزار دے کر ساڑھے پانچ ہزار

لے لئے، اور پھر ستم یہ کہ ـــــــــ

زبیدہ بانو نے آگے نہ بولنے دیا،

"لیکن بیٹے، تم کیا خدائی فوجدار ہو، کلو میاں جانیں اور خاں بہادر صاحب، !"

ارشد نے کہا،

"میں بچپن سے کلو میاں کو چچا کہتا چلا آیا ہوں، وہ میرے باپ سے زیادہ نیک اور خان بہادر سے ہزار گنا زیادہ شریف آدمی ہیں، اگر وہ مفلس ہو گئے، اور زمانہ نے ان سے آنکھیں پھیر لیں، تو ابا جان بھی ان کی ہمدردی سے کترانے لگے، اور خان بہادر صاحب بھی اپنا بہی کھاتہ کھول کر بیٹھ گئے، جس شخص کو میں چچا کہتا ہوں، جس کی زندگی میرے سامنے ہے، جو نیک ہے، شریف ہے، ایماندار ہے، عبادت گزار ہے اپنی لڑکی کی شادی اپنے دو جگری دوستوں ـــــــ خان بہادر اور شیخ صاحب ـــــــ کی زندگی میں صرف اس طرح کر سکتا ہے کہ اپنا گھر بیچ دے، امی جان یقین کیجیے، اگر ایسا ہوا تو میں قطعاً ابا جان کی دولت سے کوئی سروکار نہیں رکھوں گا، مجھے وہ دولت نہیں چاہیے، جو خدا کے بندوں کے کام نہ آتی ہو، اسی طرح خان بہادر صاحب سے بھی کوئی تعلق نہیں رکھ سکتا،

زبیدہ نے یاد دلایا،

"لیکن ان کی لڑکی سلطانہ سے تیری نسبت جو ہو چکی ہے،"

اور زیادہ بے پروائی کے ساتھ ارشد نے کہا،

"ہو چکا کرے، ایسے باپ کی لڑکی بھی ایسی ہی تنگ دل ہو گی،-

زبیدہ بانو ضبط نہ کر سکیں،

کچھ خبطی ہوا ہے، سلطانہ جیسی لڑکی تو چراغ لے کر ڈھونڈھے گا مگر نہیں ملے گی، صورت میں انتخاب، سیرت میں لاجواب، اتنی نیک، اتنی باحیا اتنی شریف لڑکی میری نظر سے تو آج تک گزری نہیں،

ارشد: ہوا کرے، میں ایسے ظالم باپ کی لڑکی سے شادی نہیں کر سکتا،

زبیدہ: تو لینت الفظ، ؟

ارشد: تو کون سا غضب ہو جائے گا،

زبیدہ: دیکھ ارشد، پھر میرا ہاتھ اٹھ جائے گا،

ارشد: کتنے دن ہو گئے، ان مخمل کے سے نرم ہاتھوں کی مار نہیں کھائی ہے، جی بہت چاہتا ہے امی، (گال سامنے کرکے) لیجئے۔ لگا دیجئے، دو چار تھپڑ، میری امی نہیں ——

زبیدہ کو ہنسی آگئی،

"چل ہٹ، ڈھیٹ کہیں کا، —— لیکن دیکھ کہے دیتی ہوں، سلطانہ میری بہو بن کر اس گھر میں آئے گی، اور آکر رہے گی، !"

ارشد: نہیں امی ضد نہ کرو، میں سلطانہ سے شادی نہیں کر سکتا. جب اسے دیکھوں گا، اس کے باپ کی خونخوار، مہیب، اور سفاک صورت نظر کے سامنے آجائے گی، میں گلا گھونٹ دوں گا اس کا. مار ڈالوں گا اسے، !"

زبیدہ: (لرز کر) کیا تو میرے منہ میں کالک لگائے گا، (روتے ہوئے)

کیا تو میری جان لے گا؟ کیا میں نے اسی لیے تجھے پالا تھا، کہ میرا خون چوس لے؟ ارشد! اگر تو ضدی ہے تو میں بھی ضدی ہوں، تو سلطانہ کا گلا گھونٹ سکتا ہے، میں بھی اپنا گلا گھونٹ سکتی ہوں، میں بھی اپنی جان لے سکتی ہوں، تو یہ سب کچھ نہ جانے کب کرے، میں آج ہی زہر کھا کر سو رہوں گی، ——

یہ کہہ کر روتی، سسکیاں لیتی زبیدہ بانو واپس جانے کے لئے مڑیں۔ ارشد نے لپک کر ان کا ہاتھ پکڑ لیا، زبیدہ نے آنکھ اٹھائی، تو ارشد کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے، اس نے نہایت سنجیدہ اور فیصلہ کن لہجہ میں کہا،

"امی سلطانہ سے ہاں شادی کروں گا، !"

زبیدہ کی جان میں جان آگئی، لیکن شبہہ کی کیفیت طاری رہی، زبان سے کچھ نہ بولیں، سوالیہ نظروں سے تکنے لگیں، ارشد نے زبیدہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا، آنکھوں سے لگایا، اور پھر پھوٹ پڑا، بچوں کی طرح رونے لگا، زبیدہ نے اسے کلیجہ سے لگا لیا، خود بھی روتی جاتی تھیں اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی جاتی تھیں، ارشد ان کے کندھے پر سر رکھے اب تک رو رہا تھا، اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"مجھے معاف کردو امی، میں نے تمہارا دل دکھایا ہے، یہ اندازہ تو مجھے آج زندگی میں پہلی دفعہ ہوا، کہ میں تمھیں کتنا چاہتا ہوں، امی تمھارے آنسو دیکھ کر مجھ پر جنون کی کیفیت طاری ہوگئی، میں تمھیں مرتا کیسے دیکھ

سکتا ہوں، ـــــــ

زبیدہ نے اسے ایک مرتبہ پھر کلیجہ سے لگا لیا اور پیار بھرے لہجہ میں کہا۔

"میرے چاند، میرے بیٹے، میری جان، ـــــــ

ارشد نے بچوں کی طرح ضد کرتے ہوئے کہا،

"یہ سب بے معنی الفاظ ہیں، جب تک تم مسکراؤ گی نہیں، ہنسو گی نہیں، میرے آنسو نہیں بند ہوں گے، !"

زبیدہ بانو نے پیار سے گال پر ایک ہلکا سا چانٹا لگایا،

"ہنس تو رہی ہوں پگلے، !"

ارشد خوش ہو گیا،

"امی تم بھی کیا چیز ہو، روتی ہو جب بھی اچھی لگتی ہو، ہنستی ہو جب بھی اچھی لگتی ہو، ایک دفعہ رو دو، !"

زبیدہ نے ایک دو ہتڑ اس کی پیٹھ پر جمایا،

"اب تو جانا ہے یا نہیں ؟"

وہ ہنستا ہوا چلا گیا،

ارشد کے جانے کے بعد، زبیدہ بانو نے اطمینان سے اپنی چشم اشکبار دوپٹے کے دامن سے پونچھی، باہر نکلنے والی تھیں کہ شیخ صاحب تشریف لے آئے، انھیں یوں یک بیک آتا دیکھ کر وہ چونک پڑیں۔

"ارے ———

شیخ صاحب نے کرسی پر تشریف رکھتے ہوئے زبیدہ کو بھی ہاتھ پکڑ کر پاس کی ایک کرسی پر بٹھا لیا، اور فرمایا،

"بھئی، بڑی حرفوں کی بنی ہوئی ہو، واقعی عورت کے مکر کا جواب نہیں، کیا ایکٹنگ دکھائی ہے اس وقت طبیعت خوش ہو گئی، تم تو گودڑ کا لال ہو، کاش کسی فلم کمپنی کی رونق بڑھاتیں، تو پھر تم ہی تم ہوتیں، اخبارات میں فوٹو چھپتے، ———

زبیدہ بانو اٹھ کھڑی ہوئیں، تیوری چڑھا کر شوہر کو دیکھا اور بولیں،

"تمھیں ہو کیا گیا ہے آج؟ کچھ بھنگ پی لی ہے؟"

شیخ صاحب نے ایک قہقہہ لگایا،

"دروازے کی آڑ سے کھڑا سب کچھ دیکھ اور سن رہا تھا، خدا کی قسم کتنے بڑے موذی کو مارا ہے، میں تو اس الو کے پٹھے سے بالکل مایوس ہو گیا تھا، لیکن تمھارے ایک انجیر میں ساری چوکڑی بھول گیا،

فخر کے ساتھ زبیدہ نے گردن اٹھائی، اور گویا ہوئی،

"میرا بیٹا جو ہے،!"

شیخ صاحب نے ترنگ میں فرمایا،

جی ہاں، آپ کا بیٹا ہے، اور میرا تو شاید رقیب روسیہ ہے،

زبیدہ کو ہنسی آگئی۔

"جو منہ میں آتا ہے بک دیتے ہو، ہوش کی دوا کرو،! خوشی ہوئی!

شیخ صاحب نے فرمایا،
وہ تو اس دن ہوگی جب خان بہادر کو منا کر آؤ گی،
زبیدہ : میرا ذمہ رہا، وہ تو انشاء اللہ چٹکی بجاتے میں راضی ہوں گے؛
شیخ صاحب : کیا وہ بھی تمھارے بیٹے ہیں ؟
زبیدہ ! دیکھو پھر میں بھی کچھ کہہ دوں گی ہاں'' !
شیخ صاحب : تمھیں سب کچھ کہنے کا حق حاصل ہے، ——— تو
کب جا رہی ہو، خان بہادر کے ہاں ؛
زبیدہ : پہلا مرحلہ ارشد کا تھا وہ نہ راضی ہوتا اور میں خان بہادر کو راضی کر آتی تو اور زیادہ غضب ہو جاتا، اب تو داعیہ سے بات کروں گی، ان کی کیا مجال ہے کہ نسبت توڑ سکیں، ———
شیخ صاحب : میرے خیال میں سارا معاملہ بڑی آسانی سے طے ہو سکتا ہے اگر ارشد جا کر ان سے معافی مانگ لے،
زبیدہ : اس بھول میں نہ رہیئے گا، وہ قیامت تک معافی نہیں مانگے گا، اور اگر اس کے سامنے یہ بات رکھی گئی، تو سارا کھیل بگڑ جائے گا،
شیخ صاحب : پھر وہ کس طرح راضی ہوں گے ؟
زبیدہ : میں کروں گی، کسی طرح،
شیخ صاحب : اچھا بھئی تم جانو، ہم تو ایک بےخبر جانبدار تماشائی کی طرح یہ ناٹک دیکھ رہے ہیں، دیکھتے رہیں گے .

زبیدہ : ہاں آپ بس اتنا ہی کیجیے، ——— لیکن ایک بات آپ کو میری ماننا پڑے گی، !،

شیخ صاحب : وہ کون سی بات ہے ؟

زبیدہ : کلو میاں کا بارغ خان بہادر چاہے یے ڈکار لے، ہضم کر جائیں ———،

شیخ صاحب : کیا مطلب؟ تم بھی بولنے لگیں بیٹے کی زبان ؟

زبیدہ : اے ہاں تو کچھ جھوٹ کہتا ہے وہ ؟

شیخ صاحب : تو یہی پیام لے کر جا رہی ہو خان بہادر کے پاس، ؟

زبیدہ : ان کی بحث چھوڑو، وہ جانیں ان کا کام، تمہیں کلو میاں کو بہرحال دو ہزار روپے دینے پڑیں گے ؟

شیخ صاحب : (حواس باختہ ہو کر) یہ کس تقریب میں :

زبیدہ : ارشد کے دل پر کلو میاں کی غربت اور پریشانی کا بہت اثر ہے وہ میری محبت کے جوش میں مان تو گیا ہے لیکن بات اس کے دل میں جم چکی ہے، نکلے گی نہیں، اور جب تک نکل نہ جائے وہ صحیح معنی میں راضی نہ ہوگا،

شیخ صاحب : لیکن اس کی رضامندی سے، اور کلو میاں کے دو ہزار سے کیا تعلق ؟

زبیدہ : کیوں نہیں ہے ؟ بات بڑھی تو یہیں سے ہے، جب اسے معلوم ہو جائے گا کہ اس کے باپ نے اپنے مجبور اور پریشان حال

دوست کا بوجھ اٹھا لیا، تو خوش ہو جائے گا۔

شیخ صاحب: لیکن یہ تو بڑا مہنگا سودا پڑا؟

زبیدہ: یا تو خان بہادر، اور سلطانہ سے، اس کے جہیز سے، اور مستقبل کی توقعات سے ہاتھ دھولو، یا دو ہزار سے، ______

اب سوچو یہ سودا مہنگا پڑے گا یا نہیں؟ پھر جیسا کہو، ویسا کرنے کو تیار ہوں،

شیخ صاحب: (سوچتے ہوئے) اچھا بھئی یہ بھی سہی ______

ماں بیٹے جب مل جائیں، تو میں

کیا کر سکتا ہوں سوا سر تسلیم خم کر دینے کے؟

زبیدہ: بس تو آج کلو میاں کو بلا کر روپے دیدو، کل میں خاں بہادر کے ہاں جاؤں گی،

شیخ صاحب: اتنی جلدی کی کیا ضرورت ہے؟ آج ہی کیوں؟

زبیدہ: جو کام کل کرنا ہے وہ آج ہی کیوں نہ کر لیا جائے؟ جب روپے دینا ہی ٹھہرے، تو کل کے بجائے آج، اور ابھی کیوں نہ دے دئے جائیں؟ اس طرح میرا دل مطمئن ہو جائے گا، خان بہادر کے ہاں جاتے وقت ایک مرتبہ پھر ارشاد سے قول و اقرار لے لوں گی، اور اسے بتا دوں گی کہ تیری خوشی کے لئے تیرے باپ نے کتنا بڑا جوا کھیلا ہے۔ ______

یک مشت دو ہزار روپے خدا کے نام پر، سود کا کیا ذکر۔

اصل بھی غائب، وہ تو دیوانہ ہو جائے گا خوشی سے،

شیخ صاحب: جی ہاں ——— سوچے گا پتھریں بھی جونک لگ سکتی ہے،

زبیدہ: (مسکراتے ہوئے) اور کیا کچھ جھوٹ ہے؟

شیخ صاحب: نہیں بھائی تم لوگوں کو جھوٹ سے کیا سروکار، ؟ لیکن یہ بھی تو کبھی سوچا ہوتا کہ یہ دولت اپنے ساتھ قبر میں تو نہیں لے جاؤں گا؟ یہ سارے پاپڑ صاحبزادے ہی کے لئے تو بیل رہا ہوں؟

زبیدہ: ٹھیک ہے، پھر اسے راہ پر لانے، اور خوش کرنے کے لئے دو ہزار کا منہ کیوں دیکھتے ہو؟

شیخ صاحب (مصنوعی غصہ سے) اس کی مرضی پر تو سب لٹا دے، اگر ہاتھ پکڑلوں تو جو چور کی سزا وہ میری،

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ خادمہ نے اطلاع دی کلو میاں آئے ہیں، شیخ صاحب اٹھ کھڑے ہوئے،

"کمبخت کو اسی وقت مرنا تھا، ——— چلو آتا ہوں، !"

زبیدہ مسکرانے لگی، شیخ صاحب منہ پھلائے باہر چلے گئے،!

(۵)

کلو میاں کا شمار شرفائے شہر میں ہوتا تھا، کبھی انھوں نے بھی اچھے دن دیکھے تھے، لیکن اب تباہی نے سایہ ڈال رکھا تھا، پھر بھی بڑے رکھ رکھاؤ کے آدمی تھے، دشمن بھی ان کی شرافت اور دیانت کے قائل تھے، باغ کے بارے میں تو وہ خود بھی مایوس ہو چکے تھے، کہ گیا، اب کیا خان بہادر صاحب واپس کریں گے، گھر بیچنا نہیں چاہتے تھے، لڑکی جوان ہو چکی تھی، شادی طے ہو چکی تھی، سسرال والے تقاضا کر رہے تھے، اندیشہ تھا اگر تاخیر ہوئی، تو وہ کوئی اور گھر دیکھ لیں گے، اور دو ہزار سے کم میں یہ کام انجام نہیں پا سکتا تھا، ہاتھی لاکھ لٹا جب

بھی سوا لاکھ ٹکے کا، آخر عظمت رفتہ کا کچھ ثبوت تو اس تقریب سعید کے موقعہ پر دینا ہی چاہئے تھا، کئی دن سے بیچارے اس چکر میں تھے آخر جب کوئی راہ نظر نہ آئی، تو شیخ صاحب کے در دولت پر دستک دی۔

شیخ صاحب کی ساری ناگواری گھر سے باہر آتے آتے ختم ہو گئی، کلو میاں کو دیکھتے ہی اس طرح لپکے جیسے کوئی مدت کا بچھڑا دوست سامنے آگیا ہے،

آہا کلو میاں، آیئے آیئے، ——— وہ آئیں گھر میں، ہمارے خدا کی قدرت ہے، !" ——— تشریف رکھیئے، !"

کلو میاں بیٹھ گئے، شیخ صاحب پھر بلبل شیدا بیاں کی طرح چہکے،

"خیریت تو ہے میرے بھائی آج، یہ پھول سا چہرہ کمہلایا ہوا کیوں نظر آرہا ہے؟"

کلو میاں نے بھی حاضر جوابی کا ثبوت دیا،

"تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں، !"

شیخ صاحب کرسی گھسیٹ کر اور زیادہ قریب آگئے،

ضرور کوئی خاص واقعہ پیش آیا ہے، لیکن کلو میاں ہم سے بھی چھپاؤ گے؟ اپنے بچپن کے یار دل سے، ؟

کلو میاں نے پہلو بدلتے ہوئے کہا،

"نہیں بھائی اب چھپانے کی تاب نہیں، درد دل کا ماجرا کہنے ہی آیا ہوں، کیا سن سکو گے؟"

بڑی آمادگی کے ساتھ شیخ صاحب گویا ہوئے،

"نہ صرف سنوں گا، بلکہ ہو سکا تو مداوا بھی کردوں گا ——
دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست،!"

یہ الفاظ سنکر کلو میاں کے پژمردہ چہرے پر رونق آگئی،

"بھئی بڑی مصیبت میں مبتلا ہوں، جان سے عاجز آگیا ہوں بعض وقت تو جی چاہتا ہے خودکشی کرلوں،!"

شیخ صاحب نے ایک تاثر اور جوش کے عالم میں کہا،

"کیا میری زندگی میں بھی تم مصیبت میں مبتلا ہو سکتے ہو، ؟ پھر نہیں نہیں خودکشی مجھے کرنی چاہئے، بلکہ ڈوب مرنا چاہئے چلو بھر پانی میں،!"

کلو میاں: یہ تمھاری محبت ہے جو ایسی باتیں کہتے ہو، ورنہ حالات اتنے ابتر ہو چکے ہیں کہ سنبھلتے نظر نہیں آتے،

شیخ صاحب: پھر وہی مایوسی کی باتیں، کیا ہیں وہ معاملات بتاؤ بھی تو خدا کے بندے،!

کلو میاں: ارے بھئی یاد ہو گا، میں نے خان بہادر رضی الدین کے پاس اپنا باغ رہن رکھا تھا، ——

شیخ صاحب: ہاں یاد ہے، میں نے ہی تمہیں مشورہ دیا تھا، ان کے

پاس جانے کا، ——— پھر؟

کلو میاں: خان بہادر صاحب نے دو ہزار دئے تھے،

شیخ صاحب: یاد ہے، بتایا تھا تم نے،

کلو میاں: اب انھوں نے ساڑھے تین ہزار سود کے نکال کے حساب کتاب برابر کر لیا،

شیخ صاحب: (چونک کر) اماں تمہیں خدا کی قسم، ؟"

کلو میاں: ہاں بھائی، ——— بڑا قصائی ہے یہ شخص بھی (بھرائی ہوئی آواز میں) حالانکہ میرا باغ مفت بھی بکے تو بارہ ہزار سے کم میں نہیں بکے گا، لیکن دو ہزار دے کر، ساڑھے تین ہزار سود کے لگا کر، پورا باغ ہتھیائے لے رہا ہے،

شیخ صاحب: غضب ہے،

کلو میاں: غضب کا غضب، ——— اور میں تو اس پر بھی تیار ہو گیا تھا، ———

شیخ صاحب: (قطع کلام کر کے) یہ کیا لغویت ہے کیوں تیار ہو گئے تھے؟"

کلو میاں: آدمی مجبور ہوتا ہے تو سب کچھ کرتا ہے، وہ ہے نا تمھاری بھتیجی عائشہ، ———

شیخ صاحب: ہاں ہاں ——— اب تو ماشاء اللہ جوان ہو گئی ہو گی، ——— بڑی پیاری بچی ہے،

کلو میاں: ہاں ماشاء اللہ جوان ہے، لیکن کاش وہ پیدا نہ ہوئی ہوتی، کاش وہ جوان ہونے سے پہلے مر گئی ہوتی،

شیخ صاحب: کیا بکتے ہو؟

کلو میاں: جانتے ہو کیا زمانہ ہو رہا ہے، بڑی مشکل سے اس کی نسبت ہوئی، ہونے والے داماد بڑے سعادت مند ہیں، پھر بھی آخر اس دنیا کے فرد ہیں، انہیں جہیز بھی چاہیے، دھوم دھام بھی چاہیے، کراکری بھی چاہیے بیش قیمت ملبوسات بھی چاہئیں، ______

شیخ صاحب: آنکھیں پھاڑ کر خدا رحم کرے،

کلو میاں: لیکن عائشہ کی ماں بڑی سگھڑ عورت ہے، کپڑے، زیور فرنیچر، برتن، بہت سی چیزیں رفتہ رفتہ جمع کر لی ہیں بڑے بڑے نازک اور کٹھن وقت آئے، اب تم سے کیا چھپاؤں، کئی کئی وقت فاقہ تک کرنا پڑا، مگر ان چیزوں میں ہاتھ نہیں لگانے دیا، لہذا ان چیزوں کی طرف سے تو اطمینان ہے، لیکن شادی کی تقریب کے لیے تو کم از کم دو ہزار روپے ہاتھ میں چاہئیں،

شیخ صاحب: ضرور، بغیر اس کے کیسے کام چل سکتا ہے؟

کلو میاں: میں نے خان بہادر کے سامنے بھی تجویز رکھی تھی کہ دو ہزار دے دیں، اور باغ لے لیں،

شیخ صاحب: معقول تجویز تھی، کیا انہیں کوئی تامل تھا اس کے ماننے میں؟

کلو میاں: جی ہاں ______ انھوں نے فرمایا، یا تو ساڑھے پانچ ہزار گن

دو نقدا نقد، ورنہ باغ سے ہاتھ دھو لو، مزید دو ہزار کا سوال ہی
نہیں'!
شیخ صاحب : لاحول ولا قوۃ، واقعی یہ شخص آدمی نہیں قصائی ہے،
کلو میاں : بلکہ جلاد، قصائی کے دل میں بھی رحم آجاتا ہے، مگر جلاد نہیں
جانتا رحم کسے کہتے ہیں،
شیخ صاحب : پھر آپ نے کیا جواب دیا ؟
کلو میاں : میں نے کہا، غور کرکے جواب دوں، فرمانے لگے، تین دن کی
مہلت دیتا ہوں ــــــ کل تیسرا دن ہے'!
شیخ صاحب : یہ دوسرا ظلم، اتنی جلد ساڑھے پانچ ہزار کا بندوبست ناممکن
ہے، یہ محسوس کرکے خان بہادر نے تین دن کی مہلت دی ہے
کلو میاں : ہاں اور کیا، قطعاً یہی بات ہے،
شیخ صاحب : تو پھر آپ نے سوچا کیا ہے حضرت ــــــ ؟
کلو میاں : تمہارے پاس آیا ہوں مشورہ کے لئے، جیسا کہو ویسا کیا جائے
خان بہادر صاحب دو ہزار اس شرط پر دینے کو تیار ہیں کہ مکان
بھی ان کے ہاتھ فروخت کردوں'!
شیخ صاحب : (کچھ سوچتے ہوئے، مکان اندازاً کتنے کا ہوگا' ؟
کلو میاں : یوں تو دو کوڑی کا بھی نہیں ہے ویسے ہزاروں کا ہے'
شیخ صاحب : یہ کیا بات ہوئی کلو میاں ؟
کلو میاں : بزرگوں کے وقت کی پختہ اور سنگین حویلی ہے اسے کھدوا کر اگر

ملبہ بھی بیچا جائے، تو پندرہ بیس ہزار سے کم ہی کیا بکے گا، لیکن اس بستی میں اس کا گاہک کون مل سکتا ہے؟ اور کوئی ملے گا بھی تو خان بہادر ہی جیسا ملے گا، !

شیخ صاحب ہنسنے لگے، پھر دفعتہً سنجیدہ ہو کر کچھ سوچنے لگے، کلو میاں امید و بیم کے عالم میں ان کی طرف تکنے لگے کہ دیکھئے کیا فیصلہ صادر ہوتا ہے،

ذرا دیر کے بعد، شیخ صاحب نے مراقبہ سے سر اٹھایا،

"بھئی ایک بات ذہن میں آتی ہے، !"

سوکھے کھیت میں پانی پڑ گیا، کلو میاں نے کہا۔

"زیادہ سوچئے نہیں کہہ ڈالئے، !"

شیخ صاحب نے آہستہ آہستہ رک رک کر فرمایا،

"میں خود آج کل بڑی الجھنوں میں مبتلا ہوں، اس لئے ہاتھ خالی ہے ورنہ کوئی بات نہ تھی، یہ بوجھ میں اپنے سر لے لیتا، ہم اور تم کچھ دو تو ہیں نہیں، ——"

کلو میاں کا چہرہ پھر بے رونق ہو گیا، امید کا قلعہ منہدم ہو گیا، بجھے ہوئے لہجہ میں بولے،

"لیکن تم کچھ کہہ تو رہے تھے !"

شیخ صاحب نے دل دوزی اور ہمدردی کے لہجہ میں کہا،

"دو ہزار نہیں ڈھائی ہزار لے لو، مکان میں رہن رکھ لوں گا، جو

سود تم خان بہادر کو دیتے تھے، اس سے دو روپیہ کم مجھے دے دیا کرنا، اور یہ تو دراصل ضابطہ کی کارروائی ہے، ورنہ بہرحال مکان تمھارا ہے، تمھارے ہی قبضہ میں رہے گا، !"

کلو میاں اس تجویز کو ماننے سے انکار نہیں کر سکتے تھے،

"مجھے منظور ہے، ——— میں تمھارا شکر گزار ہوں، ! لیکن معاملہ جلد ہونا چاہیے، !"

شیخ صاحب نے بے تکلفانہ لہجہ میں کہا،

بھئی ابھی ہو جائے گا، قبالہ لے آؤ، اسی وقت لکھا پڑھی ہوئی ہے، میں روپے گن دوں گا، تم ٹھنڈے ٹھنڈے گھر جاؤ، !"

کلو میاں پر وجد کی کیفیت طاری ہو گئی، کہنے لگے،

"ابھی گیا، ابھی آیا، !"

یہ کہہ کر وہ جانے کے لیے اٹھے، لیکن شیخ صاحب نے پھر ایک بات چھیڑ دی،

مگر باغ کا کیا ہو گا ؟"

کلو میاں نے مایوسی کے عالم میں کہا،

باغ کا کیا ہونا ہے، وہ تو نصیب دشمناں ہو گیا، !"

شیخ صاحب ہنسنے لگے، پھر انھوں نے فرمایا،

"تمھاری بھاوج (زبیدہ بانو) کے پاس کچھ روپے جمع ہیں، جانتے ہو، عورتیں سینت سینت کر رکھتے، اور جمع کرنے کی عادی ہوتی

ہیں، انہیں اس پر رضامند کیا جا سکتا ہے کہ ساڑھے پانچ ہزار دے کر باغ خود اپنے پاس رہن رکھ لیں، کم از کم خان بہادر کے منہ پر جوتا تو پڑ جائے گا، وہ یہ تو جان لیں گے کہ کلو میاں کے کچھ دوست موجود ہیں، — لیکن بھائی تمہاری بھابی لین دین میں مجھ سے بھی زیادہ سخت ہیں، وہ سود میں کوئی کمی نہیں کریں گی، ————

کلو میاں نے سوچا، باغ تو ہاتھ سے گیا، لیکن وہ خان بہادر جیسے قصائی اور جلاد کے پاس کیوں جائے؟ شیخ صاحب جیسے محسن کو اس سے استفادہ کا موقعہ کیوں نہ ملے؟ بڑی خوشی سے راضی ہو گئے، کہنے لگے،

"بھئی سود کا کوئی سوال نہیں بھابی شوق سے ساڑھے پانچ ہزار دے کر، باغ لے لیں، میں نے دیا، میرے خدا نے دیا، میں خوش ہوں کہ خان بہادر کو نہیں ملا، ارشد اس کے پھل کھائے گا تو میں سمجھوں گا میں نے سب کچھ پا لیا،

شیخ صاحب نے خوشی کا جھولا جھولتے ہوئے کہا،

"یہ تمہاری محبت ہے، لیکن فروخت کا کوئی سوال نہیں، زبیدہ کے پاس وہ باغ رہن رہے گا، جب چاہو چھڑا سکتے ہو،

اب کلو میاں ہوا کے گھوڑے پر سوار تھے،

"اچھا بھائی دیکھا جائے گا، پہلے اس نامراد سے تو قبضہ مل جائے، !!"

کلو میاں چلے گئے، شیخ صاحب نے اپنے منشی سے کہہ کر جلدی جلدی

کاغذات تیار کرائے، روپیہ تجوری سے نکال کر میز کے خانے میں رکھا، اور اطمینان سے اخبار دیکھنے لگے۔ کوئی دس منٹ بعد کلو میاں آئے تو ان سے باغ اور مکان کے رہن نامہ پر دستخط کرا کے ساڑھے آٹھ ہزار روپیہ نقد حوالے کر دیا، کلو میاں خوشی خوشی اپنے گھر گئے۔ اور شیخ صاحب خوش خوش زبیدہ کے پاس پہنچے کہ اسے خوش خبری سنا دیں'!

---

(۶)

زبیدہ نے اپنی حکمت عملی سے خان بہادر صاحب کو رضا مند کر لیا، ان کی ساری خفگی دور کر دی، سلطانہ کو دل کی مراد مل گئی، باپ کی برہمی اور خفگی نے، اس کے دل ناتواں کو مجروح کر دیا تھا، لیکن، اب اس اجڑی ہوئی بستی میں ایک مرتبہ پھر بہار آگئی، غم کے بادل چھنٹ گئے، نشاط و مسرت کا سورج چمکنے لگا، وہ دولہن بن کر ارشد کے گھر آگئی، اس موقع پر شیخ صاحب نے اپنے روایات خاندانی و ذاتی کو بالائے طاق رکھ کر بڑی فراخ دلی دکھائی، یہ سب زبیدہ بانو کے دباؤ کا نتیجہ تھا، پھر شیخ صاحب نے یہ بھی سوچا چند ہزار خرچ کر کے اگر لاکھ کی رقم ملتی ہے تو اسے فضول خرچی

...... نہیں کہہ سکتے، سلطانہ سونے چاندی سے لدی پھندی ان کے ویرانہ میں داخل ہوئی، خان بہادر صاحب نے امید اور توقع سے زیادہ جہیز دیا، پھر نقد ایک لاکھ روپیہ الگ، سلطانہ یوں تو اپنی صورت و سیرت کے لحاظ سے ویسے بھی زبیدہ بانو اور شیخ صاحب کو پسند تھی، لیکن اگر وہ کانی، لولی، لنگڑی، بدصورت ہوتی، تو بھی اس مال و منال کے ساتھ اس کا خیر مقدم اتنے ہی زور شور سے ہوتا، جو بھاگوان لڑکی اپنے ساتھ نقرئی و طلائی زیورات کے علاوہ، مکان، دوکان، باغ، اور زمین کے قبالے بھی لائے، اگر اس کے لئے دیدۂ و دل فرش راہ نہ کئے جائیں تو اور کون اس اعزاز کا مستحق ہو سکتا۔ جب ایک ایک کر کے تمام چیزیں شیخ صاحب کے عالی شان مکان کے وسیع کھنڈر میں جمع کی جا رہی تھیں وہ فہرست سے مقابلہ کر کر کے چارج لیتے جا رہے تھے، اور صاف معلوم ہو رہا تھا، ہر نئی چیز پر پلیسیل خون بڑھ رہا ہے، ارشد کو ان چیزوں سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی، البتہ خان بہادر صاحب نے، جو نئی اور شاندار موٹر مرحمت فرمائی تھی، اسنے اسے شوق اور توجہ کی نظر سے دیکھا، شیخ صاحب سے وہ کئی مرتبہ موٹر کا تقاضا کر چکا تھا اور وہ ہاں ہوں کر کے ٹال دیتے تھے، لیکن خان بہادر صاحب نے بغیر فرمائش کے یہ دیرینہ آرزو پوری کر دی، زبیدہ بانو کے تو فرط مسرت سے بند قبا ٹوٹے جا رہے تھے۔ بار بار سلطانہ کی بلائیں لیتی تھیں اور اس پر صدقے قربان ہوتی تھیں، ان کی نظر میں وہ اس گھر کی رونق تھی، آبرو تھی، شان تھی، تھوڑے تھوڑے وقفہ سے آ آ کر اپنی

نئی نویلی اور حبیتی دولہن کو دیکھ کر کلیجہ ٹھنڈا کرکے پھر کام میں مصروف ہو جاتی تھیں، اس پرجوش خیر مقدم کا اثر سلطانہ پر بھی بہت ہوا، جس نیاز مندانہ انداز سے شیخ صاحب اور زبیدہ کی طرف سے اس کی پذیرائی ہو رہی تھی، اسی پیمانہ پر وہ ارشد کو بھی ناپ رہی تھی، اسے امید تھی وہ بھی اس جوش و خروش سے اسے خوش آمدید کہے گا،

لیکن ارشد سے یہ امید پوری نہ ہوئی، ارشد نے جب کمرہ میں قدم رکھا تو اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، ______

چشم نیم باز سے وہ اس مگے رو ئے
دل آرا کا نظارہ کرتی رہی، ارشد کے برتاؤ میں اخلاق تھا، شائستگی تھی، لیکن گرم جوشی نہ تھی، دل اشتیاق کی جھلک نہ تھی، اس کا تبسم دل فریب تھا، لیکن اس تبسم میں، وہ بے نام سی کیفیت نہ تھی جس کی وہ جویا تھی، اس کی باتوں میں شگفتگی بھی تھی، بے تکلفی تھی، لیکن اپنا پن نہ تھی، سلطانہ نے ایسا محسوس کیا جیسے دونوں ایک دوسرے سے اتنے قریب ہو کر بھی دور ہیں، یہ محسوس کرکے اسے ایک طرح کا جھٹکا سا لگا، لیکن زیادہ سخت نہیں، خود اس کی وارفتگی اتنی بڑھی ہوئی تھی، کہ ان باتوں کو کسی حد تک محسوس کر لینے کے سوا کچھ زیادہ توجہ نہ کر سکی، مایوسی میں بھی امید اپنی جھلک دکھاتی رہتی ہے،

خان بہادر صاحب بھی اس بارگراں کے اتر جانے سے بہت خوش تھے، شیخ صاحب کے مقابلہ میں قدرت نے انھیں زیادہ فیاضانہ

طور پر نوازا تھا، شیخ صاحب صرف ایک لڑکے ——— وہ بھی نالائق ——— کے باپ تھے، خان بہادر کو خدا نے ایک لڑکی دی تھی، تو ایک لڑکا بھی مرحمت کیا تھا، سلطانہ اپنے عادات و اطوار، اور عادات و خصائل کے لحاظ سے سارے گھر میں محبوب تھی، ماں کی آنکھ کا تارا، باپ کے دل کا سرور، بالکل یہی حال ساجد کا بھی تھا، وہ کچھ زیادہ تعلیم یافتہ تو نہ تھا، لیکن ذہین اور معاملہ فہم بہت تھا، تھوڑے ہی دنوں میں اس نے باپ کے کاروبار کو سنبھال کر انھیں ہر روز کی بک بک جھک جھک سے سبکدوش کر دیا، شیخ صاحب جب بھی ساجد کو مصروف عمل دیکھتے تو رشک آتا کہ کاش ارشد بھی ایسا ہی ہوتا، لیکن اسے تو اس کام ہی سے نفرت ہے،

لیکن شادی کے مہینہ بھر بعد قدرت نے خود ہی ایک موقع ارشد کی سعادت مندی اور کارگزاری کو بروئے کار لانے کا پیدا کر دیا، وہ بیمار پڑ گئے، ڈاکٹروں نے سختی سے ہدایت کی کہ کم از کم پندرہ روز تک بالکل آرام کریں، اور کسی طرح کی مصروفیت میں حصہ نہ لیں، کاروبار کے مقابلہ میں انھیں صحت عزیز نہ تھی، کام کرتے رہے نتیجہ یہ ہوا کہ اور زیادہ بیمار پڑ گئے، جب زبیدہ نے بہت اصرار کیا کہ چند روز آرام کر لیں تو جھلا کر فرمایا،

"آرام تو اب قبر میں ملے گا،"

زبیدہ نے منہ پر ہاتھ رکھ دیا،

"خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کیا کرو!"
اور زیادہ برہم ہو کر بولے،
یہ کمبخت ارشد کسی کام کا ہوتا تو کیوں اتنی پریشانیاں اٹھانا پڑتیں،
چند دن کے لئے بھی یہ باپ کا قائم مقام نہیں بن سکتا،
زبیدہ نے اطمینان دلاتے ہوئے کہا،
بیٹھ جائے گا، کیوں نہیں بیٹھے گا،
اتفاق کی بات اسی اثنا میں ارشد کا ادھر سے گذر ہوا، زبیدہ نے آواز دی،
بیٹے ذرا سننا تو سہی،
وہ آکر سامنے کھڑا ہو گیا، شیخ صاحب نے اسے دیکھ کر نفرت سے منہ پھیر لیا، اور کروٹ بدل لی، زبیدہ بولی،
کیوں بیٹے تم اپنے باپ کا ہاتھ چند دن بھی نہیں بٹا سکتے، دیکھ رہے ہو وہ بیمار پڑے ہیں، ڈاکٹروں نے انھیں آرام کی ہدایت کی ہے، ——

ارشد نے نہایت سعادت مندانہ انداز میں کہا،
جو بھی حکم ہو بجا لانے کو تیار ہوں، مجھ سے تو ابو نے کچھ کہا نہیں، ——

شیخ صاحب کو موقعہ مل گیا،
کہہ کر کیا کروں، جانتا ہوں تم کتنے ہونہار اور سعادت اطوار ہو،

بہرحال اگر میرے بڑھاپے اور بیماری پر رحم آ گیا ہے، تو یہ لو چابیاں، ہر شخص کے نام کا الگ فائل، آہنی الماری میں بہ ترتیب حروف تہجی موجود ہے، فائل میں ایک الگ کاغذ پر پورا حساب لین دین کا درج ہے، جو شخص کوئی رقم لائے، اسے سے کہہ اس کاغذ پہ اندارج کر دو، اور رقم تجوری میں رکھ دو، کوئی بات دریافت کرنا ہو تو میں ابھی مر نہیں گیا ہوں، ویسے منشی سے بھی پوچھ سکتے ہو،!!

ارشد نے خاموشی سے کنجیاں لے لیں اور روانہ ہونے لگا، شیخ صاحب نے پھر روکا،

لیکن بیٹے، یہ مال میں سنے بڑی محنت سے کمایا ہے، خدا کے لیے حواس برجا رکھنا، کہیں کوئی غلطی نہ ہو جائے،

ارشد نے اطمینان دلایا،

میں حساب کتاب میں کچا نہیں ہوں، کوئی غلطی نہ ہوگی، ———

کسی حد تک وہ مطمئن ہوئے، لیکن پھر ایک اندلشہ انگڑائی لینے لگا،

" اور ہاں بیٹے، مجھے معلوم ہوا ہے، خدا نظر بد سے بچائے بڑے فیاض، اور سیر چشم و دریا دل ہو، لیکن ابھی یہ مال میرا ہے تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد، جھوٹ موٹ کے مسافر، بیمار، فقیر پھیرا کرتے رہتے ہیں، اور دست سوال دراز کرتے رہتے ہیں، ایسا

پھنکارتا ہوں کہ کان دبا کر چل دیتے ہیں تم جوش سعادت میں کہیں تجوری الٹ کر نہ رکھ دینا، ان کے سامنے ______

ارشد مسکرانے لگا، اور کوئی جواب دئے بغیر چلا گیا، !

---

(۷)

ارشد کو شیخ صاحب کے ساہوکارہ آفس میں بیٹھے ہوئے تین چار دن گزر گئے، کوئی خاص واقعہ یا حادثہ رونما نہیں ہوا، ہر روز جو رقم خطیر قرضداروں کی طرف سے جمع ہوتی تھی، وہ اس کا اندارج کر کے تجوری میں رکھ دیتا، اور شام کو ایک پرچہ پر تفصیل لکھ کر پیش کر دیتا، جسے دیکھ کر شیخ صاحب نہال ہو جاتے، اب وہ دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہے تھے کہ خدا کرے یہ بیماری اور طول کھینچے، اور وہ زیادہ سے زیادہ مدت کے لئے صاحب فراش رہیں تاکہ لڑکا، سارا کام سنبھال لے، جس ارشد کی نالائقی کے وہ شاکی

تھے اب اس کی کارگزاری، مستعدی، اور معاملہ فہمی کے افسانہ خواں تھے زبیدہ بانو بھی خوش تھیں کہ چلو اچھا ہوا، باپ بیٹے میں اعتماد قائم ہو گیا، غلط فہمیاں رفع ہو گئیں،

ایک روز، ارشد اپنے کمرہ میں حسب معمول ناشتہ کے بعد بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا ——— یہ اس کا معمول تھا کہ سا ہوکارہ آفس میں جانے سے پہلے اخبار ضرور پڑھتا تھا، ——— کہ سلطانہ دبے پاؤں آئی، اور اس کی آنکھوں میں ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو گئی، ارشد نے آہستہ سے اس کے ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا،

سلطانہ کے سوا یہ کس کی جرأت ہو سکتی ہے'!"

وہ مسکراتی ہوئی پاس آ کر بیٹھ گئی،

"ویسے تو آپ کتنے با اخلاق، شائستہ، اور مہذب آدمی ہیں مگر ———

ارشد نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا،

"مگر درحقیقت نہایت بد اخلاق حد درجہ ناشائستہ اور پرلے درجہ کا غیر مہذب آدمی ہوں، ——— یہی کہنا چاہتی ہو؟

وہ ذرا چڑتے ہوئے بولی،

خدا نہ کرے، ———"میں نے تو آپ سے اچھا کوئی آدمی نہیں دیکھا، !"

ارشد نے شوخ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا،

"اخلاق کا تقاضا یہ ہے کہ میں بھی کہوں، تم سے اچھی عورت آج تک میری نظر سے نہیں گزری، میں اگر سچا ثابت ہو جاؤں تو بھی تم دروغ گوئی کے الزام سے نہیں بچ سکتیں"!"

وہ ہنستی ہوئی اور کچھ شرماتی ہوئی بولی،

"نہیں آپ سچے ثابت نہیں ہو سکتے نہ میں دروغ گو ہوں"!"

"گویا پلہ میرا ہی بھاری رہا، !"

"وہ تو ہئی ہے، ——— کچھ آج سے ———

"یعنی ———

"(شرماتے ہوئے) میری نظر میں تو آپ نہ جانے کب سے بسے ہوئے ہیں، وہ زمانہ کا ہے کہ یاد ہوگا، جب آپ ہمارے ہاں آیا کرتے تھے، کبھی کبھی مجھے چھیڑا بھی کرتے تھے، شرارتیں بھی کیا کرتے تھے، ———

"بچپن کا زمانہ کبھی نہیں بھولتا، ایک ایک بات یاد ہے"!"

"تو کیا آپ بھی مجھے یاد کیا کرتے تھے، ؟"

"(دلدہی کے لہجہ میں) میں تمھیں بھولا کب تھا کہ یاد کرتا ؟

"(خوش ہو کر) ہوں، ———

"سچ، ——— میرے اللہ تو تم نے فرضی خوبیاں گنائی ہیں، تم میں تو واقعی بہت سی خوبیاں ہیں،

"(ناز سے) اچھا بس چپ رہئے، کسی کو زیادہ بنانا اچھا

نہیں ہوتا، !"

"نہیں سلطانہ میں سچ کہہ رہا ہوں، !"

"اگر سچ کہہ رہے ہیں تو ایک بات بتائیے، !"

"ایک نہیں دس پوچھو، !"

"پھر آپ ابا میاں سے لڑکیوں گئے تھے ؟"

"میں تو نہیں لڑا تھا، !"

"وہ تو اتنے خفا تھے کہ نسبت تک منقطع کرنے پر تیار ہو گئے تھے ؟"

"(واقعہ کی ساری تفصیل سناتے ہوئے) بس اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا، !"

"(مسکراتے ہوئے) آپ کی یہی باتیں تو مجھے اچھی لگتی ہیں، !"

"میری نالائقی کی باتیں ؟"

"روپے کی ہوس کسے نہیں ہوتی، عزت کے قابل تو وہ ہے جو روپیہ کو ٹھکرا سکے، خوشامد کرنا کسے نہیں آتا، لیکن جو بڑے سے بڑا نقصان اٹھا کر بھی خوشامد نہ کرے کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی معزز ہو سکتا ہے ؟ ماں باپ کی، اور خاص کر دولت مند ماں باپ کی اطاعت سب کرتے ہیں، لیکن جو دوسرے غریبوں، مفلسوں اور پریشان حالوں کے لئے، دولت مند ماں باپ کی خفگی مول لینے کی جرأت رندانہ کر بیٹھے میرا تو جی چاہتا ہے اسے پوجوں، !"

ارشد نے ایک قہقہہ لگایا، پھر کہنے لگا،

بھئی سلطانہ تم تو بڑے مزے کی باتیں کر لیتی ہو، میری جگہ کوئی

اور ہوتا تو واقعی بے وقوف بن جاتا!"

سلطانہ نے زیرِ لب تبسم کے ساتھ جواب میں کہا،

"آپ کو جب غرض بے وقوف نہ بنا سکی تو اور کون بنائے گا ——

سچ کہتی ہوں، ابا جان نے جب گھر میں آ کر بادل کی طرح گرجنا شروع

کیا، تو میں بہت روئی ——"

ارشد نے چھیڑتے ہوئے پوچھا،

"اس میں رونے کی کیا بات تھی!"

وہ چڑتی ہوئی بولی،

"ہاں آپ تو بہت خوش ہوئے ہوں گے!"

ارشد: اچھا میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں —— تم روئیں

پھر کیا ہوا؟"

سلطانہ: جب بعد میں، مجھے یہ واقعہ معلوم ہوا جو ابھی آپ نے بیان

کیا ہے تو میں بہت خوش ہوئی،

ارشد: اس کے معنی یہ ہیں کہ تمھارا دل بھی غریبوں کے لئے کڑھتا

ہے؟"

سلطانہ: کیوں نہیں کڑھتا، اور بیچاری عائشہ تو میری بچپن کی سہیلی

ہے، یہ واقعہ سنکر مجھے غصہ بھی آیا تھا، !"

ارشد : عائشہ کون ؟"

سلطانہ : کلو میاں کی لڑکی عائشہ ہی تو ہے' !"

ارشد : پھر تو واقعی غصہ آنا چاہیے تھا،

سلطانہ : اتنی بے زبان، باجیا، اور نیک لڑکی ہے کہ کیا کہوں ؟"

ارشد : ضرور ہوگی،

سلطانہ : آپ نے کیسے جانا ؟"

ارشد : جس طرح درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے، اسی طرح آدمی اپنے دوستوں سے پہچانا جاتا ہے، عائشہ جب تمھاری دوست ہے، تو اسے اچھا ہونا ہی چاہیئے،

سلطانہ : خدا کا شکر ہے بیچاری کی شادی ہو گئی' !

ارشد : بہت اچھا ہوا، ——— ملی تھیں تم اس سے ؟"

سلطانہ : جی ہاں ملی تھی، بہت خوش ہے اس نئی زندگی سے، ——— اور آپ کی تو بے انتہا ممنون ہے' !"

ارشد : میں نے کون سا ایسا احسان کیا ہے اس پر ؟"

سلطانہ : اسے سب کچھ معلوم ہے ؟"

ارشد : یعنی وہ بھی جو مجھے نہیں معلوم ہے ؟"

سلطانہ : کیا آپ نے کلو میاں کو چچا جان (شیخ صاحب) سے ڈھائی ہزار روپے قرض نہیں دلوائے ؟"

ارشد : ہاں خیر، روپے تو میری وجہ سے بے شک ملے، لیکن غرض

نہیں، ابّو جان نے دوستانہ تحفہ کے طور پہ یہ رقم کلّو میاں کر دی ہے'!"

سلطانہ: دی ہوگی، وہ تو قرض ہی کہہ رہی تھی'—— خیر وہ قرض ہو یا تحفہ، یا عطیہ، بہر حال اس روپے سے اس کی زندگی سنور گئی، شیخ صاحب کے گن کلّو میاں بھی گاتے ہیں، اور عائشہ بھی'!

ارشد: شریف لوگ ہیں'

سلطانہ: میں نے بھی ابّا جان کو وہ وہ سنائی ہیں کہ یاد ہی تو کرتے ہوں گے'!"

ارشد: تم نے؟—— تم تو ان کے سامنے بات بھی نہیں کرتیں'

سلطانہ: جو کچھ سنانا تھا میں نے امّاں کو انھوں نے ابّا کو سنا دیا!

ارشد ہنسنے لگا'

"واہ بھئی یہ طریقہ خوب ہے سنانے کا، لطف آگیا'!

---

(۸)

دو تین روز بعد کا واقعہ ہے ارشد دفتر میں بیٹھا کاغذات الٹ پلٹ کر رہا تھا کہ کلو میاں آتے نظر آئے، وہ ہمیشہ سے ان کا احترام کرتا آیا تھا، تپاک اور گرم جوشی سے پیش آیا، وہ بھی بڑی محبت اور شفقت کے ساتھ پیش آئے، ارشد نے پوچھا،

کہیے چچا کیا حال ہے؟

وہ سراپا نیاز بن کر بولے،

اچھا ہوں بیٹے، دعا دیتا ہوں تمھیں، خدا شاد رکھے، آباد رکھے،

فروتنی اور انکسار کے ساتھ ارشد نے کہا،

آپ کتنی محبت کرتے ہیں اپنے چھوٹوں اور خادموں سے ۔۔
۔۔۔۔۔ کہیے عائشہ اپنے نئے گھر میں خوش تو ہے' ؟
کلو میاں کے چہرے پر رونق آگئی، کہنے لگے،
" خدا کا شکر ہے، یہ اتنا بڑا بوجھ تھا، جو میری کمر توڑے دے رہا تھا، اگر تم کام نہ آتے تو خدا جانے کیا حشر ہوتا؟
ارشد نے انکسار بھرے لہجہ میں کہا،
آپ شرمندہ کیوں کرتے ہیں' ؛ میں نے کیا کیا؟ خدا ہی جو چاہتا ہے کرتا ہے اور وہی بہتر ہوتا ہے،
کلو میاں : وہ تو ٹھیک ہے بیٹے، لیکن خدا اپنے بندوں ہی میں سے کسی کو واسطہ بناتا ہے، بہرحال جب تک زندہ ہوں تمھارے گن گاؤں گا، ۔۔۔۔۔ آج شیخ صاحب نظر نہیں آتے!
ارشد : کئی دن سے ان کی طبیعت خراب ہے، ڈاکٹروں نے کامل آرام کا مشورہ دیا ہے۔
کلو میاں : (پریشان ہوکر) خیر تو ہے ؟
ارشد : جی ہاں اندیشہ کی کوئی بات نہیں، کثرت کار کے باعث اعصاب پر اثر پڑا ہے، چند روز آرام کرلیں گے ٹھیک ہو جائیں گے،
کلو میاں : اچھا بیٹے میری طرف سے پوچھ دینا، ۔۔۔۔۔ اب چلوں؟
ارشد : اتنی جلدی کیا ہے تشریف رکھیے، ابھی تو آئے ہیں، ۔۔۔۔

ابّو جان سے کوئی خاص کام تو نہیں تھا؟

کلّو میاں: (ٹالتے ہوئے) ہاں کوئی خاص کام تو نہ تھا، مگر ایک بات کہنے آیا تھا،

ارشد: تو مجھ سے فرما دیجئے، اگر کوئی حرج نہ ہو،

کلّو میاں: (ہنستے ہوئے) حرج کیا ہوگا تم سے کہنے میں؟ ویسے آج کل کام بھی تم ہی سنبھالے ہوئے ہو،

ارشد: جی ہاں، یہ بات تو ہے، ——— بتائیے کس لئے تشریف لائے تھے؟

کلّو میاں: وہ باغ تو گیا،

ارشد: (حیرت سے) گیا کیوں؟ وہ تو ابّو نے خان بہادر صاحب سے چھڑا لیا،

کلّو میاں: چھڑا تو لیا تھا، اور میں خوش ہوں کہ اتنے سفاک اور قصاب شخص کے بجائے وہ شیخ صاحب کے ہاتھ میں آ گیا، تم اس کے پھل کھاؤ گے میرا قلب محزون خوش ہوگا، میری تو صرف یہ خواہش تھی کہ خان بہادر کو اس سے استفادہ کا موقع نہ ملے، دوستوں کے کام آجائے۔

ارشد: یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں چچا میاں؟ کیا اب وہ باغ آپ کا نہیں ہے؟

کلّو میاں: (افسردہ سے تبسم کے ساتھ) میرا کیوں ہوتا بٹیا؟ وہ تو بھابی نے یعنی تمہاری ماں نے ساڑھے پانچ ہزار خان بہادر صاحب کو تھلے

کر خود امی شرح پر اپنے پاس رکھ لیا ہے ؟

ارشد: آپ کی بھابھی نے میری ماں نے ؟ ——— امی شرح پر اپنے پاس رکھ لیا ہے ؟ ——— یہ آپ کیا فرما رہے ہیں چچا میاں ؟

کلو میاں: غلط تو نہیں کہتا بیٹے ؟ میں نے تو شیخ صاحب کی یہ تجویز دل و جان سے منظور کر لی تھی ،

ارشد: آپ کو کچھ غلط فہمی تو نہیں ہوئی ہے ؟

کلو میاں: غلط فہمی کیسی ؟ بے شک مصیبتوں اور پریشانیوں نے میرے انجر پنجر ڈھیلے کر دیئے ہیں، لیکن اب اتنا گیا گزرا بھی نہیں ہوں کہ کل کی بات بھول جاؤں، اور پھر بات بھی زبانی نہیں لکھنت پڑھت کے ساتھ ،

ارشد: حیرت ہے ! ——— سخت حیرت ، سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ماجرا کیا ہے ؟

کلو میاں: کیا سمجھ میں نہیں آتا بیٹے ، ؟

ارشد: خیر دیکھا جائے گا ، امی سے پوچھوں گا ، میں نے تو ان سے کچھ اور سنا تھا ،

کلو میاں: کیا سنا تھا بیٹے ؟

ارشد: یہ کہ ——— لیکن آپ کچھ اور بھی تو کہہ رہے تھے ؟

کلو میاں: یہ کہہ رہا تھا کہ باغ کا قصہ ہی ختم ہو جانا چاہیے، اتنی بڑی رقم نہ میں فراہم کر سکتا ہوں، نہ وہ چھوٹ سکتا ہے، لہذا بہتر یہ ہے کہ اسے

برابر سرابر کر لیا جائے، تاکہ یہ ایک ذہنی بوجھ جو خواہ مخواہ کا آن پڑا ہے، اس سے تو نجات ملے،

ارشد: جی اور، ـــــــــــ؟

کلو میاں: اب معاملہ رہ جاتا ہے مکان کا۔

ارشد: مکان کا معاملہ؟ (بہت زیادہ حیرت زدہ ہو کر) کیا مکان کا بھی کچھ معاملہ ہے؟

کلو میاں: (ہنستے ہوئے) بیٹے، جب اپنے باپ کے کاروبار سے اتنے ناواقف ہو تو یہاں بیٹھنے سے کیا حاصل؟

ارشد: واقعی مجھے اپنی ناواقفیت پر ندامت ہے، لیکن آپ بتا دیں تو کیا حرج ہے؟

کلو میاں: شیخ صاحب نے ڈھائی ہزار روپے پر رہن رکھا تھا، اور پرانی دوستی کا لحاظ کر کے سود میں بھی کمی کر دی تھی، یعنی خان بہادر کے مقابلہ میں دو روپے سیکڑہ کم،

ارشد: ابّو نے آپ کا مکان رہن رکھا ہے؟

کلو میاں: ہاں ہاں بیٹے، ـــــــــــ لیکن تمہیں اتنا تعجب کیوں ہو رہا ہے؟

ارشد: اور سود پر رہن رکھا ہے؟

کلو میاں: (ہنستے ہوئے) بیٹے کی باتیں، میرے بچے، کیا بغیر سود کا کاروبار بھی اس دنیا میں ہوتا ہے؟

ارشد : (پر خیال انداز میں) اور سود کی شرح خان بہادر کے مقابلہ میں دو روپیہ سیکڑہ کم ہے ؟

کلو میاں : کئے بار پوچھو گے بیٹے! ــــــــــــ ساری لکھنت پڑھنت ہو چکی ہے، کاغذات تو یہیں ہوں گے دیکھ لو، خود ہی تصدیق ہو جائے گی کہ یہ بوڑھا جھوٹ بول رہا ہے یا سچ ؟

ارشد : بھلا آپ جھوٹ کیوں بولیں گے، ؛ ویسے کاغذات بھی ابھی دیکھ لوں گا، لیکن آپ مکان کے بارے میں فرمانا کیا چاہتے تھے ؛

کلو میاں : کہنے یہ آیا تھا کہ گو شیخ صاحب نے سود میں دو روپے سیکڑہ کمی کر دی ہے پھر بھی یہ بوجھ میرے لئے ناقابل برداشت ہے،

ارشد : ضرور ہوگا، ہونا ہی چاہیئے،

کلو میاں : میں چاہتا تھا، شیخ صاحب پانچ سو روپے مجھے اور دے دیں، اور آدھا مکان اپنے نام لکھا لیں، باقی آدھے میں ہم میاں بیوی پڑے رہیں گے،

ارشد : اس میں کیا مصلحت ہے ؟

کلو میاں : ایک تو سود کے چکر سے نجات پا جاؤں گا، دوسرے طبیعت یکسو ہو جائے گی کہ اب کسی کا لینا دینا نہیں ہے، اور یہ پانچ سو، ــــ

ارشد : جی ہاں، اس پانچ سو کا کیا کریں گے آپ ؟

کلو میاں : سگرٹ کی ایک چھوٹی سی دکان اپنے گھر ہی پر کھول لینے کا ارادہ ہے، امید ہے اس طرح پچاس ساٹھ روپے ماہوار کی آمدنی ہو جایا..

کرے گی،

ارشد: جی ہاں۔ یہ تو ہو سکتا ہے،

کلو میاں: تو بھیا۔ شیخ صاحب کی طبیعت جب ٹھیک ہو جائے تو میرا یہ پیام پہنچا دینا۔ اگر یہ بات منظور ہو تو جب چاہیں بلا لیں، فوراً آجاؤں گا،

ارشد: اتنی معمولی سی بات کے لئے ابو کو زحمت دینے کی کیا ضرورت ہے؟ اتنا کام تو میں بھی کر سکتا ہوں،

کلو میاں: (خوش ہو کر) ہاں کیوں نہیں کر سکتے؟ آخر باپ کے جانشین ہی جو ٹھہرے، ــــــ لیکن بیٹے یہ معاملہ انہی کو کرنا چاہیئے،

ارشد: یہ کیوں چچا میاں؟ ــــــ کیا برا کیا ہوا کوئی کام غلط اور ناجائز ہو سکتا ہے؟ کیا آپ کو خیال ہے ابو اسے نا منظور کر دیں گے ــــــ؟

کلو میاں: (لاجواب ہو کر) نہیں ایسا تو نہیں ہے،!

ارشد مزید کوئی گفتگو کئے بغیر اٹھا، تجوری کھولی، اور ایک ہزار روپے گن کر کلو میاں کے سامنے رکھ دیئے، مانگی ہوئی رقم سے دوگنی رقم دیکھ کر کلو میاں چونک پڑے،

"بیٹے یہ تو ایک ہزار روپے دے دیئے تم نے؟"

"جی ہاں، ــــــ ایک ہزار سے کم میں کام نہیں چلے گا،!"

مفرِ مسرت سے کلو میاں کا چہرہ تمتما اٹھا، ایک ایک منہ میں سو سو دعائیں، درازی عمر و ترقی اقبال کی دے ڈالیں،

دعاؤں کا یہ رشتہ لے کر ایک مرتبہ ارشد پھر اٹھا، اس نے آہنی الماری کھولی، اور دو فائل نکال لایا، یہ دونوں فائل کلو میاں کے تھے، ایک باغ کا، ایک مکان کا،

ارشد نے بڑے غور سے فائلوں کا مطالعہ کیا، واقعی کلو میاں کی ایک ایک بات سچی نکلی، باغ ساڑھے پانچ ہزار میں اسی شرح سود پر رہن تھا جو خان بہادر صاحب کی تھی، مکان ڈھائی ہزار پر رہن تھا اور اس کی شرح سود خان بہادر کے مقابلہ میں دو روپے سیکڑہ کم تھی،

بڑی دیر تک ارشد الٹ پلٹ کر کاغذات کا مطالعہ کرتا رہا، کبھی رکھ دیتا، کبھی پھر پڑھنے لگتا، جب کافی دیر اسی طرح گزر گئی، تو کلو میاں گھبرا اٹھے، کہنے لگے،

بیٹے مجھے دیر ہو رہی ہے، جو کچھ لکھانا ہے لکھالو، !

ارشد نے کہا۔

چچا میاں لکھانا کیا ہے آپ تشریف لے جا سکتے ہیں،

کلو میاں کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا، سراپا حیرت بن کر، ایک دیندار مسلمان کی حیثیت سے بولے،

"نہیں بیٹے لکھت پڑھت ہو ہی جانی چاہیے، کیا جانے کب میری آنکھیں بند ہو جائیں، کچھ ثبوت تو چاہیے"

ارشد نے بے پروائی اور استغنا کے ساتھ کہا،

"آپ اور ابو دوست ہیں ـــــــ ہیں نا ـــــــ؟"

کلو میاں اس حقیقت سے انکار کیونکر کر سکتے تھے،

"ہاں بھئی دوست ہیں، اور وہ بھی بچپن کے،!"

ارشد نے کاغذات سمیٹتے ہوئے کہا،

"آپ حساب دوستاں در دل کے فلسفہ سے بھی خوب واقف ہوں گے"

کلو میاں نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ ارشد نے دونوں فائلوں کے کاغذات نکالے، اور انھیں ٹکڑے ٹکڑے کر کے ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا، کلو کو یہ منظر دیکھ کر تاب نہ رہی بے ساختہ بول اٹھے،

ارے ارے یہ کیا؟ ـــــــ یہ کاغذات کیوں پھاڑ ڈالے تم نے؟

ارشد نے جواب دیا،

"چچا میاں یہ کاغذات اسی قابل تھے، نہ اماں جی آپ کی کوئی چیز رہن رکھ سکتی ہیں، نہ ابو، باغ بھی آپ کا، مکان بھی آپ کا، یہ ایک ہزار روپے قرض حسنہ کے طور پر قبول فرمایئے، جب کبھی حالات سازگار ہوں گے، یکمشت یا بالاقساط دے دیجئے گا"

کلو میاں کچھ نہ کہہ سکے با چشم پرنم ارشد کو کچھ دیر تکتے رہے پھر اُٹھے اور خاموشی سے چلے گئے'' !

کلو میاں کے جانے کے بعد سر جھکائے بڑی دیر تک ارشد بیٹھا رہا، پھر اسنے الماری بند کی، دفتر سے اٹھا۔ اور سلطانہ کے کمرے میں پہنچ گیا۔

---

(۹)

سات آٹھ روز کے بعد شیخ صاحب نے غسل صحت کیا، اور پھر دفتر میں آکر بیٹھنے لگے، چند دن تک تو انھوں نے کوئی خاص دیکھ بھال نہیں کی، آتے تھوڑی دیر بیٹھتے اور چلے جاتے، ارشد عملاً اب تک انچارج بنا ہوا تھا، ایک روز منشی جی نے کہا سال ختم ہو رہا ہے فرد حسابات مکمل ہو جانی چاہیئے، شیخ صاحب نے اجازت دے دی، کوئی دو گھنٹہ کے بعد وہ گھبرائے ہوئے آئے اور شیخ صاحب سے پوچھا،

"کیا کلو میاں کا حساب صاف ہو گیا،؟"

شیخ صاحب نہیں چاہتے تھے کہ ان کی دکھتی رگ، ارشد کے سامنے پکڑی جائے وہ اسے اپنے اور کلو میاں کے حساب کتاب سے ناواقف رکھنا چاہتے تھے، کیونکہ اس پر ظاہر یہ کیا گیا تھا کہ از راہ جود وکرم انھوں نے کلو میاں کو دور ابتلا سے نکال لیا، منشی جی کے اس بے ڈھب سوال پر وہ چکرا گئے، انھوں نے کہا۔

" ارے بھئی ہمارا اور کلو میاں کا حساب دوستاں دردل والا معاملہ ہے، نہیں صاف ہوا صاف ہو جائے گا، آپ اس کی فکر نہ کریں،"

منشی جی نے بڑے غور سے یہ باتیں سنیں پھر فرمایا،

"جی ہاں یہ تو ٹھیک ہے، کیا مجھے معلوم نہیں کہ آپ کے اور کلو میاں کے تعلقات کتنے گہرے اور پرانے ہیں، !"

شیخ صاحب نے ارشد پر رعب ڈالنے کے لیے پوچھا،

"پھر آپ کو ایسا بے تکا سوال کرنے کی کیا ضرورت تھی ؟"

منشی جی کو شیخ صاحب کی اندرونی کیفیت کا کیا علم، ؟ انھوں نے صاف صاف عرض کر دیا،

"ضرورت تو کچھ بھی نہیں، لیکن چونکہ فائل خالی پڑا تھا، اس لئے پوچھ لیا میں نے ورنہ بات تو کچھ بھی نہ تھی، آپ کا اور ان کا حساب دوستاں دردل والا سلسلہ ٹھہرا، میں بیچ میں دخل در معقولات کرنے والا کون ؟

فائل خالی پڑا ہے یہ سن کر شیخ صاحب کے کان کھڑے ہوئے، سراسیمگی کے عالم میں دریافت کیا،

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ ـــــــ کیا کلو میاں کے فائل
آہنی الماری میں نہیں ہیں؟"

"جی ہیں تو، لیکن ـــــــ"

"لیکن کیا؟ بتایئے صاف صاف کیا بات ہے؟"

"فائل خالی ہیں، ـــــــ ان میں کاغذات نہیں ہیں! "

"(بہت زیادہ پریشان ہو کر) یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کہیں ادھر ادھر
ہو گئے ہوں گے پھر سے دیکھئے جا کر! "

"صاحب میں نے اچھی طرح دیکھ لیا ہے، مجھے اچھی طرح یاد ہے
میں نے اپنے ہاتھ سے وہ کاغذات فائل میں نتھی کئے تھے، ـــــــ
مگر اب نہیں ہیں! "

"(پیتا بانہ کھڑے ہو کر) دماغ کی طرح آپ کی آنکھیں بھی کمزور
ہیں، ـــــــ پھر دیکھئے جا کر ایک دفعہ!"

منشی جی نے ایک دفعہ پھر دیکھنے کے لئے قدم اٹھایا ہی تھا کہ ارشد
بول پڑا،

"ابو وہ کاغذات واقعی الماری میں نہیں ہیں! "

شیخ صاحب منشی جی کو چھوڑ کر ارشد کی طرف پلٹے،

"تو کیا ہوئے؟ ـــــــ کیا دیمک چاٹ گئی انھیں؟"

"جی نہیں، بیکار تھے، میں نے ضائع کر دیئے! "

شیخ صاحب کے سینہ پر گھونسہ پڑا، بے انتہا مضطرب ہو کر

سوال کیا،

"بیکار تھے؛ تم نے ضائع کر دئے؟"

ارشد نے سادگی کے ساتھ جواب دیا،

"جی اور کیا، ——"

دفور غضب سے شیخ صاحب بید لرزاں کی طرح کانپ رہے تھے لیکن ضبط کرنے کی بھی انتہائی کوشش کر رہے تھے،

"لیکن بیٹے، وہ کوئی معمولی کاغذات تو نہیں تھے، بھلا لین دین کی دستاویزیں ضائع کر دینا کون سی دانشمندی ہے؟"

ارشد نے اسی ادب اور سعادتمندی سے جواب دیا،

"لین دین کے تو سارے کاغذات بدستور موجود ہیں ——"

شیخ صاحب نے بے انتہا ضبط کرنے کے باوجود ذرا بلند آواز سے پوچھا،

"تم نے یہ فیصلہ کس طرح کر لیا کہ وہ کاغذات بیکار تھے، اور اس قابل تھے کہ ضائع کر دئے جائیں، پھر تم نے فائلوں کی شوئل کیوں کی؛ میں نے تمھیں اپنا جاسوس بنا کر تو نہیں بھیجا تھا کہ میری عدم موجودگی میں تلاشی لے ڈالو، میرے دفتر کی، تمہارا کام تو صرف یہ تھا کہ جو روپیہ آئے اس کا اندراج کر لو، اور تجوری میں رکھ دو، اس حد سے تم نے قدم آگے کیوں بڑھایا؛ —— کس کے حکم سے یا کس کی اجازت سے؟" ——

ارشد نے سراپا ادب بن کر جواب دیا،

"بات یہ ہوئی کہ کلو میاں آئے تھے، ـــــــ

"کیوں آئے تھے ؟"

"ایک بہت ضروری کام سے ؟"

"کیا کام تھا وہ ؟"

"وہ چاہتے تھے کہ پانچ سو روپے انھیں اور دے دئے جائیں، اس کے معاوضہ میں وہ اپنا آدھا مکان ہمیشہ کے لئے دینے کو تیار تھے"!

"چہ خوش، دامن پکڑتے پکڑتے پہونچا پکڑنے لگے، اس کھنڈر کے نصف حصہ کی قیمت تین ہزار ؟"

"اگر وہ مکان تو بہت قیمتی ہے، خود آپ کئی مرتبہ فرما چکے ہیں"!

"میری تو عادت ہے جھک مارا کرتا ہوں، میرے قول سے دلیل لانا حماقت ہے، ـــــــ ہاں پھر"

"مجھے آپ سے اور امی سے یہ معلوم ہوا تھا کہ پرانی دوستی کا لحاظ کرکے یہ رقم آپ نے انھیں بطور دوستانہ عطیہ کے دی ہے، یہی میں نے باغ کے متعلق بھی سنا تھا، ـــــــ"

"آدمی ترنگ میں آکر نہ جانے کیا کچھ کہہ ڈالتا ہے، کیا وہ سچ ہوتا ہے ؟"

"میرا تو یہ عقیدہ ہے آپ غلط بیانی نہیں کر سکتے"!

"جی شکریہ آپ کی اس عقیدت مندی اور قدر افزائی کا، ورنہ میں اول درجہ کا جھوٹا، اور بیہودہ شخص ہوں ـــــــ اچھا صاحب

وہ یہ تجویز لے کر آئے، اور آپ کو یہ واقعہ معلوم ہوا، آ گئے، ؟"

"چونکہ ان کی مالی حالت بہت سقیم تھی، میں نے انھیں ایک ہزار روپیہ دے دیا، اور وہ کاغذات پھاڑ کر پھینک دئے، !"

شیخ صاحب کا جلال نقطۂ عروج پر پہنچ گیا۔ پھر پھنچتے ہوئے بولے،

"ابے اُلّو کے پٹھے تو نے ایک ہزار روپیہ گن دیا، اور وہ کاغذات پھاڑ کر پھینک دئے، ؟"

ارشد نے اسی متانت اور سنجیدگی سے کہا،

"جی ہاں، ——— بغیر اس کے میرا ضمیر مطمئن نہیں ہو سکتا تھا، !"

"ابے ضمیر کے بچے، بکتا کیا ہے؟ ——— کیوں نہیں مطمئن ہو سکتا تھا تیرا ضمیر؟"

ان کاغذات پر جب بھی میری نظر پڑتی، کانٹا سا کھٹکتا میرے دل میں، مجھے ایک اَن ہونی بات پر یقین کرنا پڑتا، مجھے یہ بات ماننی پڑتی کہ آپ نے اپنی رفیقۂ حیات اور میری ماں کو فریب دیا، آپ نے مجھ سے غلط بیانی کی، اپنے باپ کے لئے یہ تصور بھی میرے لئے ناممکن تھا، !

"باپ کا بچہ، ——— نمک حرام خبیث، !"

شاید شیخ صاحب کی گالیوں کا مینھہ ابھی کچھ دیر اور برستا، لیکن دفعتہً انھیں مایوسی کے اندھیرے میں امید کی روشنی نظر آئی، انھوں نے سوال کیا،

"کیا وہ کاغذات تو نے کلو کے سامنے پھاڑے تھے؟ ـــــــ جلدی بتا جلدی سے، اسی جواب پر میرا اور تیری قسمت کا فیصلہ منحصر ہے، ــــــــ"

ارشد نے جواب دیا، !

"جی ہاں کلو میاں کے سامنے ہی میں نے وہ کاغذات ضائع کر دئے تھے، !"

"اور اس ایک ہزار کی رسید؟"

"وہ تو میں نے نہیں لی'!"

"ناخلف کیوں؟ ــــــ کیوں نہیں لی؟"

"یہ رقم قرض حسنہ کے طور پر میں نے انھیں دی ہے، جب حالات سازگار ہوں گے واپس کر دیں گے، ورنہ ـــــــ"

"ورنہ معاف، ! کیوں بے لفنگے؟"

"قرض حسنہ کا مقصد تو یہی ہوتا ہے، !"

شیخ صاحب سر پکڑ کر بیٹھ گئے، کچھ دیر تک مراقبہ میں رہے پھر سر اٹھایا اور پوچھا،

"کیا میری زندگی میں تو میرا، اور میری جائداد کا مالک بن گیا؟"

"خدا آپ کو قیامت تک زندہ رکھے، بس آپ کا خادم ہوں، غلام ہوں، رہی آپ کی جائداد، تو وہ اب بھی آپ کی ہے اور ہمیشہ آپ کی رہے گی، نہ میرا اس سے کوئی تعلق ہے، نہ کبھی

رہے گا، میں ملازمت کر لوں گا، مگر اس جائداد سے کوئی سروکار نہیں رکھوں گا۔ !"

"کیا کہنا ہے حضور کے زہد و تقویٰ کا، پارسائی کا، آپ کو تو کسی خانقاہ میں پیدا ہونا چاہیئے تھا، مجھ بدبخت پر کیوں کرم فرمایا۔ !"

"ابو میں تسلیم کرتا ہوں کہ مجھے وہ کاغذات ضائع نہ کرنے چاہیئے تھے، کلو میاں کو ایک ہزار کی رقم دے کر بھی میں نے غلطی کی، لیکن یہ غلطی صرف اس لئے کی کہ آپ پر گناہ نہ ہو، !"

"پھر تو نے بکواس شروع کی؟ جانتا ہے، گناہ کسے کہتے ہیں؟ محنت سے روزی کمانا گناہ ہے؟"

"وہ تو ثواب ہے، البتہ ناجائز طور پر لوگوں سے روپیہ وصول کرنا یقیناً گناہ ہے، !"

"تو کیا میں ڈاکو ہوں، چور ہوں، رہزن ہوں،؟"

"لیکن ابو، ڈاکو، چور اور رہزن کے لئے بھی اللہ نے وہ الفاظ استعمال نہیں کئے ہیں، جو سود لینے والوں کے لئے کئے ہیں، !"

"(جلال میں آکر) تو جھوٹا ہے، لعین ہے، ناخلف ہے، !"

ارشد نے کوئی جواب نہیں دیا، دفعتہً ایک مرتبہ پھر شیخ صاحب بادل کی طرح گرجے،

"میں نے تجھے عاق کیا، !"

ارشد نے کوئی جواب نہیں دیا، شیخ صاحب نے فرمایا۔

"اب تو اس گھر میں ایک منٹ بھی نہیں رہ سکتا، اب تیری اس گھر میں کوئی گنجائش نہیں ہے، اب اس گھر کے دروازے ہمیشہ کے لئے تیرے اوپر بند کئے جاتے ہیں، بس تیری صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتا، دور ہو جا میرے سامنے سے، نکل جا میرے گھر سے محنت کر، مزدوری کر، نوکری کر، جو تیرا جی چاہے کر، مجھ سے تیرا کوئی واسطہ نہیں، یہ جائداد لٹا دوں گا، خیرات کر دوں گا، غیروں کو بانٹ دوں گا، مگر تجھے اس سے ایک حبہ بھی نہیں مل سکتا، ایسا ہی سخاوت کا شوق ہے تو خود کما اور اپنی کمائی ہوئی رقم میں سے، ہزار، ہزار، دس دس ہزار کے توڑے، کلو بیاں کو، اور ان جیسے دوسرے مفت خوروں کو تقسیم کر" !!

شیخ صاحب کی اس تقریر دل پذیر کے جواب میں، ارشد نے کچھ نہیں کہا، وہ سر جھکائے کھڑا رہا، شیخ صاحب کو اس وقت اپنے اکلوتے بیٹے کی صورت زہر لگ رہی تھی، ان کا بس چلتا تو اس کا گلا گھونٹ دیتے، اسے مار ڈالتے، بیٹھے بٹھائے اس ناخلف اور نالائق نے نو دس ہزار کی چوٹ دے دی، چند دنوں میں اس کے یہ جوہر سامنے آ گئے، اگر چند ہفتوں تک یہ دفتر کا انچارج بنا رہتا تو شاید سب کچھ لٹا چکا ہوتا، یہ سوچ سوچ کر شیخ صاحب کے غصہ کا پارہ چڑھتا جا رہا تھا، انھوں نے حقارت، اور نفرت سے

بھرپور ایک نظر اپنے نالائق بیٹے پر ڈالی اور سوال کیا،

"اور بھی کسی کو کچھ رقم دی ہے تو نے ——— ؟"

ارشد نے جواب دیا،

"جی نہیں"!"

جل کر شیخ صاحب نے فرمایا،

"جی نہیں، ——— وہ تو خیریت ہوئی کہ چند دن سے زیادہ بچہ سقہ کو بادشاہی کرنے کا موقعہ نہیں ملا، اگر دو چار پہلے مجھے بستر پر پڑا رہنا پڑتا، تو شاید تالے کنجی کے سوا کچھ بھی مجھے نہ ملتا، حاتم طائی صاحب سب کچھ لٹا چکے ہوتے، ——— مردود"!"

شیخ صاحب نے کنجیوں کا گچھا اٹھایا اور گھر جانے کے لیے دفتر سے باہر نکلے، ارشد اب تک کھڑا تھا، اس سے جھنجلائے ہوئے لہجہ میں کہا۔

"آخر اپنا منہ کالا کیوں نہیں کرتا؟ جاتا کیوں نہیں یہاں سے؟ کیوں اپنا منحوس چہرہ لیے کھڑا ہے؟"

اور پھر جواب کا انتظار کیے بغیر وہ زنان خانے میں چلے گئے ارشد کچھ دیر اسی طرح کھڑا رہا، پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا باہر نکلا اور کسی طرف چلا گیا،!

(۱۰)

شیخ صاحب پیکر قہر و جلال بنے گھر میں پہنچے اور فوراً ہی زبیدہ بانو کے پیچھے پنجے جھاڑ کے پڑ گئے،

"دیکھ لئے اپنے لال، اور اپنے چاند، اور اپنے فرزند دلبند کے کرتوت؟ ہو گئیں خوش؟"

زبیدہ بانو کی سمجھ میں خاک نہ آیا کہ اس تقریر کا مطلب کیا ہے، وہ ذرا چڑتی ہوئی بولیں،

"تم تو جب سے بیمار پڑے ہو کچھ سودائی ہو گئے ہو، جب دیکھو ہاتھ میں طمنچہ لئے کھڑے ہیں، کسی سے کوئی بات ہوئی اور یہاں پارہ چڑھا،

باہر نہ جانے کس سے لڑ آئے، اور یہاں آکر میرا بھیجہ کھانے لگے، ــــ"

اتنی لمبی تقریر سننے کی یہ شیخ صاحب میں تاب کہاں تھی؟ لیکن چونکہ وہ خود دل ہی دل میں ایک ایسی ہی لمبی چوڑی تقریر کی تیاری کر رہے تھے لہذا چپ رہے، اور جیسے ہی وہ تقریر تیار ہوگئی بول پڑے،

" جناب زبیدہ بانو صاحبہ میں کسی سے لڑ کر نہیں آیا ہوں، آپ کے قدموں پر اپنا سر پھوڑنے آیا ہوں، شوق سے مجھے سودائی کہیئے، یہ کہہ دیجئے میں سٹھیا گیا ہوں، لیکن خدارا میری فریاد تو سن لیجئے، کچھ خبر ہے مجھ بدنصیب اور آشفتہ حال پر کیا گزری ان چند دنوں میں؟ میں لٹ گیا، میں برباد کر دیا گیا، دس ہزار کی رقم خطیر مجھ سے چھین لی گئی، میری دستاویزیں پھاڑ دی گئیں، میری تجوری خالی کر دی گئی، کیا میں اسی سلوک کا مستحق تھا؟ کیا میری جان ناتواں اسی سلوک کی سزاوار تھی! ـــ ہائے کتنے خوش نصیب ہیں وہ جو مر گئے، کتنا بدنصیب ہوں میں کہ زندہ ہوں ــــــ موت آتی ہے پر نہیں آتی، زبیدہ میں زہر کھا لوں گا، میں زندہ نہیں رہوں گا، میں نے یہ دولت اس لئے جمع نہیں کی ہے کہ میری آنکھوں کے سامنے وہ کنکر پتھر کی طرح پھینک دی جائے، ـــــــ

زبیدہ بانو کا پیمانۂ صبر بھی آخر چھلک پڑا،

توبہ ہے میں کہتی ہوں ہوا کیا؟ یہ بھی تو بتاؤ، کس نے تمہاری تجوری لوٹ لی؟

ایک ٹھنڈی سانس بھر کر، اور سینہ پر بڑے زور سے ظاہر میں لیکن

آہستہ سے گھونٹ مارتے ہوئے، بھرائی ہوئی آواز میں کہا،

"کیا وہ کام، برخوردار، سعادت اطوار، میاں ارشد سلمہٗ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کا بھی ہو سکتا ہے؟"

زبیدہ کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا،

کیوں واہی تباہی باتیں کرتے ہو؟ ——— ارشد کو کیا غرض پڑی ہے دس ہزار روپے اڑانے اور تمھاری تجوری توڑنے کی؟ نہ وہ جواری نہ شرابی، نہ ریس سے دلچسپی، نہ رنگ رلیوں سے، اتنا نیک اور سیدھا لڑکا تو چراغ لے کے ڈھونڈھو گے مگر نہیں ملے گا!"

شیخ صاحب نے ایک آہ سرد کے ساتھ فرمایا،

"کاش وہ شرابی ہوتا، کاش وہ جواری ہوتا، کاش وہ ریس کھیلتا ہوتا، کاش اس کے دن رنگ رلیوں میں کٹتے ہوتے، کاش اس کی راتیں عیش و طرب میں بسر ہوا کرتیں"

"اے ہٹو، تمھارے منہ میں خاک، وہ کیوں کرتا ایسی حرکتیں؟"

"زبیدہ بانو خدا کی قسم اگر ان علتوں میں مبتلا ہوتا تو مجھے غم نہ ہوتا، شراب پی کر، جوا کھیل کر، عیش پرستی کر کے، کم از کم وہ ذہنی سکون تو حاصل کرتا، کم از کم اسے تفریح تو ہوتی، کم از کم اس کا دل تو خوش ہوتا لیکن وہ بقول تمھارے بڑا نیک ہے سیدھا سادھا ہے بھولا بھالا ہے، مگر باپ کو تو تباہ کئے دے رہا ہے"!"

"میں پوچھتی ہوں کس طرح تباہ کیا اس نے یہ بھی تو کہو؟"

"میں نے کلو میاں کا باغ ساڑھے پانچ ہزار میں رہن رکھا، وہ دستاویز تمھارے بیٹے نے ردی کاغذ کی طرح پھاڑ دی، میں نے کلو میاں کا مکان ڈھائی ہزار میں گرو رکھا تھا، وہ کاغذ فرزند دلبند نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، تجوری میں روپے رکھے ہوئے تھے، اس میں سے ایک ہزار روپیہ قرض حسنہ کے طور پر حاتم وقت ارشد میاں نے کلو کے نیچے کر دے دیا، خدارا انصاف کرو، مجھ پر میرے بیٹے کے ہاتھوں ظلم ہوا ہے یا نہیں؟"

"خیر ایک ہزار روپے والی بات تو میری سمجھ میں نہیں آئی، لیکن تم نے تو مجھ سے کہا تھا اور میں نے بھی یہی رائے دی تھی کہ کلو میاں کو یہ رقم، عطیہ اور تحفہ کے طور پر دی جائے گی، ——— کیا تم جھوٹ بھی بولتے ہو؟ کہتے کچھ ہو، کرتے کچھ ہو؟"

"ہاں صاحب میں جھوٹا ہوں، بہت برا شخص ہوں، اس سے بڑھ کر برائی کیا ہو سکتی ہے کہ اپنا محنت سے کمایا ہوا روپیہ لٹاتا نہیں پھینک نہیں دیتا، خدا کی بندی اس زمانہ میں تو پانی بھی مفت نہیں ملتا، روپیہ کون دیدے گا کسی کو؟"

"تو پھر اعلان کیوں کیا تھا اس زور شور سے؟"

"وقت گزاری کے لئے، اس نالائق اور ناخلف کو راہ راست پہ لانے کے لئے، خان بہادر کو خوش کرنے کے لیے، سلطانہ کو بیاہ لانے کے لئے، ——— اگر میں جھوٹ نہ بولتا، تو خان بہادر

راضی ہو جاتے؟ سلطانہ تمہاری بہو بن کر اس گھر میں آتی، ؟ اور وہ لڑکا جو شادی پر تیار ہوتا وہ تو صاف انکار کر چکا تھا، میرے اور تمہارے دونوں کے منہ میں کالک چکا تھا، !"

"پھر بھی جھوٹ تو نہیں بولنا چاہیئے تھا،"

"بے شک جھوٹ بولنا برا ہے اور میں نے جھوٹ بول کر غلطی کی، لیکن کیا یہ اتنا بڑا جرم ہے کہ ایسی سنگین سزا دی جائے، جو صاحبزادے نے اپنے بوڑھے باپ کو دی ہے؟"

زبیدہ بانو نے بگڑ کر جواب دیا،

"اونہہ کان پک گئے تمہاری یہ واہی تواہی! باتیں سنتے ہوئے، بہر حال کلو میاں کے جو کاغذات پھاڑے گئے ہیں وہ ٹھیک ہے میں نے پہلے ہی کہدیا تھا یا چند ہزار روپے سے ہاتھ دھو بیٹھا سلطانہ کے لاکھوں سے، اور تم نے میری بات مان بھی لی تھی، لہذا اس رقم کا نہ غم کرو، نہ ذکر، جھوٹ بول کر خود بھی ذلیل ہوئے، اور مجھے بھی ذلیل کیا لڑکے کی نگاہ میں، باقی رہا وہ ہزار روپیہ جو قرض حسنہ کے طور پر ارشد نے کلو میاں کو دیا ہے، وہ مجھ سے لے لینا، لیکن یہ بک بک ختم کرو، ہر وقت میں اپنے لڑکے کی برائیاں نہیں سن سکتی، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے دشمنی ہو گئی ہے تمہیں اس سے،!"

شیخ صاحب نے بھی جھلا کر کہا،

"ہاں مجھے دشمنی ہو گئی ہے اس سے۔ میں نے عاق کر دیا ہے اسے،

میں اس کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتا، میں نفرت کرنے لگا ہوں اس ناخلف سے، میں نے کہہ دیا اس گھر کے دروازے ہمیشہ کے لئے آج سے بند کئے جاتے ہیں اس پر"

اس سے زیادہ زبیدہ بانو نہ سن سکیں، انھوں نے بگڑے ہوئے تیور کے ساتھ کہا،

"یہ گھر میرا ہے اس کے دروازے کون بند کر سکتا ہے، !"

پھر ماما کو آواز دی، اور اس سے کہا،

"جا ارشد کو فوراً اپنے ساتھ لے کر آ !"

ماما چلی گئی، تو شیخ صاحب نے اور زیادہ برہمی کے عالم میں فرمایا،

"یہ ماننا نہیں حماقت ہے، تمھیں چاہیئے کہ میرا ساتھ دو، تاکہ وہ سدھر جائے۔ !"

زبیدہ نے ڈھلکے ہوئے دوپٹے کو سر پر ٹھیک سے رکھتے ہوئے کہا۔

"تم پر اس کا سایہ پڑ جائے تو آدمی بن جاؤ، ——— بڑے چلے ہیں اسے سدھارنے، !"

تاؤ میں آکر شیخ صاحب کچھ فرمانے والے تھے، کہ ماما آتی نظر آئی، اسے آتا دیکھ کر زبیدہ بانو دو قدم آگے بڑھ کر استقبال کے لئے گئیں،

"ارشد کہاں ہے؟"

ماما نے ایک چھوٹا سا کاغذ کا پرزہ بڑھا دیا، خیراتی (ملازم) کو یہ پرچہ دے گئے ہیں، بیبیا،

پرچہ کا نام سنکر شیخ صاحب کے کان بھی کھڑے ہوئے، وہ لپک کر بیوی کے پاس آ گئے اور میاں بیوی نے ساتھ ساتھ پڑھنا شروع کیا،

"امّی! ابّو کا حکم بجا لانا میرا فرض ہے،
انھوں نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں فوراً
اس گھر سے رخصت ہو جاؤں ————
— الوداع، !!"

خط پڑھ کر زبیدہ بانو کو چکر آ گیا، اور خود شیخ صاحب بھی چکرا گئے، یہ بات ان کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھی کہ اتنی سعادت مندی کے ساتھ ارشد تعمیل حکم کرے گا، لیکن اب تیر کمان سے نکل جا چکا تھا، ہکا بکا کھڑے زبیدہ کو تکتے لگے ایک مجرم کی طرح، زبیدہ نے نفرت سے بھری ہوئی ایک نظر ڈالی اور کہا،

"قصائی ————

اور پھر بیہوش ہو کر پختہ فرش پر گر پڑی، ماما کی واویلا نے سارے گھر میں سوگ کی سی کیفیت طاری کر دی، جلدی جلدی زبیدہ بانو بستر پر

ٹائی گئیں، ڈاکٹر کو فون کیا گیا، اور گھر کا ہر شخص خواہ وہ ملازم ہو، یا عزیز اور رشتہ دار، کھا جانے والی نظروں سے شیخ صاحب کو گھورنے لگا،

شیخ صاحب اب دوہرے مجرم تھے، ارشد کو انھوں نے روپوش ہوجانے پر مجبور کردیا، اور زبیدہ بانو کو نیم جاں بنا دیا،!

گردشِ آسماں

(۱)

گردش آسماں، ـــــــ بھلا گردش زمانے کی کسے دیتی ہے چین انشا!
اس گردش آسماں نے احمد نگر کے اس مختصر سے لیکن شاندار باوقار کنبہ کی بنیاد متزلزل کر دی، جسے شرفو میاں نے بڑے ٹھاٹھ، اور بڑی شان سے زندہ رکھا تھا، !

جس کی تعمیر و تشکیل اور تخلیق پر کئی نسلیں صرف ہوئی تھیں،

پشت سے آباد اجداد اور اسلاف اکرام کے مرنے کے بعد، یہ کنبہ عالم وجود میں آیا تھا، !

اور یہ کنبہ اپنے روایات پر، اپنے اصولوں پر، اپنے معیار حیات پر، اپنے بنائے ہوئے اقدار زندگی پر بڑی سختی سے قائم تھا،

ستر فو میاں کی کنبہ پرستی نے اسے اور زیادہ بام عروج پر پہنچا دیا تھا، گو وہ مسلمان تھے، اور قرآن و حدیث کے قائل تھے، لیکن، "بزرگوں" سے جو ریت رسم چلی آرہی ہو، اس کے سامنے قرآن و حدیث کو معطل کر دینے میں بھی تامل نہیں کرتے تھے، ان کا ایمان پہلے اپنے اسلاف و اجداد پر تھا، پھر قرآن و حدیث پر"!

لیکن اب ستر فو میاں مر چکے تھے"!

اور ستر فو میاں کے صرف چھ ماہ بعد نعیمہ بھی اس دنیا سے رخصت ہو گئی"!

اور ان دونوں کے مرتے ہی انقلاب عظیم آگیا"!

کنبہ اب بھی قائم تھا، اس کے روایات و اقدار میں اب بھی کوئی فرق نہیں آیا تھا، اس کے اصول اور معیار میں بھی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی، اس کی شان اور تمکنت میں بھی فرق نہیں آیا تھا، وہی جاہ و جلال وہی دولت کی ریل پیل، وہی رکھ رکھاؤ، ——— لیکن حقیقت یہ ہے کہ ستر فو میاں کے بعد یہ خاندان کھوکھلا ہو گیا،

اور خاندان کی بنیادوں کو متزلزل کرنے، اور اسے کھوکھلا کرنے کی سعادت قدرت کے قلم نے افرادِ اظہار کے لئے لکھ دی تھی"!

باپ کی زندگی تک تو یہ لوگ صرف پیچ و تاب کھاتے رہے"!

لیکن باپ کے مرنے کے بعد میدان صاف تھا، اب یہ سب کچھ کر سکتے تھے، اب کوئی ان کا ہاتھ پکڑنے والا نہ تھا"!

دہی حویلی جو ٹھاٹھ باٹھ میں پہلے بھی کچھ کم نہ تھی۔ اب ایک ماڈرن کوٹھی میں تبدیل ہو چکی تھی۔ پہلے انوار و اظہار صرف موٹر سائیکل پر گزر کرتے تھے، اب دونوں کے پاس دو دو موٹریں تھیں، ایک اپنے لئے ایک بیوی کے لئے۔ شام کو موٹر میں بیٹھ کر میاں بیوی نکل جاتے۔ دیہات اپنے تھے۔ گاؤں اپنے تھے، علاقہ اپنا تھا، جدھر سے سواری گزرتی ایسا معلوم ہوتا شاہ جمجاہ کی سواری باد بہاری آرہی ہے، کسان اور کاشتکار اپنے مالک کو دیکھ کر کام چھوڑ دیتے، اور صف بستہ کھڑے ہو جاتے، اور یہ شاہ والا جاہ اپنے ان غلاموں پر ایک نظر غلط انداز ڈالتے ہوئے، صبا رفتار موٹر پر رواں دواں سے گزر جاتے ان بیچاروں کا سلام بھی نہ قبول کرتے، !

خدا بخشے جب تک شرفو میاں زندہ تھے، دوست احباب بھی آتے تھے، اور اعزا و اقربا بھی، اور ان کی دعوتیں بھی اعلیٰ پیمانے پر ہوتی تھیں، شرفو میاں بڑے اچھے شکاری تھے، اکثر شکار کو نکل جاتے، اور نہ جانے کیا کیا شکار کر لاتے، پھر شکار کا گوشت پکتا اور تقسیم ہوتا۔

لیکن اب یہ ریت بدل گئی تھی، انوار و اظہار کو شکار سے کوئی خاص شوق نہ تھا۔ لیکن دعوتیں پہلے سے زیادہ شاندار اور اعلیٰ پیمانے پر ہونے لگیں، ایک ایک دعوت میں کئی کئی سو روپے خرچ ہو جاتے، آج کلکٹر صاحب مدعو ہیں، کل کمشنر صاحب کی دعوت ہے،

پرسوں فلاں وزیر صاحب ادھر سے گزر رہے ہیں، ان کی دعوت ہے، کسی دن ضلع کے سپرنٹنڈنٹ پولیس ادھر آ نکلے، بھلا حویلی کے سوا کہاں ٹھہر سکتے ہیں، ہو رہی ہیں دعوتیں، کسی دن تحصیل دار صاحب دورہ کرتے ہوئے گزر رہے، حویلی ان کے لئے نہایت شاندار مہمان خانہ بن گئی۔ کلکٹر اور کمشنر عام طور پر انگریز ہوتے تھے، ان کے لئے خاص طور پر انگریزی کھانا پکانا والے باورچی منہ مانگے دام دے کر بلائے جاتے تھے، اور شکار بھی کرایا جاتا تھا، سپرنٹنڈنٹ صاحب اور تحصیلدار صاحب دیسی ہوتے تھے، کبھی ہندو، کبھی مسلمان، ان کی بھی آؤ بھگت ہوتی تھی، اور کہیں وزیر صاحب آ نکلے تو گویا جنگل میں منگل کا سماں ہو گیا!

اس طرح ہر مہینے میں ہزاروں روپے صرف ہو جاتے تھے، فہمیدہ یہ منظر دیکھتی تھی تو سر پیٹ لیتی، شرفو میاں یہ اللّے تللّے دیکھتے تو خودکشی کر لیتے، لیکن نہ اب فہمیدہ تھی، نہ شرفو میاں،

حویلی میں بہت سی تبدیلیاں عمل میں آ گئیں، اب یہ ایک پرانے طرز کی حویلی نہ تھی، ایک جدید قسم کی نہایت شاندار کوٹھی تھی - ان تبدیلیوں میں نہ قمر کی رائے شامل تھی، نہ اجازت، حالانکہ اصل مالک وہی تھی!

اظہار اور افواد نے باپ کی زندگی میں بہت کوشش کی کہ ہبہ نامہ بدل دیا جائے، لیکن کامیاب نہ ہو سکے، بہن سے لڑے، ماں سے لڑے، باپ سے لڑے، مگر دال گلی نہیں، قمر کا جہاں تک تعلق تھا،

وہ ہر وقت اس کے لئے تیار تھی کہ سب کچھ بھائیوں کو دے دیا جائے اسے دو روٹیوں اور چند گز کپڑے کے سوا درکار ہی کیا ہے، لیکن نہ شرفو میاں اس پر تیار ہوئے نہ نعیمہ!

ماں باپ کے انتقال کے بعد سے اظہار اور انوار کے رویہ میں فرق آ گیا تھا، اب یہ پہلے سے زیادہ سعادت مند اور باادب ہو گئے تھے، اس تغیر کو قمر نے تو بھائیوں کی محبت پر محمول کیا، لیکن دلاری تاڑ گئی، اسے اس تپاک اور اخلاق میں دال کے اندر کچھ کالا کالا نظر آتا تھا، اس نے کئی مرتبہ قمر کے سامنے یہ بات کی بھی، لیکن اس نے ہنس کر ٹال دی،

"تو تو پگلی ہے اچھی خاصی ——— چل ہٹ"!

وہ خاموش ہو گئی،

لیکن اظہار اور انوار کی بیویوں، یعنی سلمیٰ اور ناہید کا رویّہ اپنے شوہروں کے بالکل برعکس تھا، یہ قمر کی اہمیت کو ذرا بھی محسوس نہیں کرتی تھیں۔ بلکہ اس سے سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتی تھیں، اظہار اور انوار ایک بچہ اور ایک بچی کے باپ بن چکے تھے، قمر کو ان دونوں بچوں سے بڑی محبت تھی، وہ چاہتی تھی، انھیں اپنے پاس رکھے، خود ہی ایک ماں کی طرح انھیں پالے پوسے، پھر جب یہ سیانے ہو جائیں، تو ان کی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ کرے، لیکن یہ بات نہ سلمیٰ کو منظور تھی نہ ناہید کو، دونوں میں سے کسی نے انکار تو نہیں کیا، ... طرز عمل سے قمر نے محسوس کر لیا کہ ایسا نہیں ہو سکتا، خاموش ہو رہی،

بھائیوں سے گلہ تک نہیں کیا۔

منشی ابو محمد نہایت ایمانداری اور باقاعدگی کے ساتھ کام کر رہے تھے، انھوں نے سٹر فومیاں کی خدمت اتنی وفاداری، اتنی استعداد اور اتنے جوش خروش سے نہیں کی تھی، جتنی اپنی آقازادی کی کر رہے تھے۔ بینک بیلنس میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ علاقہ کی حالت بہت اچھی تھی، خوب پیداوار ہوتی تھی، اور اچھے داموں پر فروخت ہوتی تھی، روئی، گیہوں، آمدنی کے خاص ذرائع تھے۔ اور ان ذرائع نے اس کی دولت میں خاصا اضافہ کر دیا۔ خود منشی صاحب بھی طبعاً ظالم و سنگ دل نہیں تھے، لیکن قمر کی خاص طور پہ تاکید تھی کہ دیکھیے خبردار کسی کاشتکار یا مزارع پر کسی طرح کی زیادتی نہ ہونے پائے۔ مجبوری کا خیال رکھا جائے۔ ان کو مہلت دی جائے۔ ضرورت ہو تو ان کی مدد بھی کی جائے۔ ان ہدایات پر ابو محمد سختی سے عمل کرتے تھے۔ اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ کاشتکار، اور کسان دل سے اپنی "مالک" کو دعا دیتے تھے۔ بہت زیادہ محنت اور جوش کے ساتھ کام کرتے تھے۔ جتنی زمین میں دوسروں کے ہاں ایک من کی پیداوار ہوتی تھی، اتنی ہی زمین میں قمر کے ہاں، ڈیڑھ من کی پیداوار ہوتی تھی، سب اس سے خوش تھے، سب اس کے گن گاتے تھے۔

کبھی کبھی وہ اپنے علاقہ کے دورے پر بھی نکل جاتی تھی، منشی ابو محمد، دلاری، اور کئی دوسرے ملازم ساتھ ہوتے، جدھر

انوار نے پھر لقمہ دیا، "خاندانی انگریز ہے، اور پشت ہا پشت سے شکر ہی کا کاروبار کر رہا ہے، لندن میں، کناڈا میں، آسٹریلیا میں، پیرس میں، جتنی شوگر ملیں ہیں، کسی کا ڈائرکٹر ہے، کسی کا ایڈوائزر، منہ مانگے داموں پر لوگ ظالم کو بلاتے ہیں، اور خاطر خواہ فائدہ اٹھاتے ہیں،!"

وہ کہنے لگی، "یہ تمہیں کہاں مل گیا؟"

یہ ذرا چبھتا ہوا سوال تھا، لیکن انوار و اظہار کی ذہانت ہر جواب کے لئے تیار تھی، انوار نے کہا،

"بیچارے کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ بڑی محبت تھی اسے اپنی بیوی سے، اولاد کوئی تھی نہیں، جس سے دل بہلتا نتیجہ یہ ہوا کہ اس غم میں پاگل ہو گئے۔ اب اچھے ہوئے ہیں، تو ڈاکٹروں کی ہدایت کے مطابق سیر و سیاحت پر نکلے ہیں، کہ شاید اسی طرح غم غلط ہو جائے،!"

اظہار نے بتایا، "وہ تو ہمارے ملک کا مختصر سا دورہ کر کے مصر جا رہے تھے، وہ ملک انھیں پسند ہے، لیکن ایک دوست کی وساطت سے معاملہ بن گیا، اور وہ اس پر تیار ہو گئے ہیں کہ ایک سال رہ کر تمام مشینیں اپنے سامنے فٹ کرا کے اور مل چالو کر کے جائیں گے، ———"

انوار نے مزید روشنی ڈالتے ہوئے کہا۔

"تنخواہ تین ہزار روپے مہینہ طے ہوئی ہے جناب،!"

اظہار نے مزید تفصیل پیش کر دی،

"موٹر، بنگلہ، ملازم، اور مصارف قیام و طعام، مل کے ذمے،!"

قمر سوچتی ہوئی بولی "اس طرح تو ساڑھے چار ہزار ماہوار کے قریب بیٹھے گا، !"

دونوں بھائیوں نے بیک آواز تائید کرتے ہوئے کہا،

"ہاں اور کیا، ـــــــ لیکن اتنا قابل تجربہ کار، اور ماہر شخص تو دس ہزار میں بھی گراں نہیں، !"

انوار نے کہا "جتنا ہم اسے کھلائیں گے، اس سے کئی گناہ زیادہ نفع کمائیں گے، !"

قمر چپ رہی، اس نے کوئی جواب نہیں دیا،

اظہار نے تقاضہ کیا، "تو آپا کیا کہتی ہو پھر ؟"

انوار نے شہ دی: "کہنا کیا ہے وہ پیسہ دیں گی، !"

قمر نے دلاری سے کہا، "جا ذرا بابا کو بلا لا، !"

منشی ابو محمد کو وہ ان کے احترام کے پیش نظر بابا کہا کرتی تھی، اور وہ بھی ہمیشہ اسے بیٹی کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے،

ذرا دیر میں ابو محمد صاحب تشریف لے آئے۔

"بیٹی نے بلایا ہے، ؟"

وہ بولی۔ "ہاں بابا ایک بڑا ضروری کام ہے، !"

وہ اطمینان سے کرسی پر بیٹھ گئے، قمر نے، ساری گفتگو جو ابھی اظہار اور انوار سے ہوئی تھی۔ دہراتے ہوئے کہا۔

"تین لاکھ روپے چاہئیں، !"

منشی صاحب غوطے میں پڑ گئے۔ اظہار اور انوار کے سامنے اس اسکیم کے خلاف کچھ کہتے تو شامت آجاتی، اور اگر صاد کر دیتے تو بیٹی قمر کے ساتھ غداری ہوتی۔

اظہار نے ابو محمد سے پوچھا،

"کیا اونگھ رہے ہیں آپ؟"

انوار ہنسنے لگا، اور طنز بھرے لہجہ میں گویا ہوا،

"جی نہیں عالم مراقبہ میں ہیں، !"

وہ ان بدتمیزیوں کے خوگر تھے لہٰذا برا نہیں مانا، اور مانتے بھی تو کیا کر لیتے؟ پھر بھی اوسان بجا کر کے قمر سے کہا،

"لیکن بیٹی تمام پہلو سوچ بھی لئے ہیں تم نے؟"

انوار نے تلخ لہجہ میں کہا، "آپا تو سوچ چکی ہیں، نہ سوچ چکی ہوتیں تو آپ کو روپیہ دینے کا حکم کیوں دیتیں، باقی اگر آپ کو کچھ الٹا ہوا ہو، اور اب ضرورت سے زیادہ ہمدردی اور وفاداری جتا کر کچھ نئے نکتے پیدا کرنا چاہتے ہوں تو دوسری بات ہے، !"

یہ جلی کٹی باتیں سنکر ابو محمد صاحب تڑپ گئے، ــــــــــ یہ باتیں انوار و اظہار کر رہے تھے جنہیں انھوں نے گودوں کھلایا تھا۔ جن کی ضدیں پوری کی تھیں، جنھیں اپنی اولاد سے زیادہ چاہا تھا، لیکن یہ سوچ کر دل کو تسلی دے لی، جو لڑکے باپ کے نہ ہوئے، ماں کے نہ ہوئے، وہ کسی اور کے کیا ہوں گے، انھوں نے دونوں بھائیوں کو

مخاطب کر کے کہا،

"بیٹے ہمیں کیا، ——— ل نفع میں چلے گی تو نفع تم بیٹی کو ملے گا، یا نہیں، خدانخواستہ نقصان ہوا، تو تم ہی بھائی بہن بھگتو گے، یہاں اس ڈیوڑھی کی خدمت کرتے کرتے عمر بیت گئی، پہلے سو روپے مہینہ ملتے تھے، اب بٹیا (تم) اُنے دو سو کر دیئے ہیں، کچھ نہ دیں تب بھی جب تک ہاتھ پاؤں چل رہے ہیں کسی خدمت سے دریغ نہیں،!"

انوار نے اور زیادہ طنز کے ساتھ کہا۔

"جی ہاں، کیا کہنا ہے، وفاداری تو ختم ہے آپ پر، خدا سلامت رکھے آپ کو پھر ایسے لوگ کہاں ملیں گے، ——— یادگار زمانہ ہو تم لوگ،!"

ابو محمد صاحب کا چہرہ سرخ ہو گیا، انھیں اس طنز پر غصہ نہیں تھا، صدمہ تھا،!

یہ صلہ تھا عمر بھر کی وفاداری اور خدمت کا،!

لیکن قبل اس کے کہ وہ کچھ کہتے تم بول پڑی،

"کیوں تم لوگ پیچھے پڑ گئے ہو بابا کے خبردار،!"

دونوں نے پر مذاق انداز میں اطاعت کا مظاہرہ کرتے ہوئے خاموشی اختیار کر لی۔

پھر وہ ابو محمد صاحب سے گویا ہوئی،

"آپ ان باتوں کی پروا نہ کیجیے،!"

وہ بولے، "نہیں بیٹی میں پروا نہیں کرتا، میرا واسطہ تم سے ہے تم مجھے باپ کی طرح سمجھتی ہو، یہ میری خدمت اور وفاداری کا سب سے بڑا معاوضہ ہے، !"

پرنم آنکھوں کے ساتھ اس نے کہا۔

"کیا ابو آپ کے ہاتھ میں میرا ہاتھ نہیں دے گئے تھے؟ کیا انھوں نے مرتے وقت یہ نہیں کہا تھا، آج سے تیرے باپ یہ ہیں؟"

ابو محمد صاحب نے سینہ ٹھونک کر کہا،

"ہاں بے شک کہا تھا، !"

یہ جذباتی باتیں اظہار اور انوار کو بہت بری لگیں، انوار نے پہلو بدلتے ہوئے کہا،

"یہ کس قسم کی باتیں شروع ہو گئیں، کام کی بات یعنی روپے کا بندوبست کیجئے، !"

قمر نے بھی بھائیوں کی تائید کی، کہنے لگی،

"ہاں بابا، ان دونوں کا یہ مطالبہ پورا ہی کرنا پڑے گا ——— آخر، جو کچھ بھی میرے پاس ہے وہ ان دونوں کے سوا ہے کس کا؟"

ابو محمد صاحب نے کہا "بیٹی یہ تو ٹھیک ہے، لیکن"

انوار کو غصہ آگیا،

"ابھی لیکن باقی ہے ——— فرما دیجئے وہ بھی؟"

ابو محمد صاحب نے فرمایا، "تین لاکھ روپے نقد تو نہیں رہیں، !"

قمر نے سوال کیا "پھر کتنے ہیں؟"
سارا حساب کتاب ان کی انگلیوں پر رہتا تھا، کہنے لگے،
"ایک لاکھ بیس ہزار بینک میں ہیں، دو چار ہزار تجوری میں ہوں گے!"
انوار نے ذرا بگڑے ہوئے انداز میں کہا،
"یہ کون سی نئی بات کی ہے آپ نے؛ ظاہر ہے تین لاکھ روپیہ نقد کس کے پاس نکل سکتا ہے؟ ——— !"
ابو محمد صاحب نے پوچھا، "پھر کیا کیا جائے؟"
انوار نے بتایا، "وہی جو ہم دونوں نے کیا ہے؟"
قمر بول پڑی، "تم دونوں نے کیا کیا ہے؟"
انوار نے بتایا "زمین گرو رکھ دی ہے؛!"
قمر نے حیرت بھری نظروں سے اسے دیکھا، اور سوال کیا،
"زمین گرو رکھ دی ہے؟"
اظہار نے ملاطفت اور ملائمت کے لہجے میں کہا،
"ہاں آپا، پھر اور کیا کرتے؟ ———"
انوار نے مداخلت کرتے ہوئے کہا، "ہم کے ایک سال کے نفع میں ہم زمین چھڑا لیں گے، اور تین سال کے نفع میں ایسے ایسے کئی علاقے اگر چاہیں تو خرید سکیں گے، !"
کچھ تامل کے بعد وہ کہنے لگی، "اچھا بھئی، جو مناسب سمجھو کرو، مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے۔"

منشی ابو محمد صاحب اٹھ کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے کہا،

"بیٹی میں اس کی رائے نہیں دیتا۔ یہ جوا ہے، بدترین قسم کا جوا۔ میں اس میں شریک نہیں ہوں گا، اگر یہ دونوں اس پر بضد ہیں تو ان میں سے جس سے کام چاہو، مختار نامہ لکھ دو، اور وہ جس کے ہاتھ چاہے گرو رکھ دے، میں اس پاپ میں شرکت نہیں کر سکتا، مشرف بیال ہستے ملنے کے دن قریب آ رہے ہیں، انہیں کیا منہ دکھاؤں گا؟"

اور پھر جواب کا انتظار کئے بغیر، تیز تیز قدم رکھتے وہ چلے گئے، انوار، اظہار، دلاری، قمر سب خاموش تھے، جیسے سکتہ ہو گیا ہو۔ الخیر!!

(۳)

منشی ابو محمد صاحب ایسے گئے کہ پھر ایک مہینہ تک اپنی ڈیوٹی پر نہیں حاضر ہو سکے گھر جاتے ہی تپ لرزہ میں مبتلا ہوئے، بوڑھے بتے ہی، مرض نے اچھی طرح قابو پا لیا، وہ تو کہئے پرانی ہڈیاں تھیں، اس لئے اس وار کو سہ گئے، کوئی اور ہوتا تو کب کا ختم ہو جاتا، —— ۱۰۴، ۱۰۵ ڈگری بخار، کھانا بند، بھوک ختم، لیکن زندگی کے دن باقی تھے، لوٹ پوٹ کر اچھے ہو ہی گئے، قمر نے زور دیا ابھی کچھ دن اور آرام کر لیجیے، لیکن انھوں نے ایک نہ سُنی، کہنے لگے۔

"اب تو آرام قبر ہی میں ملے گا، زندگی کے دن جب تک، باقی ہیں کام ہی کروں گا۔!"

وہ چپ رہی، اور ابو محمد صاحب پھر کمزوری اور نقاہت کے باوجود پوری مستعدی کے ساتھ اپنے کام میں لگ گئے، جیسے بیمار ہی نہیں ہوئے تھے،

ان بیچارے کو بالکل نہیں معلوم تھا کہ ان کی عدم موجودگی میں کیا کیا ہو چکا ہے؛ جو کچھ معلوم تھا صرف اتنا کہ بینک کا سارا بیلنس اظہار کے نام ایک چیک کے ذریعہ منتقل ہو چکا ہے، اور قمر نے ایک مختار نامہ عام کے ذریعہ اظہار کو اپنی جملہ جائداد کے رہن رکھنے، بیع کرنے، یا جس طرح جی چاہے بندوبست کرنے کے جملہ اختیارات دے دیے تھے، یہ رسمی اور قانونی الفاظ تھے، اس لیے ابو محمد صاحب نے جب یہ مختار نامہ دیکھا تو انھیں حیرت نہیں ہوئی۔ وہ خود ہی کہہ گئے تھے کہ اظہار یا انوار میں سے کسی کو مختار نامہ دو، نتیجۃً انھوں نے یہ بھی سمجھ لیا تھا کہ جائداد کا بڑا حصہ، کسی ساہوکار کے مکفول ہو چکا ہوگا، کس کے ہاتھ؟ اس تصور سے انھیں تکلیف ہوتی تھی، لہذا نہ یہ معلوم کرنا چاہتے تھے، نہ اس کا کھوج لگانا چاہتے تھے، چیک بک میں رقم درج تھی اظہار کے نام سمجھ لیا کہ وہ نوجوانی ہی تھی گئی،

دس پندرہ دن کام کرتے ہوئے ابو محمد صاحب کو ہو گئے، اس عرصہ میں کوئی خاص واقعہ رونما نہیں ہوا، نہ جائداد کے مکفول ہونے کے بارے میں، یا ان کے مستقبل کے بارے میں انھوں نے قمر سے کوئی گفتگو کی، اور خود قمر نے بھی اس سلسلہ میں خاموش ہی رہنا مناسب سمجھا، وہ

جانتی تھی، جائداد کا مشغول ہونا انھیں سخت ناگوار ہے، لہٰذا ایسے تکلیف دہ موضوع کو چھیڑنے سے فائدہ کیا، دونوں ایک دوسرے سے ملتے تھے لیکن اصل موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے کتراتے تھے،

ایک روز قمر اپنے کمرے میں بیٹھی "سیرت عائشہ" کا مطالعہ کر رہی تھی کہ ابو محمد صاحب آئے، اور خلاف معمول بیٹھے نہیں کھڑے رہے قمر نے کتاب میں نشانی رکھی، اور اسے بند کر کے ابو محمد صاحب کی طرف دیکھا، اور بولی،

"بابا آپ کھڑے کیوں ہیں بیٹھ کیوں نہیں جاتے، ؟"

وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر بیٹھ گئے، قمر نے سوال کیا،

"کوئی خاص بات ہے !"

ابو محمد صاحب نے پھر ایک ٹھنڈی سانس لی، اور جواب میں کہا،

"خاص بات تو کوئی نہیں ہے بیٹی، صرف یہ کہنے آیا تھا کہ جو حساب کتاب ہے وہ سمجھ لو، !"

وہ چونک پڑی، اس نے حیرت سے ابو محمد صاحب کو دیکھا، اور بولی،

"حساب کتاب سمجھ لوں ——— کیوں ؟"

وہ کہنے لگے، "اب میری کیا ضرورت ہے ؟"

وہ اور زیادہ حیران ہو کر بولی

"آج آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں بابا؟"

جواب میں کہنے لگے، "بیٹی میں اسی لئے تو تھا کہ تمھارا حساب کتاب ٹھیک رکھوں؟ تمھاری جائداد کی دیکھ بھال کروں؟! اس کے سوا کوئی اور کام بھی تھا میرا،؟"

"ہاں یہی کام تھا، ——— تو کیا اب آپ یہ کام نہیں کرنا چاہتے،؟"

"اشرفو میاں کے مرتے وقت میں نے عہد کیا تھا کہ زندگی کی آخری سانس تک، تجھے اپنی بیٹی سمجھوں گا، ایک باپ کی طرح تیرے مفاد اور حقوق کی نگہداشت کروں گا، اور کم از کم میرا ضمیر مطمئن ہے کہ میں نے ایسا کیا بھی، ———"

"تو میں کب انکار کرتی ہوں،؟ ایمان کی بات یہ ہے کہ آپ نے مجھے ابو کا غم محسوس ہی نہیں ہونے دیا،!"

"خدا کا شکر ہے کہ تم اسے محسوس کرتی ہو،!"

"لیکن آج آپ کو ہوا کیا ہے؟"

"ہوا تو کچھ نہیں ہے بیٹی ———!"

"پھر حساب کتاب کیوں کر رہے ہیں،؟ کام کیوں چھوڑ رہے ہیں؟"

"میں تو کام کو نہیں چھوڑتا، اسی نے مجھے چھوڑ دیا ہے تو کیا کروں؟"

"یہ آپ نے کیا کہا ؟"

"بیٹی اب کیا کام باقی رہ گیا ہے، جو میں کروں ؟"

"وہی جو اب تک کرتے آئے تھے" !"

"لیکن جب صورت یہ ہو کہ بینک میں ایک پیسہ نہ ہو، اور ساری جائداد بک چکی ہو، صرف چند ایکڑ کا ایک کھیت، اور ایک چھوٹا سا باغ باقی رہ گیا ہو، تو میرے کرنے کو رہا کیا ہے ؟ ——————

جو پیداوار ہوگی، وہ موہن فروخت کر کے دام لا دیا کرے گا، سو دو سو پانچ سو، جتنے بھی ہوں، آدمی ایماندار ہے، بے ایمانی ہرگز نہیں کرے گا، !، ——— باقی رہا تم سے تعلق، تو وہ مرتے دم تک قائم رہے گا، جب تک ہاتھ پاؤں چل رہے ہیں خدا نے چاہا تو ایک پھیرا روز کر جایا کروں گا، !"

ابو محمد صاحب نے اتنی لمبی چوڑی تقریر کر ڈالی، اور قمر نے بیچ میں ذرا بھی مداخلت نہیں کی،!

وہ حیران و پریشان یہ باتیں سُن رہی تھی،

کبھی اسے خیال ہوتا یہ سٹھیا گئے ہیں، کبھی اپنی سماعت پر دھوکا ہونے لگتا، !،

آخر بڑی ذہنی کشمکش کے بعد اس نے کہا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، میں تو بالکل نہیں سمجھی، !"

وہ بولے، "بیٹی انگریزی کا ایک حرف بھی نہیں جانتا، اردو ہی

میری تمہاری مادری زبان سے اسی میں باتیں کر رہا ہوں ـــــــ
پھر بھی کوئی بات مجھ بے وقوف کی سمجھ میں نہ آئی ہو تو کہہ دو۔ پھر سے
اسے دہرا دوں گا، یا ضرورت ہوئی تو تشریح کر دوں گا۔!"

قمر نے پہلو بدلتے ہوئے کہا،

"یہ تو ٹھیک ہے کہ بینک میں سو لو سو سے زیادہ نہیں ہوں گے
کیونکہ وہ رقم میں نے شوگر مل کے سلسلہ میں اظہار کو آپ کے جانے
کے تھوڑی دیر بعد ہی چیک کاٹ کر دے دی تھی، لیکن ساری جائداد
کے بارے میں آپ کیا کہہ رہے ہیں، بالکل سمجھ میں نہیں آیا،!"

"تو کیا تم نے بیچی نہیں بیٹی؟"

"بالکل نہیں ـــــــ ہاں یہ ٹھیک ہے کہ میں نے اظہار کو
مختار عام بنا کر اس کے اتنے حصہ کو، جتنے سے تین لاکھ کی اتنی رقم
پوری ہو سکے رہن رکھنے کی اجازت دے دی تھی،!"

لیکن بیٹی انھوں نے رہن نہیں رکھی فروخت کر دی،!"

جیسے قمر پر بجلی گر پڑی، اس نے پوچھا،

"فروخت کر دی!"

"ہاں بیٹی۔"

"ساری جائداد فروخت کر دی،!"

"ہاں، سات لاکھ روپے میں،!"

"لیکن کیوں؟ کس حق سے؟ کس اختیار سے؟"

"تم ہی نے تو مختار نامہ لکھ کر دیا تھا، !"

"لیکن میں نے تو صرف رہن رکھنے کی اجازت دی تھی، !"

"انھوں نے فروخت کرنے کا حق بھی حاصل کر لیا، اور فروخت بھی کر دی، !" ———— اب صرف ایک کھیت اور باغ رہ گیا ہے تمہارے پاس، !"

دلاری پاس بیٹھی تھی، اور خاموشی سے قمر اور ابو محمد صاحب کی باتیں سن رہی تھی، دفعتہً اس نے رونا شروع کر دیا، قمر نے پوچھا،

"ارے کیا ہوا تو رو کیوں رہی ہے ؟"

اس نے آنسو پونچھے، اور گود پھیلا کر آسمان کی طرف دیکھتی ہوئی گویا ہوئی،

"اللہ تو ہی ان لوگوں سے سمجھ جنھوں نے میری بٹیا کو فقیر بنا دیا ہے، !"

اور یہ کہہ کر پھر وہ رونے لگی، !

حالت خود قمر کی بھی غیر تھی، یہ کتنا بڑا حادثہ تھا، کوئی اور ہوتا تو شاید اس کا ہارٹ فیل ہو جاتا، لیکن اس نے پورے صبر و ضبط کے ساتھ اس حادثہ کو برداشت کرنے کی کوشش کی اور منہ سے ایک لفظ تک نہ نکالا، دلاری کی یہ کیفیت دیکھ کر وہ اور زیادہ متاثر ہوئی، اس کے دل پر ایک گھونسا سا لگا، اس نے جلدی سے اس کا بازو پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا، اور کہا،

" خاموش، ——— ایسی باتیں نہیں کرتے، !"

لیکن دلاری خاموش نہیں ہوئی، وہ روتی جاتی تھی اور ایک ایک منہ میں سو سو کوسنے دیتی جاتی تھی،

آخر قمر نے اسے ڈانٹتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔

"تو نہیں چپ ہو گی ؟"

اور پھر ابو محمد صاحب سے کہا،

" اظہار کو یہ نہ کرنا چاہیئے تھا، !"

ابو محمد صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا،

ان کا بھی جی چاہ رہا تھا کہ دلاری کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روئیں اور ان دونوں خود غرض، اور فریب کار جاہلوں کو جتنا کوس سکتے ہیں کوسیں، لیکن آنکھیں خشک تھیں، اور لب خاموش، !

قمر سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے گویا ہوئی،

" کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ آپ کو غلط اطلاع ملی ہو ؟"

اب ابو محمد صاحب کا قفل سکوت ٹوٹا، انہوں نے کہا،

" کاش ایسا ہوتا، لیکن میں اس شخص کے پاس سے آ رہا ہوں، جس نے جائداد خریدی ہے، میں نے سارے کاغذات اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں، !"

قمر نے سوال کیا، " کون ہے وہ شخص، !"

ابو محمد صاحب نے بتایا، "بیجو رام داس، !"

قمر خاموش ہوگئی ——— !

تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا،

"مجھے ضرورت بھی کیا تھی اس جائداد کی' اس روپے کی، اچھا ہوا میری زندگی ہی میں انھوں نے لے لیا، ——— لیکن ——— لیکن دھوکا کیوں دیا، یہ صدمہ اس کا ضرور ہے!"

ابو محمد صاحب دل ہی دل میں قمر کی اس کمزوری' اور نالائقی پر بہت خفا ہو کر آئے تھے، وہ ان لوگوں میں تھے جو جائداد کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور کسی قیمت پر اسے فروخت کرنے پر تیار نہیں ہوتے انھیں غصہ آرہا تھا کہ اس چھوکری نے انظہار اور افزا کے بھرے میں آکر اتنی بڑی جائداد بیچ دی' اب ان کے ٹکڑوں پر زندگی بسر کرے گی، اور ان دونوں کے چھچھن ایسے ہیں کہ واقعی اسے ٹکر گدی بنا کر رکھیں گے، آخر اس نے خود اپنے ہاتھوں اپنا گلا کیوں گھونٹا؟ جب تک زندہ رہتی، بالادستی کی زندگی بسر کرتی، مرنے کے بعد تو وقتی یہی دونوں مالک ہوتے ——— !

لیکن اب یہ جو معلوم ہوا کہ یہ فریب کاری ہے، اسے جائداد کے فروخت ہونے کا علم نہیں ہے تو ان کا غصہ کافور ہوگیا، اور اس کی جگہ ترس، رحم، اور ہمدردی نے لے لی' بڑے ٹھنڈے لہجہ میں گویا ہوئے،

"حد ہوگئی، نالائقی اور بیہودگی کی، ——— لیکن بیٹی کیا تم اس

فریب کاری کو برداشت کرلوگی خاموشی سے؟"

وہ بے بسی کے ساتھ کہنے لگی،

"تو اور کیا کروں؟ اور کیا کرسکتی ہوں؟ کیا ہے میرے بس میں۔؟"

ابومحمد صاحب کی آنکھیں چمکنے لگیں، انھوں نے اطمینان سے کرسی کی پشت پر ٹیک لگاتے ہوئے کہا،

"تمھارے اختیار میں سب کچھ ہے، سب کچھ کرسکتی ہو تم!"

قمرنے پر امید نظروں سے ابومحمد صاحب کی طرف دیکھا، پھر پوچھا،

"بتایئے کیا کرسکتی ہوں میں؟"

ابومحمد صاحب نے اور زیادہ اطمینان اور اعتماد کے ساتھ جواب دیا،

"مقدمہ، ——— مقدمہ کرکے تم ساری جائداد واپس لے سکتی ہو، اور ان نالائقوں کو کیفر کردار تک پہنچا سکتی ہو، انھیں جیل بھیج سکتی ہو!"

اس نے بڑے درد بھرے لہجہ میں کہا۔

"نہیں ابا یہ نہیں ہوسکتا! ——— میں اپنے بھائیوں پر مقدمہ نہیں چلا سکتی، انھیں کیفر کردار تک نہیں پہنچا سکتی، انھیں جیل نہیں بھیج سکتی، آخر وہ میرے بھائی ہیں، میرے باپ کی اولاد، میری

ماں کی اولاد، کن آنکھوں سے انہیں مجرم کے کٹہرے میں کھڑا ہوا دیکھ سکوں گی؟ —— ہاں! میں اپنی آنکھیں پھوڑ لوں گی، مگر یہ منظر نہیں دیکھوں گی —— دیکھ ہی نہیں سکتی کسی طرح"!"

اور پھر وہ گردن جھکا کر سسکیاں لے لے کر رونے لگی"!

دلاری نے پھر اس کے پاؤں پکڑ لئے، اور پاؤں پر سر رکھ رونے لگی"!

ابو محمد صاحب اس منظر کی تاب نہ لاسکے، چپکے سے اُٹھے اور باہر چلے گئے"!

---

(۴)

قمر نے اظہار اور انوار سے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ یہ دونوں بھی کٹے کٹے رہتے تھے، لیکن ایک واقعہ ایسا ہوا کہ اس نے قمر کا دل توڑ دیا، اب تک نہایت صبر و ضبط اور تحمل کے ساتھ وہ ساری باتیں سہتی چلی آئی تھی، لیکن اب اس نے چاہا کہ ہمیشہ کے لئے فیصلہ ہی ہو جائے تو اچھا ہے!

جب سے بینک کے نقد روپے پر دونوں بھائیوں نے قبضہ کیا تھا، اور اس کے حصہ کی ساری زمین فروخت کر دی تھی، وہ اور زیادہ الگ الگ، خاموش خاموش رہتی تھی، نہ کسی معاملے میں دخل دیتی تھی، نہ کسی بات میں حصہ لیتی تھی۔

دلاری نے لاکھ لاکھ اکسایا، اور منشی ابو محمد نے اشاروں میں کئی مرتبہ اسے ترغیب دی کہ ان فریب کاروں کے خلاف قانونی کارروائی پر آمادہ ہو جائے، لیکن وہ کسی قیمت پہ بھی اس کے لئے تیار نہیں ہوئی۔

جب تک اظہار اور انوار نے قمر کو بالکل کھوکھلا نہ کر دیا تھا، دونوں بھائی بھی کافی ادب کرتے تھے، اور ان دونوں کی بیویاں تو اس کی خدمت اور اطاعت کے لئے اپنے تئیں وقف کئے ہوئے تھیں، آپا آپا کہتے زبان سوکھتی تھی۔ کسی بات کے بارے میں اتنا معلوم ہو جائے کہ قمر کو ناپسند ہے، پھر مجال کیا ہے کہ کوئی اس کا نام تک لے سکے،

لیکن جب سے صورت احوال بدلی تھی، یعنی اب وہ صاحب املاک و جائداد، اور زر و مال نہیں رہی تھی، اظہار اور انوار کے رویہ میں تو تبدیلی ہو ہی گئی تھی، سلمیٰ اور ناہید کا رویہ بھی یکسر بدل گیا تھا، بلکہ ان دونوں کے برتاؤ میں ایک حد تک توہین اور تحقیر کے پہلو نمایاں تھے۔

ایک روز دلاری منہ پھیلائے ہوئے آئی، اور بیٹھ گئی، قمر نے افسردہ سے تبسم کے ساتھ ہمدردانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا، اور پوچھا،

"کیا بات ہے دلاری، خفا خفا کیوں نظر آ رہی ہو؟"

وہ نیم گریاں انداز میں گویا ہوئی،

"جی چاہتا ہے سنکھیا کھا کر سو رہوں ——— مجھ سے تو یہ

ناہید نے جوابی تبسم کے ساتھ جواب دیا، "ہاں ـــــ اسی لئے تو بلایا ہے میں نے، !"

قمر نے سوال کیا، "تو کیا وہ لوگ دو مہینے رہیں گے یہاں ؟"

وہ بولی، "جی ہاں، شاید اس سے بھی کچھ زیادہ رہیں، !"

قمر نے زیر لب تبسم کے ساتھ، "اچھا تو یہ بات ہے ـــــــ یہی خوش خبری سنانے آئی تھیں تم ؟"

خفیف سے تامل کے بعد ناہید نے کہا،

"لیکن وہ لوگ رہیں گے یہاں، !"

"یہاں کہاں ؟"

"آپ کے کمرے میں، !"

"یہ کیوں ؟"

"یہ بڑا اور وسیع کمرہ ہے، اور پھر الگ تھلگ بھی ہے، یہاں انہیں زیادہ آرام ملے گا، !"

قمر برابر ضبط سے کام لے رہی تھی، اب بھی اس نے تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا،

"لیکن بنت مجتبیٰ میری سیلئے آرام کا ذرا خیال نہیں ؟"

ناہید کی تیوریاں چڑھ گئیں،

"آپ تو اکیلی ہیں کہیں بھی رہ جائیں، وہ تو ماشاءاللہ میاں بیوی ہیں، !"

قمر نے سمجھاتے ہوئے کہا، "لیکن یہ تو سوچو، اس کمرہ میں، صرف میں ہی نہیں رہتی، یہاں میری بہت سی چیزیں ہیں، جنھیں یہاں سے ہٹا کر کہیں اور لے جانا بہت مشکل ہے، !"

"اونہہ تو کیا وہ چور ہیں چیزیں یہیں رہن دیجیے، ! ——
اور اگر آپ کا جی نہ چاہتا ہو تو صاف صاف کہہ دیجیے، !"

"صاف صاف کیا کہہ دوں ؟"

"یہی کہ آپ کمرہ خالی کریں گی یا نہیں ؟"

قمر نے ایک تیور کے ساتھ کہا، "اگر تم صاف صاف جواب چاہتی ہو تو میرا جواب ہے نہیں، !"

وہی ناہید نے جس نے کبھی نگاہ ملا کر قمر سے بات نہیں کی تھی، دفعتہً بگڑتے ہوئے لہجہ میں کہنے لگی۔

"نہ جانے یہ غرتے ڈبے کس چیز پہ ہیں، —— لیکن کمرہ تو خالی کرنا ہی پڑے گا، !"

اور پھر قبل اس کے کہ قمر کچھ جواب میں کہے، وہ غصہ اور برہمی کے عالم میں اٹھی اور کمرے سے نکل گئی۔ دلاری پاس بیٹھی تھی۔ اس نے کہا۔

"دیکھا بٹیا میں نہ کہتی تھی —— ارے روپیہ ملنے کے بعد یہ لوگ بالکل بدل چکے ہیں، ان کا بس چلے تو تمھیں یہاں رہنے بھی نہ دیں، !"

جواب میں قمر نے کچھ کہنا چاہا تھا کہ انوار آگیا، اسے دیکھ کر قمر نے خاموشی اختیار کر لی، وہ آیا، اور اسی طرح کھڑے کھڑے گویا ہوا،

"ابھی ناہید آئی تھی یہاں؟"

قمر نے جواب دیا، "ہاں آئی تھی، اور لڑ کر چلی گئی، ——— بلکہ چیلنج بھی دے گئی ہے،!"

انوار نے جیب سے سگریٹ کیس نکالا، اور ایک سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا،

"لڑ کر چلی گئی، اور چیلنج بھی دے گئی؟"

قمر نے کہا، "ہاں، ———"

اس سے آگے ابھی اس نے کچھ نہیں کہا تھا کہ انوار نے ہدایات شروع کر دی،

"ذرا ذرا سی باتوں پر تمہیں بھی نہیں الجھنا چاہیے، لڑنے اور چیلنج دینے کی کوئی بات نہیں ہے، لیکن اگر وہ تین مہینے کے لئے کسی دوسرے کمرے میں منتقل ہو جاؤ گی، تو کون سا غضب ہو جائے گا،! ——— ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑائی جھگڑا مجھے ذرا بھی پسند نہیں،!"

انوار یہ باتیں کر رہا تھا اور قمر تصویر حیرت بنی اسے گھور رہی تھی، اظہار اور انوار دونوں باپ کی زندگی ہی میں خود سر اور سرکش ہو چکے تھے، لیکن قمر سے کبھی اس طرح الجھے ہوں ایسا کبھی نہیں ہوا تھا، آج یہ پہلا

موقعہ تھا، قمر نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہا،

"آخر اس گھر میں میری حیثیت کیا ہے؟"

انوار نے بے پروائی کے ساتھ جواب دیا،

"وہی جو ہونی چاہیئے!"

قمر نے سوال کیا، "یعنی کیا ——— ؟"

انوار نے کہا، "یعنی ایک ایسی خاتون خانہ کی، جسے اپنا وقار قائم رکھنے کے لیئے، چھوٹوں سے الجھنا نہ چاہیئے!"

قمر نے پوچھا، کیا روپیہ لینے سے پہلے بھی تم اس طرح کی باتیں مجھ سے کر سکتے تھے؟ کیا تم میں یا تمہاری بیوی میں یہ جرأت تھی کہ مجھ سے اس طرح کا مطالبہ کرتے؟"

انوار نے ایک قہقہہ لگایا، اور کہنے لگا،

"روپیہ؟ ——— کس روپے کا ذکر کر رہی ہو تم؟"

قمر نے ملامت آمیز نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا،

"وہی جو شوگر مل قائم کرنے کے لیئے تم نے لیا تھا، نقد بھی، اور زمین فروخت کر کے بھی، حالانکہ میں نے تمہیں صرف رہن رکھنے کی اجازت دی تھی!"

انوار نے زہرخند کیا، اور گویا ہوا،

"شوگر مل تو اپنے وقت پر قائم ہی ہو جائے گی، باقی رہا روپیہ کا معاملہ تو وہ تمہارا تھا کب؟"

قمر نے اور زیادہ حیران اور متحیر ہو کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا،

"کیا وہ میرا نہیں تھا؟"

"قطعاً نہیں، !"

"پھر کس کا تھا؟"

"ہم دونوں بھائیوں کا، !"

"تم دونوں کا روپیہ میرے پاس کس طرح آ گیا؟"

"ابو کی دھاندلی سے، نا انصافی سے، حق کشی سے، !"

"یہ تم اپنے باپ کے لئے کہہ رہے ہو، ؟"

"غلطی باپ سے سرزد ہو یا دادا سے غلطی ہی کہی جائے گی، !"

"وہ نا انصاف تھے، ؟"

"پرلے درجہ کے، ——— انھوں نے ہمارا حق کاٹ کر تمھیں دے دیا، کیوں ؟ کس اصول سے ؟ کس ضابطہ سے ؟ کس قانون سے ؟"

"انھیں اپنی چیز پر اختیار تھا جسے چاہتے دے دیتے، !"

"جی نہیں، آبائی جائداد اس طرح نہیں تقسیم کی جاتی، اگر دادا جان ابو کو کچھ نہ دیتے اور چچا جان کو سب کچھ دے دیتے، تو وہ کیا کرتے ؟"

"وہ صبر و شکر کے ساتھ باپ کے فیصلہ کے سامنے سر جھکا دیتے!"

"یہ تمہارا خیال ہے، !"

"اور تمہارا خیال یہ ہے کہ وہ بھی، تمہاری ہی طرح ننگ خاندان ثابت ہوتے؟"

"ہم نے اپنا حق لیا ہے، کوئی زیادتی نہیں کی ہے، تمہارے لئے اتنا چھوڑ دیا ہے جتنے کی تمہیں ضرورت ہے، ——————
میں پوچھتا ہوں آخر تمہیں اس قدر ہوس کیوں ہے، روپے کی، جائداد کی، یا زندہ رہنے کی؟"

"کیا تم چاہتے ہو میں مر جاؤں —— ؟"

"یہ تو میں نہیں کہتا، لیکن ایک بیوہ عورت اگر مر نہیں سکتی، تو پھر اسے راضی برضا ہو کر ایک بیوہ عورت کی زندگی بسر کرنی چاہیے، !"

"لیکن تم نے اپنے یہ خیالات روپیہ لینے سے پہلے کیوں نہیں ظاہر کئے، ؟"

"یہ حماقت ہوتی —————— پھر تم روپیہ نہ دیتیں، ہمیں مقدمہ لڑنا پڑتا، جس میں خواہ مخواہ کی زیر باری بھی ہوتی، اور جگ ہنسائی بھی، اب تو لوگ تمہاری تعریف کرتے ہیں کہ بہن ہو تو ایسی ہو، جس نے منہ سے اف کئے بغیر سب کچھ جو باپ نے دیا تھا، بھائیوں کے حوالے کر دیا، ——————"

لیکن میں نے دنیا کی تعریف کے لئے یہ نہیں کیا تھا |
میں نے اپنی محبت سے مجبور ہو کر یہ کیا تھا، !"

"لیکن وہ محبت اب کہاں ہے؟ کمرے کے معاملہ میں؟" ــــــ بہرحال جو کچھ ہونا تھا ہو گیا، پرسوں تحصیلدار صاحب اپنی بیوی سمیت آ جائیں گے، صرف کل کا دن ہے، اس مختصر مدت میں، صفائی وہائٹ واش اور دوسرے کاموں سے فراغت ہو جانی چاہیئے، کام کل صبح تڑکے شروع ہو جائے گا، لہذا آج ہی رات کو، تم اس کمرے میں چلی جاؤ جو تمہارے لئے تجویز کیا گیا ہے'!"

ان باتوں نے قمر پر کچھ ایسی کیفیت طاری کر دی کہ نہ وہ رو سکی، نہ غصہ کر سکی، نہ برہمی اور خفگی کا اظہار کر سکی، حیران و ششدر ہو کر انوار کا منہ تکنے لگی، اتنا بڑا انقلاب، اتنا بڑا تغیر، ــــــ یہ تو اس نے کبھی بھولے سے بھی نہیں سوچا تھا'!

انوار کے الفاظ میں حکم تھا، گویا وہ اس کا چھوٹا بھائی نہیں بڑا بھائی تھا، حاکم تھا، اس گھر کا مختار تھا، اس کے ارشاد کی تعمیل سب پر ضروری تھی، حتیٰ کہ قمر پر بھی،

آخر وہ اپنے حواس مجتمع کرتی ہوئی بولی،

"لیکن یہ گھر میرا ہے ــــــ اگر میں چاہوں تو کھڑے کھڑے تم سب کو نکال سکتی ہوں'!"

انوار کو پھر ہنسی آ گئی، اس نے کہا،

"اگر یہ حسرت ہے تو اسے ضرور پورا کر لو، لیکن کوئی قدم اٹھانے سے پہلے ہزار بار سوچ لینا چاہیے یہ بزرگوں کا قول ہے'!"

(۷)

انوار قمر کا جواب سنے بغیر غصّہ اور برہمی کے عالم میں باہر چلا گیا، قمر نے دلاری سے کہا،

"اگر بابا ہوں تو انھیں بلا لا،!"

وہ ذرا دیر میں واپس آئی اور کہنے لگی،

"وہ تو گئے، اب کل صبح آئیں گے،!"

قمر نے حکم دیا، "اچھا جا انظار سے کہنا کہ آپا نے بلایا ہے،!"

وہ پھر ذرا دیر میں واپس آگئی، اور کہنے لگی،

"وہ تاش کھیل رہے ہیں، دوستوں کے ساتھ، تھوڑی دیر کے بعد آئیں گے،!"

اس جواب سے قمر کے دل پر گھونسہ سا لگا، !

یہ وہی منظور تھا، جو اس کے ایک اشارے پر ہر حکم کی تعمیل کے لئے تیار رہتا تھا، اب تاش کھیل رہا ہے، اور کہتا ہے تھوڑی دیر کے بعد آؤں گا۔

وہ خاموش ہوگئی، رونا چاہتی تھی مگر آنسو خشک ہو چکے تھے، چیخنا چاہتی تھی مگر آواز حلق میں پھنسی ہوئی تھی، فریاد کرنا چاہتی تھی، لیکن قوت گویائی جواب دے چکی تھی، گریبان پھاڑ کر گھر سے باہر نکل جانا چاہتی تھی، لیکن غیرت اور شرم و حیا نے پاؤں پکڑ رکھے تھے، ______

وہ خاموش، افسردہ، مضمحل، اور پیکر الم بنی بیٹھی تھی، زبان خاموش لیکن دماغ کام کر رہا تھا،

دلاری بھی پاس ہی بیٹھی تھی، !،

اس کا جی چاہتا تھا قمر کے پاؤں سے لپٹ کر روئے، اتنا روئے اتنا روئے کہ جل تھل کر دے، اس کا دل چاہتا تھا کہ ہمدردی اور تسلی کے الفاظ کہے، اور اس کی اس افسردگی اور اضمحلال کو دور کر دے، اس کا جی چاہتا تھا کہ، اٹھے اور قمر کو اپنے ساتھ لے کر کہیں روپوش ہو جائے، اس کا جی چاہتا تھا، تلوار ہاتھ میں لے اور ان تمام لوگوں کو قتل کر دے، جو اس کی مالکہ کے دشمن تھے، جو اسے ذلیل کر رہے تھے، جو اپنی خود غرضی کی قربان گاہ پر اسے بھینٹ چڑھا چکے تھے، جو اسے لوٹ چکے تھے، اور مفلس بنا چکے تھے،

لیکن یہ سب اپنی دل کی دل ہی میں رہ گئیں، ان پر عمل کرنے کی سکت تھی، نہ حوصلہ،

اس کی حیثیت ایک خانہ زاد ملازمہ سے زیادہ تو نہیں تھی، وہ کر ہی کیا سکتی تھی، ؟ اس کے بس میں تھا کیا جو وہ کرتی، ؟

دو گھنٹے گزر گئے، !

مگر اظہار نہیں آیا، رات کے آٹھ بج گئے، وقت مقررہ پر ملازمہ کھانا لے کر آئی اور خوان پر رکھ کر چلی گئی، دلاری نے لاکھ لاکھ اصرار کیا، لیکن قمر نے ایک لقمہ بھی نہ توڑا، کہنے لگی،

"دلاری میری بھوک اڑ گئی، اب میں اس گھر میں کھانا نہیں کھا سکتی صبح تو پہلا کام یہ کر کہ بابا کو اپنے ساتھ لے آ جا کر، اگر تو نے ایسا نہ کیا تو میری جان پر بن جائے گی، میں مرجاؤں گی، میں خودکشی کر لوں گی"!

دلاری سہم گئی، اس نے کہا،

"کہو تو ابھی سے لے آؤں جا کر، ———"

اتنے میں کسی کے آنے کی آہٹ ہوئی ——— اظہار سامنے کھڑا تھا، !

(۸)

اظہار نے آتے ہی کہا،

"ارے آپا تم اب تک یہیں ہو؟ میں تو سمجھا تھا دوسرے کمرے میں منتقل ہو گئیں ————"

قمر نے جواب میں کہا،

"وقت ہی کہاں تھا اتنا جو اس وقت جاتی، صبح چلی جاؤں گی،!"

اظہار کے چہرے پر جو بے چینی چھائی ہوئی تھی، دور ہو گئی، اس نے کہا،

"اچھا صبح سہی،!"

اور پھر ذرا تحکم آمیز لہجہ میں گویا ہوا،
" بکھا صبح ضرور، !"
قمر مسکرائی، !
اس تبسم میں کتنا سوز، کتنا درد، کتنا الم، کتنی حسرت، اور کتنا غم پنہاں تھا اسے کم از کم اظہار نہیں محسوس کر سکا،
وہ کہنے لگی،
" اظہار صبح ہی چلی جاؤں گی، !" ——————
پھر ذرا دیر رک کر وہ بولی، لیکن اس کمرے میں نہیں جو تم لوگوں نے میرے لئے تجویز کیا ہے ؟"
اظہار سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا، وہ گویا ہوئی،
"میں نے فیصلہ کر لیا ہے اب اس گھر میں نہیں رہوں گی، !"
اظہار نے پوچھا" پھر کہاں کا ارادہ ہے ؟"
وہ بولی، " ایک باغ اور تھوڑی سی زمین تم لوگوں نے میرے لئے چھوڑ دی ہے، وہ میرے لئے بہت کافی ہے، وہاں ایک چھوٹا سا بنگلہ بھی ہے، مجھ اکیلی کے لئے، ایک عالی شان محل سے کم نہیں —————— زندگی کے اب جتنے دن بھی باقی ہیں وہ اب وہیں بسر کروں گی، جہاں کوئی ناہید نہ ہو گی، کوئی انوار نہ ہو گا، کوئی اظہار نہ ہو گا، جہاں سناٹا ہو گا، تنہائی ہو گی، ویرانی ہو گی، مجھے اب آبادی اور رونق کی ضرورت نہیں تنہائی اور ویرانی کی ضرورت ہے، مدت

سے جی چاہتا تھا،

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو،
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
اب وہ آرزو پوری ہو رہی ہے،
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو، اور پاسباں کوئی نہ ہو

یہ بے در و دیوار سا گھر میرے لئے ہنستا ہے، مجھے قطعاً نہیں معلوم تھا کہ تم لوگ مجھ سے اتنے اکتائے ہوئے ہو، ورنہ اب سے بہت پہلے چلی گئی ہوتی،!"

اظہار نے بھی انوار کی طرح بیٹھنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی، یہ ساری باتیں کھڑے کھڑے کر رہا اور سن رہا تھا، ان باتوں کے جواب میں بولا،

"میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کہہ رہی ہو تم؟ کیا مقصد ہے ان باتوں کا؟ ———— ناہید کا مطالبہ کوئی اتنا بڑا حادثہ جا نکلا تو نہیں تھا کہ اس کے لئے گھر چھوڑتے، اور جنگل میں رہنے کے لئے تیار ہو جاؤ،؟"

وہ بولی، "ناہید ہی کا سوال نہیں ہے، انوار کا سوال بھی ہے، تمہارا سوال بھی ہے،؟"

"وہ کیا؟"

" ابھی انوار کہہ کر گیا ہے کہ اس نے شوگر مل کے لئے جو روپیہ مجھ سے لیا، اور جو زمین فروخت کی، وہ اس کا حق تھا، جو اس طرح دھوکا دے کر اس نے حاصل کر لیا، وہ کہہ رہا تھا کہ ابّو نے ہم دونوں بھائیوں کا حق مارا تھا، وہ ہم نے حاصل کر لیا، غالباً تم بھی اس کے ہم خیال ہو گے، ؟ ——————"

اظہار نے سگریٹ کا ایک کش لگاتے ہوئے کہا،

" ہاں اس نے کچھ غلط تو نہیں کہا، !"

" وہ بولی، " غلط اور صحیح سے بحث نہیں، لیکن اگر تم لوگ، ابّو کو مرنے کے بعد، برائی سے یاد نہ کرتے اور مجھ سے سب کچھ مانگ لیتے، تو کیا میں انکار کر دیتی۔ ؟ "

اظہار نے کچھ جواب نہیں دیا۔

قمر نے سلسلۂ سخن جاری رکھتے ہوئے کہا،

" ابّو نے اچھا کیا یا برا، اس میں میری رائے شامل نہیں تھی، لیکن میں نے پہلے ہی دن فیصلہ کر لیا تھا کہ جو کچھ بھی مجھے ملا ہے، خواہ حصہ سے زیادہ یا حصہ کے مطابق، وہ میرا نہیں تم ہی دونوں کا ہے میں ایک بیوہ عورت ہوں، جس کے سینہ میں کوئی آرزو نہیں مچل سکتی، جو نہ اچھا کھا سکتی ہے، نہ اچھا پہن سکتی ہے، اور کم از کم اس کی تو تم دونوں بھائی گواہی دو گے کہ میں نے بیوگی کے بعد سے آج تک نہ اچھا کھایا ہے، نہ اچھا پہنا ہے، زیورات ایسے ہی رکھے ہیں،

ملبوسات فاخرہ اسی طرح پڑے ہیں، کھانا میرے لئے الگ پکتا ہے، اور وہ انتہائی سادہ ہوتا ہے، روپیہ جو کچھ بھی جمع ہو رہا تھا وہ تمہارے ہی لئے تھا، میں چاہتی تھی، میرے مرنے کے بعد اسے تم لیتے، لیکن اگر پہلے لے لیا تو مجھے کوئی شکوہ نہیں، کوئی شکایت نہیں، البتہ اس کا افسوس ضرور ہے کہ جس طرح سے یہ کام تم نے کیا وہ خواہ کسی کو زیب دیتا ہو مگر مشرف مہاں کی اولاد کو زیب نہیں دیتا۔ ــــــــــ صبح میں یہاں سے چلی جاؤں گی، میرے تمام زیورات، پارچہ جات اسی کمرہ میں ہیں، میں اس وقت کمرہ کو چھوڑ رہی ہوں، اور اسی کمرے میں جا رہی ہوں جو میرے لیے تجویز کیا گیا ہے، یہ تالہ ہے، یہ کنجی ہے، یہ آخری پونجی بھی تمہیں سونپے جاتی ہوں، اب تم جاؤ، اور اور تمہارا کام، ــــــــــ میری روانگی کے وقت اگر تم چاہو میری تلاشی بھی لے سکتے ہو، میں اپنے ساتھ کوئی چیز بھی نہیں لے جاؤں گی، !"

قمر کی اس طویل تقریر کو خاموشی کے ساتھ اظہار سنتا اور دھواں اڑاتا رہا،

اور پھر قمر اظہار کو وہیں کھڑا چھوڑ کر دلاری کے ہمراہ اس کمرے میں چلی گئی جو اس کے لئے تجویز کیا گیا تھا، !

یہ وہ کمرہ تھا جس میں گھر کے فالتو لوگ رہا کرتے تھے، اور اصل حویلی سے ہٹ کر ایک ڈربے کی صورت میں

واقع ہوا تھا، !

ایک بدقطع اور بدوضع سی جگہ، نہ جانے کب سے اس کی صفائی بھی نہ ہوئی تھی، دلاری جھاڑو لے کر اٹھی کہ صاف کر ڈالے مگر قمر نے کہا،

"خبردار، ———"

پھر بولی۔

"بس یہی رات تو کاٹنا ہے"، !"

حادثہ

ہم نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے

(۱)

ثمر کو رنگ پور میں آئے ہوئے ایک مہینہ گزر چکا تھا، !

وہ اپنی شاندار حویلی سے اس طرح دامن جھاڑ کر چلی کہ اپنی کسی چیز کی طرف، کسی زیور کی طرف، فرنیچر، کراکری، اور شاندار ملبوسات کی طرف سونے چاندی کے برتنوں کی طرف نظر اُٹھا کر بھی نہ دیکھا،

چند سادہ قسم کے جوڑے، کچھ روپیہ، جو اظہار اور انوار کی دستبرد سے بچ گیا تھا، چند تانبے اور پیتل کے برتن، ———— بس یہ پونجی تھی، جسے وہ اپنے ساتھ لے کر چلی تھی

جب وہ اپنے گھر سے، اپنی حویلی سے رخصت ہونے لگی، تو اسے کوئی رخصت کرنے نہ آیا، کسی نے دامن نہ پکڑا، کسی نے انہ رہا،

ظاہرداری بھی اس سے رک جائے گی، نہ جاتے کی، بہیں رہنے کی استدعا نہیں کی،

اظہار تسکار پر گیا ہوا تھا، یہ جانتے ہوئے بھی کہ بہن کا رخت سفر بندھ رہا ہے،

انوار اپنے یاران بے تکلف کے ساتھ، باہر کی بیٹھک میں تاش کھیل رہا، اور چائے پی رہا تھا،

سلمٰی اپنے ننھے کے لاڈ میں لگی تھی،

ناہید وہ کمرہ صاف کرا رہی تھی، جو قمر سے خالی کرایا گیا تھا، اور جس میں اس کی بہن اور بہنوئی آکر ڈیرا ڈالنے والے تھے،

گھر کے نوکر چاکر، بڑے ماہر نفسیات ہوتے ہیں، ان سے بڑھ کر اس حقیقت سے کوئی آشنا نہیں ہوتا کہ کس کے ساتھ کیا برتاؤ کرنا چاہیے،

کس کے ساتھ کیا برتاؤ کرنا مالک کو خوش یا ناراض کر دے گا،

چنانچہ وہی نوکر جو ہر وقت اس کی خدمت میں حاضر رہتے اور اس کے اشارہ چشم کے منتظر رہتے تھے ایسی غیر جانبداری کے ساتھ اس کی رخصت کا منظر دیکھ رہے تھے جیسے کوئی خاص اور غیر معمولی واقعہ رونما ہی نہیں ہو رہا ہے،

ہاں، !

دلداری تھی جو اس کے دامن سے الجھی ہوئی تھی جو کسی قیمت پر، اس کا

دامن چھوڑنے کو تیار نہ تھی"!

"اور ہاں"!

منشی ابو محمد صاحب بھی اس کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے"!

یہ بوڑھا، خمیدہ کمر، مجموعۂ امراض، کمزور، بجھے، اور ضعیف شخص ہر چیز کو چھوڑ کر، ہر کشش سے منہ موڑ کر اپنی "بیٹی" کے ساتھ اپنے محسن، اور اپنے آقا کی پریشاں حال، آشفتہ روزگار، اور برگشتہ بخت بیٹی کے ساتھ مستقل طور پر رہنے کے لئے رنگ پور کی طرف بڑھ رہا تھا،

قمر نے دلاری کو بھی منع کیا اور ابو محمد صاحب کو بھی روکا، لیکن، جذبۂ وفا، صلہ اور تحسین و آفریں، اسی طرح، مصلحت، اور نفع و نقصان سے بے نیاز ہوتا ہے، ـــــــ!

دلاری اچھی طرح جانتی تھی قمر کے ساتھ رہ کر وہ اپنا مستقبل بگاڑ سکتی ہے بنا نہیں سکتی،

ابو محمد صاحب اچھی طرح جانتے تھے، قمر کا ساتھ دے کر، اور تمام رشتوں سے کنارہ کش ہو کر جو وہ قمر کے ساتھ جا رہے ہیں، اس کا صلہ دو سو کیا، سو روپے کی صورت میں بھی مشکل سے ملے گا،

لیکن، نہ دلاری نے اپنے مستقبل کے بارے میں سوچا، نہ ابو محمد صاحب نے اپنے حال زار پر غور کیا، دونوں نے صرف یہ سوچا کہ اس موقع پر، ایسے نازک وقت پر، اس کٹھن گھڑی پر، اکیلا راہ دیتا ہے

روگردانی نہ کرنی چاہیے،

اور یہ سوچ کر بالکل بے پروا ہو کر وہ قمر کے ساتھ ساتھ ہو لئے،

قمر کے روانہ ہونے سے ٹھیک کچھ دیر پہلے ابو محمد نے رو رو کر انوار اور اظہار کو سمجھایا تھا کہ بہن کو روک لیں، وہ صرف ان کی بہن ہی نہیں ہے، محسن بھی ہے، ان داتا بھی ہے، پالن ہار بھی ہے، لیکن دونوں نے ستی کی ان سنی کر دی، اظہار نے کچھ جواب ہی نہیں دیا، انوار نے کہا تو صرف یہ کہ اچھا ہے ذرا آب و ہوا بدل جائے گی،!

---

(۲)

قمر کو رنگ پور میں آئے ہوئے ایک مہینہ کی مدت گزر چکی تھی،!

رنگ پور ایک چھوٹا سا گاؤں تھا، اس گاؤں کے کئی مالک تھے، کوئی تہائی کا، کوئی چوتھائی کا، کوئی اس سے بھی کم کا،

چند بیگھے زمین جو قمر کی باقی رہ گئی تھی، وہ اسی گاؤں میں واقع تھی، اور یہ حصہ سب سے کم تھا، بلکہ برائے نام تھا،

اسی سے متصل ایک چھوٹا سا آم کا باغ تھا، اس کی فصل سے ہزار بارہ سو روپے مل جاتے تھے، زمین سے سال بھر کا اناج بھی ملتا تھا، اور باقی کو فروخت کر دینے کے بعد، کچھ رقم بھی مل جاتی تھی،!

یہیں ایک چھوٹا سا بنگلہ بھی تھا،!

ایک چھوٹا سا ڈرائنگ روم، تین بیڈ روم، دونوں طرف برامدہ، تھوڑا تھوڑا صحن بھی دونوں طرف تھا، کرسی کافی اونچی، ملازموں کے رہنے کے دو کوارٹر ذرا ہٹ کر الگ سے بنے ہوئے۔

ایک عرصہ سے یہ بنگلہ خالی پڑا تھا، اب قمر کے آنے کے بعد اس میں پھر زندگی کی چہل پہل نظر آنے لگی!

رنگ پور میں اگرچہ شرفو میاں کا حصہ برائے نام تھا، لیکن سب لوگ جانتے تھے وہ کتنے بڑے اور کس کلے ٹھلے کے زمیندار تھے، سب ہی ان کے نام سے کانپتے تھے،

یہ خبر جو مشہور ہوئی کہ شرفو میاں کی لڑکی یہاں آئی ہے، اور رہنے کو آئی ہے تو دیہات کی تمام عورتیں اپنے بچوں کو لے لے کر ٹوٹ پڑیں۔ کچھ اس لئے کہ اس نئی مخلوق کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے کا شرف حاصل کر لیں، اور زیادہ تر اس لئے کہ اگر یہ عورت فیاض طبع ہے تو مختلف مواقع پر اپنے دکھ درد کا اظہار کر کے اس سے مدد لیں،

یہ ریلا جو جتنی جلدی آیا تھا اتنی ہی جلدی ختم ہو گیا۔

لیکن جو لوگ اس بستی میں رہتے، بستے اور کام کرتے تھے، جو قمر کی ملکیت تھی وہ باقاعدہ سلام کو آئے، اور اپنے ساتھ کچھ نذرانہ بھی لائے کسی نے ترکاری پیش کی، کسی نے اناج، کسی نے ایک آدھ روپیہ اس سے زیادہ ان بے چاروں کا اور بس بھی کیا تھا!

دیہات کی دوسری عورتوں کی قمر نے زیادہ حوصلہ افزائی نہیں کی،

اگرچہ شربت اور پان سے ان کی تواضع ضرور کی، اور یہ بھی ان لوگوں کے لئے بالکل نئی بات تھی، جس کا انھوں نے دل میں بھی اور آپس میں بھی کھلے الفاظ میں اعتراف کیا، لیکن جو لوگ خاص اس کی ہٹی میں بسنے تھے، اور ایسے لوگ کم تھے، ان سے وہ اور زیادہ تپاک، گرم جوشی اپنا پن، اور خلوص کے ساتھ پیش آئی۔

جو جتنا لایا تھا، اس سے زیادہ اسے انعام اور بخشش کے طور پر دیا، جو عورتیں آئیں، ان سے گھل مل کر باتیں کیں، ان کا دکھ درد سنا جو مدد کے قابل نظر آئی اس کی تھوڑی بہت مدد بھی کی، جو بچے، ان عورتوں کے ساتھ تھے، اور وہ کافی تھے، ان سب کو شرینی ملی، اور پیسے بھی اور سے۔

یہ سلسلہ کئی دن تک جاری رہا،!

اس خواہ مخواہ کی مصروفیت نے اسے اتنا مصروف رکھا، کہ وہ کچھ اور سوچ ہی نہ سکی،!

لیکن یہ مصروفیت بہرحال عارضی تھی، اور بہت جلد ختم ہوگئی،

اور جب ختم ہوئی تو قمر کے دل میں سوال پیدا ہوا، آخر یہ پہاڑ سے دن کاٹے کس طرح جائیں،؟

حویلی میں بھی کوئی خاص کام نہ تھا، لیکن ہر وقت دھما چوکڑی مچی رہتی تھی، آتے جانے والوں کا بھی تانتا بندھا رہتا تھا، گھر کے

معاملات اور مناقشات سے اسے کوئی تعلق نہ تھا، مگر بے خبر رہنا تو ناممکن تھا،

لیکن یہاں رنگ پور میں؟

یہاں بس وہ تھی، اور دلاری،!

منشی ابو محمد صاحب تو صبح ڈنڈا لے کر گشت پر نکل جاتے، کاشت کاروں سے ملتے، ان کا کام دیکھتے انہیں اچھا کام کرنے کی تاکید کرتے، دوپہر ہو جاتی تو کسی کسان کے گھر سے دودھ آجاتا، کسی کے ہاں سے دہی، کوئی چاول لے آتا، کوئی باجرے کی گرم گرم روٹی، اور وہ اطمینان سے جتنا کھا سکتے کھا لیتے، پھر باغ کے گشت کو نکل جاتے پھر رنگ پور کے کچھ اور لوگوں کے ہاں ناخواندہ مہمان بن کر پہنچ جاتے، اور ان سے گپ شپ کرتے رہتے، اس سلسلہ میں ضروری و قیمتی معلومات بھی حاصل کر لیتے، شام ہوتے ہوتے گھر واپس آتے کھانا تیار ملتا، کھاتے، کچھ دیر مثنوی مولانا روم کے جو اشعار زبانی یاد تھے وہ پڑھتے، پھر نماز عشا اول وقت پڑھ کر سو جاتے، اور بڑی گہری اور غافل نیند سوتے،

سونے کا جہاں تک تعلق تھا، دلاری بھی کم نہیں تھی، جب سے وہ رنگ پور آئی تھی، جیسے ہر وقت نیند کا نشہ چھایا رہتا، بیٹھے بیٹھے سو جاتی، کھڑے کھڑے اونگھ جاتی، اور اس کے علاوہ آخر وہ اور کرتی بھی کیا، یہاں کام ہی کیا

تھا اس سے کرنے کا؟ بہرحال وہ بھی اپنے حال میں مگن تھی،
لیکن مشکل تمر کے لئے تھی، اسے تو رات کو بھی نیند مشکل سے
آتی تھی، اور دن کو کسی قسم کی مصروفیت نہیں تھی، ——
آخر یہ زندگی کس طرح کٹے گی؟

---

(۳)

اسی طرح ایک کامل مہینہ اور گزر گیا، !

ایک روز بنگلہ کے سامنے ایک بیل گاڑی آکر رُکی، اور اس میں سے عائشہ بی اتریں،

عائشہ بی شوہر میاں کی دور کے رشتہ سے بہن ہوتی تھیں، بیوہ تھیں، اور بہت زیادہ بدقسمت، ایک لڑکا تھا، ایک لڑکی، لڑکا نہایت "نالائق"، جسے انھوں نے "زن مرید" کا خطاب دیا تھا، لڑکی جسے وہ حد سے زیادہ چاہتی تھیں، عین عالم جوانی میں داغ مفارقت دے گئی، ہاں اپنی ایک یادگار ضرور چھوڑ گئی، ننھا سا پرویز، !

اب بھی پرویز، ان کی زندگی کا سہارا تھا، اس کے پال پوس کر وہ اپنی مرحوم لڑکی کا حق محبت ادا کرنا چاہتی تھیں،

لیکن مشکل یہ تھی کہ بہو سے ویسے بھی نہیں بنتی تھی، اور پرویز کی وجہ سے اور نہیں بنتی تھی، ایک روز کسی بات پر لڑائی ہوئی، بیٹے نے بھی ماں کی بجائے بیوی کا ساتھ دیا، روٹھ کر گھر سے نکلیں، لیکن باہر نکل کر سوچا جائیں کہاں؟ خود غرضی، اور نفسانفسی کی اس دنیا میں کون دو چار روز سے زیادہ اپنے ہاں رہنے دے گا،؟ یکایک شرفو میاں کا اور ان کے ساتھ ہی قمر کا خیال آیا، قمر کے عادات وخصائل، کردار وسیرت، شرافت اور نیک نفسی سے وہ اچھی طرح واقف تھیں، فوراً ایک بیل گاڑی کرایہ پر طے کی اور دوپہر ہوتے ہوتے رنگ پور پہنچ گئیں،

عائشہ بی کو دیکھ کر دلاری نے تو کافی ناک بھوں چڑھائی، مفت کی روٹیاں توڑنے کو، لیکن قمر کے لئے. تو جیسے بلی [illegible] چھینکا ٹوٹا، اس نے سچے دل سے ان کا خیر مقدم کیا، [illegible] سے وہ اتنی متاثر ہوئیں کہ بلا توقف اپنی نالائق بہو، اور زیادہ نالائق لڑکے کی رام کہانی سنا ڈالی، اور یہ بھی [illegible] تی جیتی ہوں تو اس گھر میں قدم

ہوگی، ایک دو دن، یا مہینہ

"وہ حبیبہ کا معاملہ تو ہے نہیں، !"

اس سوال نے ان کی ساری تیز بیانی ختم کر دی، اور بیچاری سوچنے لگیں، واقعی اب کیا ہوگا؟ کیا مجھے پھر اس مردار بہو اور نالائق بیٹے کے ہاں جانا پڑے گا،؟

لیکن قمر نے یہ مشکل رفع کر دی،

اس نے دلاری کو جھڑک کر خاموش کر دیا، اور عائشہ بی سے کہا "پھپھی، جب تک میں زندہ ہوں، آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں، بلکہ اگر آپ چلی گئیں، تو مجھے شکایت ہوگی، ——————"

عائشہ بی نے قمر کو گلے سے لگا لیا اور پٹ پٹ بلائیں لیں، اور دعائے درازی عمر و ترقی اقبال دینے والی تھیں کہ دلاری پھر خاموش نہ رہ سکی، کہنے لگی،

"بیٹا دیکھ لینا یہ نہیں رہیں گی، چلی جائیں گی، !"

عائشہ نے اسے گھور کر دیکھا، اور پوچھا،

"کیوں چلی جاؤں گی مردار، ؟ میں تو اب مر کر بھی نہیں ج
گی، خدا میری بیٹی (قمر) کو سلامت رکھے، اب تو اسی کے
رہوں گی، !"

دلاری نے پوچھا، "اگر بہو صاح... کر لیں
اگر شرمندہ صاحبزادے صاحب معافی مانگتے؟
"...شہ بی کی آنکھوں
...کیا، "پھر احسان ...

خوشامد کرے گا، لے جائے گا، اور اس کشاکش کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ اب پرویز کے ساتھ کم از کم اتنا سنگ دلانہ برتاؤ نہیں کیا جائے گا، جتنا اب تک روا رکھا جاتا تھا، لیکن یہ تمام باتیں خوش خیالیاں ثابت ہوئیں،

فرزند سعادت مند و دلبند نے جھوٹوں بھی نہ پوچھا اماں کیسی ہو؟ کہاں ہو؟ انھوں نے تو گویا فاتحہ پڑھ کر دعائے مغفرت کی ذمہ داری سے بھی اپنے آپ کو سبک دوش کر لیا تھا،

عائشہ بی سوچا کرتیں، اگر قمر پرویز سے اتنی مانوس نہ ہو گئی ہوتی اگر اس نے میرا مان نہ رکھا ہوتا تو آج میں کہاں جاتی؟ ——————

اور میں تو کہیں بھی کسی کونے کھدرے میں پڑی رہتی، مگر پرویز کیا کرتا؟

اور اگر کوئی عزیز رحم کھا کر، ترس کھا کر، مجھ بوڑھی کو رکھ بھی لیتا، تو کیا پرویز کے یہ چونچلے وہاں ہو سکتے تھے جو یہاں ہو رہے ہیں؟

سوچا کرتیں اگر آج پرویز کی ماں زندہ ہوتی تو وہ بھی اس سے زیادہ پیار، محبت اور لاڈ کا برتاؤ کرتی، جو قمر کر رہی ہے، ؟ —— —— وہ اس کا رواں تک میلا نہیں دیکھ سکتی، اسے روتا نہیں دیکھ سکتی، چپ اور افسردہ نہیں دیکھ سکتی، پوچھ پوچھ کر اس سے فرمائشیں کراتی ہے اور ہنس ہنس کر، خوش ہو ہو کر انہیں پورا کرتی ہے،

پرویز تھا بھی بڑا پیارا بچہ!!

خوب صورت، شوخ، شریر، اور طرح طرح کی دلچسپ حرکتوں کا مجموعہ!

اس کے دم سے سارے گھر میں رونق آگئی تھی، شروع شروع میں دلاری اس سے کچھ کھنچی کھنچی سی رہتی تھی لیکن چند ہی روز کے بعد اس سے اس طرح گھل مل گئی، جیسے دونوں میں بڑی پرانی دوستی ہے، اس دوستی میں کچھ تو نمر کا خیال شامل تھا، اور کچھ پرویز کی دل آویزی اور کشش بھی کام کر رہی تھی، یہی حال ابو محمد صاحب کا تھا، وہ کھرے ایک سیلانی آدمی صبح اٹھے، اور شام کو خبر لائے، لیکن پرویز نے انھیں بھی اتنا مسحور کر لیا تھا کہ محض اس کی وجہ سے کافی وقت وہ گھر میں صرف کرنے لگے تھے، وہ تو اس کے سامنے بالکل بچہ بن جاتے، قلابازیاں کھاتے، شرارتیں کرتے، افسانے سناتے، ایران توران کے نہ جانے کہاں کہاں کے دلچسپ لطیفے سنا سنا کر اسے ہنساتے اور وہ اتنا ہنستا کہ ہنستے ہنستے اس کے پیٹ میں بل پڑ جاتے ——!

ایک دن کا واقعہ ہے،

دوپہر کا وقت تھا، بڑی شدید دھوپ پڑ رہی تھی، اتنی شدید کہ چیل انڈا چھوڑے دے رہی تھی۔ دلاری اپنی کوٹھری میں محو استراحت تھی، عائشہ بی، اپنے کمرے میں نیند اور بیداری کے درمیان غوطے کھا رہی تھیں، نمر خاموشی سے بستر پر لیٹی، اپنے

ماضی، حال اور مستقبل پر غور کر رہی تھی،

کبھی آنکھوں کے سامنے محبت کرنے والی، اور جان چھڑکنے والی ماں کی تصویر سامنے آکر کھڑی ہو جاتی، کبھی شفیق اور جان فدا کرنے والا باپ یاد آجاتا، کبھی وہ عہد ماضی یاد آجاتا، جب دونوں بھائی اس کے درم ناخریدہ غلام سے ہوئے تھے۔

اور،

اور کبھی وہ دن یاد آجاتا، جب وہ دلہن بنی تھی، اور خلیق سے ساتھ اس کا نکاح ہوا تھا،

کیسا مبارک دن تھا وہ،!

گھر کی رونق، چہل پہل، اور گہما گہمی کا کیا عالم تھا،!

دور و نزدیک کے عزیز، امنڈ امنڈ کر آئے تھے، سہیلیاں آئی تھیں، ہمجولیاں آئی تھیں دور کے رشتے کی بہنیں آئی تھیں، سارا گھر بقعۂ نور بنا ہوا تھا، سارے گھر پر نشاط و طرب کی کیفیت طاری تھی، ہر شخص شاداں، ہر شخص مسرور اور خوشیوں کے نشہ سے مخمور،!

اور پھر یکایک وہ بیوہ ہو گئی،!

خلیق ایک حادثہ کا شکار ہو کر مر گیا،!

اور ساری دنیا کی نظریں پھر گئیں، حد یہ ہے کہ عزیز اور رشتہ دار تک اس کے سایہ سے ڈرنے لگے،!

گویا وہ چڑیل تھی، بھتنی تھی، بلا تھی، اگر اس کا سایہ کسی پر پڑ گیا

تو وہ نشانہ ہو جائے گا، مٹ جائے گا، برباد ہو جائے گا!

لیکن ادبار اور مصیبت کے اس ہجوم میں ایک ہستی ایسی بھی جو اس کے لیے سینہ سپر تھی،

وہ اس کی ماں تھی، ——— نعیمہ!

ایک اور ہستی بھی تھی، جس نے اسے اپنا سب کچھ عطا کر دیا تھا، وہ اس کا باپ تھا، ——— شرفو میاں، !

لیکن نعیمہ بھی مر گئی، اور شرفو میاں بھی، اللہ کو پیارے ہو گئے، !

خدا کی اس وسیع دنیا میں وہ اکیلی رہ گئی، ——— بالکل اکیلی، !

جس کا کوئی ساتھی نہیں تھا، ہمدم نہیں تھا، دمساز نہیں تھا، !

اور آخر وہ اپنے آبائی گھر میں بھی اس گھر میں جو اس کی ذاتی ملکیت تھا، نہ رہ سکی، اور رنگ پور کے ویرانے میں آکر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گئی، ———!

یہی اور اسی طرح کی باتیں سوچتے سوچتے اس کی نگاہ دفعتاً پٹی سے لگی ہوئی اس چارپائی پر گئی، جس پر بڑی مشکل اور بڑی کوشش سے اس نے پرویز کو لٹایا تھا،!

لیکن یہ چارپائی تو خالی پڑی تھی ،!

پرویز کہاں گیا؟ اس قیامت کی دھوپ میں کدھر نکل گیا؟

یہ سوچ کر، وہ بیقراری کے عالم میں اٹھی، اور اپنے پرویز کی تلاش میں ناگھنی، پھلانگتی، کمرہ سے برآمدے میں اور برآمدے سے —————— !٠

(۵)

برآمدے کے سامنے جو چھوٹا سا لان تھا، اس میں ایک نیم کا درخت لگا تھا، بالکل برآمدے سے منفصل!

تو برآمدے سے ہو کر باہر نکلنا چاہتی تھی کہ دیکھتی کیا ہے پرویز سے ایک شخص، کھڑا باتیں کر رہا ہے،

پہلے تو جی چاہا کہ پرویز کو ڈانٹے، اور واپس بلا لے، لیکن اس آدمی کی وضع اور ہیئت کچھ ایسی عجیب معلوم ہوئی کہ وہ وہیں ٹھٹک کر رہ گئی، اور آڑ میں کھڑی ہو کر اسے دیکھنے لگی!

یہ ایک نوجوان شخص تھا، خوش رو، خوش شکل، خوش وضع اور خوش ادا ——— لیکن چہرے سے غربت اور پریشانی

عیاں ؟!

لباس میلا، چہرے پر تکان اور تھکاوٹ کے آثار، جوتا گرد سے اٹا ہوا، بال پریشان، داڑھی بڑھی ہوئی ؟!

وہ سوچنے لگی یہ کون شخص ہے ؟ یہاں کیوں آیا ہے ؟ اور پرویز سے کیوں باتیں کر رہا ہے، اور باتیں بھی کیسی بہلانے اور پرچانے والی!

اس شخص نے پرویز سے کہا،

"ہاں بھئی تو تمہارا نام پرویز ہے ؟"

پرویز نے بہت مختصر سا جواب دیا، "ہاں" !

اس نے پوچھا،

"ایک اور پرویز بھی گزرا ہے اسے بھی جانتے ہو ؟"

پرویز کے چہرے پر حیرت کے آثار طاری ہو گئے، اس نے کہا،

"پرویز تو بس صرف میں ہوں" !

اس آدمی نے ایک قہقہہ لگایا،

"ارے میاں وہ بہت بڑا بادشاہ گزرا ہے اپنے وقت کا — شیریں کا نام سنا ہے تم نے ؟"

"نہیں" !

"جب بڑے ہو گے تب سنو گے" !

"وہ کون تھی ؟"

"ایک عورت تھی؟"

پھر کہنے لگا۔

"بڑی خوب صورت ——————— ہزاروں میں ایک'!"

(ہنس کر) جھوٹ'!"

"ارے واہ میاں صاحبزادے تم نے تو ہمیں جھوٹا بنا دیا!"

"جھوٹ تو بول رہے ہیں آپ'!"

"وہ کیسے بھائی'!"

"بڑی خوب صورت تو صرف ہماری ممی ہیں ——— ہزاروں میں ایک'!"

"(سر کھجاتے ہوئے) ہاں یہ تو ٹھیک کہا تم نے، مجھے ان کا خیال ہی نہیں آیا تھا'!"

"کیا آپ نے انھیں دیکھا ہے'؟"

"(پھر سر کھجاتے ہوئے) نہیں بھائی دیکھا تو نہیں ہے'!"

"پھر کیسے جانا وہ خوب صورت ہیں'!"

"تم جو کہہ رہے ہو'!"

"کیا میں جھوٹ نہیں بول سکتا؟"

"یار ضرورت سے بہت زیادہ ذہین اور تیز طرار ہو'!"

"بتایئے کیا میں جھوٹ نہیں بول سکتا'!"

"نہیں بول سکتے ــــــــــ!"

"کیوں بھلا؟"

"چھوٹا آدمی تو چہرے سے پہچانا جاتا ہے۔ تمہارا چہرہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ تم بڑے سچے ہو ــــــــــ اور پھر تم خود بھی تو کتنے خوب صورت ہو!"

"تو اس سے کیا ہوتا ہے؟"

"جب تم اتنے خوب صورت ہو تو تمہاری ننھی بچی ضرور خوبصورت ہوں گی!"

"وہ تو مجھ سے بھی بہت زیادہ خوب صورت ہیں!"

"ضرور ہوں گی!"

"آپ کون ہیں؟"

"دیکھتے ہو، کیا میں آدمی نظر نہیں آتا؟"

"بتائیے تو سہی آپ کون ہیں؟"

"بس ایک آدمی ہوں!"

"کہاں رہتے ہیں؟"

"آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر!"

"آپ کا گھر کہاں ہے؟"

"کہیں نہیں ــــــــــ جہاں رات ہو گئی، پڑ رہے وہی ہمارا گھر ہے!"

"آپ کو چوروں سے ڈر نہیں لگتا؟"!
"ہمارے پاس ہے کیا جو چور لیں گے؟"
"کچھ بھی نہیں ہے آپ کے پاس؟"!
"تلاشی لے لو، اگر دو چاکلیٹ سے زیادہ نکلیں تو جو چور کی سزا وہ ہماری؟"!
"چاکلیٹ کا شوق آپ کو بھی ہے؟"!
"نہیں ہمیں کیسا ہو سکتا ہے تمہاری موجودگی میں؟! ——— لو کھاؤ؟"!
"نہیں میں نہیں کھاؤں گا؟"!
"کیوں نہیں کھاؤ گے؟"
"ممی نے منع کیا ہے؟"!
"واہ بھئی تم تو بڑے پیارے لڑکے ہو، کتنا کہنا مانتے ہو ممی کا!"
"تو کیا نہیں ماننا چاہیے؟"!
"ضرور ماننا چاہیے ——— لیکن کیا انھوں نے چاکلیٹ سے بھی منع کیا ہے!"
"نہیں چاکلیٹ کا نام تو نہیں لیا تھا؟"!
"تو پھر لو کھاؤ؟"!
"وہ خفا ہوں گی؟"!

"کیسی باتیں کرتے ہو یار، ــــــــ خفا ہوں گی، یہاں خدا کے سوا ہے کون ؟ اور وہ کبھی بچوں سے خفا نہیں ہوتا، ! " ــــــــ شاباش لو کھالو، !"

"لا یئے، لیکن ــــــــ"

"نہیں میں کسی سے کہنے تھوڑی جاؤں گا ــــــــ سچ کہنا کیسی ہیں، ؟"

"بڑی میٹھی، !"

"دیکھو ہم نے اپنا حصہ تمہیں دے دیا، حالانکہ بھوک کے مارے چکر آرہے تھے، اب تم ثواب لوٹو۔ اور ہمیں پانی پلا دو، !"

"آپ بھوکے ہیں ؟"

"ہاں، ــــــــ کئی دن سے !"

"کھانا کیوں نہیں کھایا ؟"

"جیب میں ایک پیسہ نہ تھا کھاتے کیسے ؟ مانگنے کی عادت نہیں، !"

"میں لا دوں کھانا ؟"

"(ہنستے ہوئے) بہت بہت شکریہ، ــــــــ نہیں"

"کیوں کھا لیجیے، آج ہمارے ہاں بڑے مزے کا دو پیازہ پکا ہے ــــــــ بڑے مزے کا، !"

"تمہارے ابا کیا کرتے ہیں ؟"

"وہ تو مر گئے"!

"مر گئے؟ ——— کب؟"

"بہت دن ہوئے، ——— مجھے تو ان کی صورت بھی یاد نہیں"!

"اس گھر میں بس تم رہتے ہو، اور تمہاری ممی کو بھی اور نہیں رہنا؟"

"کیوں نہیں رہنا؟ ——— کئی لوگ ہیں، دلاری ہے، ماں جی ہیں، بابا ہیں" ———

"اچھا اچھا" ———

"جاؤں، آپ کے لئے پانی لے آؤں"!

"نہیں مت لاؤ"!

"کیوں؟ ——— کیا اب پیاس نہیں رہی؟"

"ہے تو، لیکن بزرگوں کا قول ہے خالی پیٹ پانی نہیں پینا چاہیے" ———!

"تو کھانا لے آؤں؟"

"نہیں"!

"آخر کیوں نہیں؟"

"میری ممی نے منع کیا ہے وہ خفا ہوں گی"!

"روشن لعل آپ بھی اپنی ممی کا کہنا مانتے ہیں"!

"ماننا پڑتا ہے بھئی، ——— ورنہ مارتی ہیں،!"

"مارتی ہیں آپ کو؟"

"ہاں تو کیا ہوا؟"

"(ہنستے ہوئے) کہیں بڑے آدمی بھی مارے جاتے ہیں؟"

"ہاں کیوں نہیں، ——— اگر وہ کسی ماں کے بیٹے ہوں،!"

"ارے ارے آپ بیٹھ کیوں گئے؟"

"چکر آرہا ہے،!"

"چکر؟ ——— آپ کو چکر آرہا ہے؟"

"ہاں بھیا، ——— ابھی ذرا دیر میں چلا جاؤں گا، کیا تھوڑی دیر میرے یہاں پڑے رہنے سے تمہاری ممی خفا تو نہیں نہ ہوں گی؟ نکلوا تو نہ دیں گی؟"

"نہیں نہیں، ——— وہ تو بڑی رحم دل اور نیک ہیں ———"

"ارے آپ نے آنکھیں کیوں بند کر لیں،!" ؟ سنئے تو سہی، ——— (قریب بیٹھ کر بازو ہلاتے ہوئے) آپ بولتے کیوں نہیں کیا سو گئے؟ ——— چلئے ابا کی چار پائی پہ لیٹ جائیے، وہاں سو رہئے گا تھوڑی دیر، (اٹھ کر) اچھا میں جاتا ہوں، (پھر بیٹھ کر) آخر آپ کو کیا ہو گیا ہے؟

پرویز نے کسی آدمی کو آج تک بیہوش ہوتے ہوئے نہیں دیکھا تھا، وہ ہزار کوششوں کے باوجود نہ سمجھ سکا کہ یہ آدمی بیہوش ہو گیا ہے،

آخر جب کوئی بات اس کی سمجھ میں نہ آئی تو اس نے سوچا کہ اب گھر جا کر اطلاع دینا چاہئے کہ ایک آدمی آیا، اور باتیں کرتے کرتے دفعتہً سو گیا،!

وہ تیر کی طرح، یہ عجیب وغریب اطلاع دینے کے لئے برآمدے کی طرف بڑھا، ———

---

(۶)

قمر برآمدے کے کونے میں کھڑی آڑ سے سب کچھ دیکھ اور سب کچھ سن رہی تھی، !

اس شخص کی باتوں میں کچھ عجیب طرح کی سادگی تھی، ان باتوں میں بناوٹ نہ تھی، تصنع نہ تھا، نمائش کا اظہار نہ تھا، وہ ایک بچہ سے باتیں کر رہا تھا، ـــــــ بچہ بن کر، وہی معصومیت، وہی سادگی، وہی شوخی جو ایک بچہ کی باتوں میں ہوتی ہے۔

اس شخص سے، اور اس شخص کی باتوں سے وہ دل ہی دل میں غیر شعوری طور پر بہت زیادہ متاثر ہو رہی تھی، !

باتوں باتوں میں، جب پرویز نے اس کی خوبصورتی کی،

اس کی نیکی کی، رحم دلی کی، اس شخص سے، اس مرد سے، اس غیر مرد سے تعریف کی تھی، تو وہ شرم و حیا اور غیرت کے باعث زمین میں گڑی جا رہی تھی ایک مرتبہ تو اسے غصہ بھی آیا، اس کا جی چاہا کہ پرویز کو ڈپٹ کر بلا لے، اور آج پہلی مرتبہ اس کے گالوں پہ کئی طمانچے جڑ دے،

لیکن، ——— لیکن وہ ایسا نہ کر سکی،!

کیوں نہ کر سکی؟

اس لئے کہ، سننے والے کے چہرے پر، شرافت، انسانیت اور رفعت کردار کے آثار نمایاں تھے،!

یہ شخص جو اس ننھے سے اس طرح گھل مل کر باتیں کر رہا ہے، بد معاش نہیں ہو سکتا، آوارہ نہیں ہو سکتا، لچا اور لفنگا نہیں ہو سکتا، ——— یہی سوچ کر وہ خاموش ہو گئی،!

اور پھر،!

جب، اس شخص نے پرویز کو دو چاکلیٹ اپنی جیب سے نکال کر دیے تھے، اور اس نے میرے ڈر سے لینے سے انکار کر دیا تھا تو وہ اپنی ممی سے ڈرنے کا دکھڑا لے کر بیٹھ گیا تھا،!

کتنے دل آویز، اور دل میں کھب جانے والے انداز ہیں، ایک مرتبہ، بلکہ کئی مرتبہ اس کی یہ دلچسپ اور من موہن باتیں سن کر اسے ہنسی بھی آئی تھی، اور وہ مسکرا بھی دی تھی، اور مسکرائی

رہی تھی ۔ !

لیکن پھر اس کی ہنسی کافور ہوگئی ۔ !

اس کی مسکراہٹ ختم ہوگئی !

اس شخص نے جب اپنے بھوکے ہونے کا کئی فاقوں کا حال بیان کرتے پانی مانگا تھا ۔ !

اس کا جی چاہا ابھی اندر جائے اور جو کچھ گھر میں رکھا ہے سب لاکر پرویز کے ہاتھ اس کے پاس بھیج دے ، تاکہ وہ شکم سیر ہوکر کھالے ، تجسّت ہو جائے ۔

لیکن وہ ایسا نہ کرسکی ، ــــــــــ نہ جانے کیوں ؟

کئی مرتبہ اس کے قدم اندر کی طرف اٹھے ، لیکن بڑھ نہ سکے ،

وہ پھر وہیں ٹھٹک کر رک کر کھڑی ہوگئی ، جہاں کھڑی تھی ۔ !

اور جب وہ دفعتہً کھڑے کھڑے بیٹھ گیا ، اور کہنے لگا ۔

" مجھے چکر آگیا ہے ، ! "

اور اس کے بعد ، وہ بیٹھ بھی نہ سکا ، لیٹ گیا ، اور لیٹتے ہی بیہوش ہوگیا ، ــــــــــ تو !

تو اس کا جی چاہا کہ اسی طرح ننگے پاؤں ، برامدے سے نکل کر دالان میں پہنچے ، اور اس بیہوش آدمی کی دستگیری کرے ، !

اسے لخلخہ سنگھائے ، اسے ہوش میں لانے کی تدبیریں کرے ، !

لیکن جیسے دل میں کوئی بیٹھا تھا، اور منع کر رہا تھا،

خبردار اپنی جگہ سے جنبش نہ کرنا،

خبردار، اسے ایک قطرہ بھی اپنے ہاتھ سے پانی کا نہ دینا،

خبردار، ایک لقمہ بھی تمہارے ہاتھ سے اس کے منہ تک نہ پہنچنے پائے'،!

جیسے یہ منع کرنے والا کوئی اور نہیں شرفو میاں تھے'،!

یہ منع کرنے والا کوئی اور نہیں نعیمہ بیگم تھیں،

یہ منع کرنے والا کوئی اور نہیں حکیم صاحب تھے،

یہ منع کرنے والا کوئی اور نہیں، اس کے سارے آباد اجداد تھے، اس کے خاندانی روایات تھے،

اور ان سب کی وہ مزاحمت نہ کر سکی'، !

بھلا شرفو میاں، نعیمہ بیگم، آباد اجداد اور روایات خاندانی کی مزاحمت وہ کر بھی کس طرح سکتی تھی'، ———— ؟

یہ ان ہونی بات کس طرح اس سے ممکن تھی'، ؟

گر اس کا دل ڈانواڈول ہو رہا تھا، اور وہ چاہتی تھی کہ سارے بندھنوں کو توڑ کر، سارے روایات کو پھلانگ کر، اس بے سہارا بے یار و مددگار شخص تک پہنچ جائے، ———— لیکن وہ ایسا نہ کر سکی'، !

البتہ یہ ضرور ہوا کہ جب پرویز کی باتوں سے اس نے یہ اندازہ لگایا کہ یہ شخص بیہوش ہو گیا ہے، تو اس کا دل ڈوبنے لگا، اس کے بدن میں سنسنی ہونے لگی، اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے، اور اب معلوم ہوا جیسے اسے خود چکر آ رہا ہے، جیسے وہ خود گرا چاہتی ہے، جیسے وہ خود بیہوش ہونے والی ہے،

جیسے ہی پرویز اس شخص کو، ویسے ہی بیہوش چھوڑ کر گھر کی طرف لپکا، وہ بھی تیزی کے ساتھ، لیکن دبے پاؤں اپنے کمرے میں پہنچ گئی،

جیسے اس نے چوری کی تھی،!

اور نہیں چاہتی تھی کہ پرویز بھی اس چوری سے واقف ہو جائے،

وہ آ کر بستر پر گر پڑی، اس کا سانس زور زور سے چل رہا تھا، جیسے دھونکنی، جس طرح اسے جاتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا تھا، اسی طرح آتے ہوئے بھی نہیں دیکھا،

آ کر بستر پر لیٹی ہی تھی کہ پرویز بہت سے ہنگاموں کو اپنے ساتھ لے کر دوڑتا ہوا آیا اور دور ہی سے دیکھ کر پکارا "ممی"، ———

---

(۷)

یہ شخص جس نے اپنا نام کلیم بتایا تھا کئی گھنٹے کی دوادوش کے بعد ہوش میں آیا، کمزوری اور نقاہت کا یہ عالم تھا کہ منہ سے بات نہیں نکلتی تھی، ابو محمد صاحب، دلاری، اور عائشہ بی نے اس کی خبر گیری کی، اور واقعہ یہ ہے کہ کوئی دقیقہ نہیں رکھا اٹھا رکھا، نہ جانے اس میں کیا بات تھی کہ جو تھا اس کا کلمہ پڑھ رہا تھا، دلاری جب قمر کے پاس آتی کلیم کی کوئی خبر ضرور لاتی،

نہ جانے بیچارہ کہاں کا رہنے والا ہے اور کس مصیبت میں گرفتار ہے ؟"

"تم کہتی، پھر تو پوچھ کیوں نہیں لیتی ؟"

وہ جواب دیتی، " میں تو لاکھ لاکھ پوچھتی ہوں، مگر وہ کوئی جواب نہیں دیتا، کچھ نہیں بتاتا، نہ جانے کیوں، ادھر ادھر ٹکر ٹکر دیکھا کرتا ہے جیسے کسی کو ڈھونڈ رہا ہے!"

تم مسکرا کر کہتی، "کہیں تمہاری ہی جستجو میں تو نہیں ہے وہ؟"

وہ مسکرا دیتی، پھر شرماتی اور لجاتی ہوئی کہتی،

"ہمیں ایسی باتیں نہیں اچھی لگتیں،!"

اور پھر چلی جاتی،

کسی وقت عائشہ بی آتیں اور آتے ہی کلیم کا قصہ چھیڑ دیتیں،

"نہ جانے اس کے ماں باپ کا کیا حال ہو رہا ہوگا، ؟ ——————

ٹھنڈی سانس لے کر) خدا جانے، ماں باپ زندہ بھی ہیں یا نہیں؟"

تم کہتی، "پھپھی آپ نے پوچھا نہیں؟"

پھپھی جواب میں ایک اور ٹھنڈی سانس لے کر کہتیں،

"پوچھا کیوں نہیں مگر وہ کچھ منہ سے بولے بھی، ——————

میرے خیال میں تو دل پر کوئی گھاؤ لگا ہے،!"

وہ بے پروائی سے کہتی "لگا ہوگا،! —————— اس دنیا میں کون ہے جس کا دل گھائل نہیں ہے،!"

عائشہ بی سفارشی بن کر کہتیں،

"میں کہتی ہوں، کتنا نیک، کتنا شریف، اور صورت شکل کا کتنا اچھا لڑکا ہے؟"

وہ کہتی، "ہوگا، !"

عائشہ بی بھی، اپنے دل کی بھڑاس نکال کر چلی جاتیں،
پھر کسی وقت ابو محمد صاحب بڑا سا رومال کندھے پہ ڈالے
تشریف لاتے، اور بلا پوچھے ہوئے کہتے،

"اچھا تو ہوگیا ہے، !" لیکن ابھی کمزور بہت ہے، !"

قمر خاموش رہتی، ذرا دیر خاموش رہ کر وہ پھر فرماتے،

"میرے خیال میں تو بیکار اور بے روزگار نوجوان ہے، !"

قمر پھر منہ سے کچھ نہ بولتی، اور وہ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد کہتے،

"شاید روزگار کی تلاش میں نکلا ہوگا گھر سے، !————
لیکن اگر روزگار کی تلاش میں نکلا تھا تو دیہات میں کیوں آیا ؟ یہاں روزگار
کہاں ؟ "

وہ ہنس پڑتی، اور کہتی،

"آپ ہی سوچیے، !"

کچھ خفیف سے ہوکر وہ بھی واپس چلے جاتے !

پھر ادھر ادھر سے کھیلتا ہوا پرویز آتا، اور آتے ہی اپنی ممی
کی ٹانگوں سے لپٹ جاتا، وہ کہتی،

"کہاں گم رہا کرتے ہو ہر وقت ؟ "

وہ جواب دیتا، "کہیں بھی تو نہیں، ———— یہیں تھا، !"

"لیکن میری نظر کے سامنے تو نہیں تھے، !"

"ذرا باہر چلا گیا تھا!"

"ہر وقت باہر ہی رہنے لگے ہو اب تم، یا"

"ممی وہ کلیم صاحب ہیں نا ـــــــ"

"ہاں ہیں تو، !"

"وہ بڑے اچھے آدمی ہیں، ـــــــ بڑے اچھے،!"

"(مسکراکر) واقعی ؟"

"ہاں ممیؔ، !"

"تم نے کیسے جانا ؟"

"آج بھی انھوں نے بڑے مزے کی کہانی سنائی تھی مجھے، !"

"تم اب بہت آوارہ ہوتے جارہے ہو، اب تمھارے لیے تعلیم کا بندوبست کرنا پڑے گا، تب ٹھیک ہوگے، !"

"ارے ممی خوب یاد آیا، کلیم صاحب کہتے تھے، ہم تمھیں پڑھایا کریں گے، !"

"چل ہٹ وہ تجھے کیا پڑھائیں گے، خود تو جاہل ہیں، !"

"واہ ممیؔ، ـــــــ انھیں جاہل کہہ رہی ہو ؟"

"تو اور کیا وہ کوئی علامہ ہیں، ؟"

"وہ تو بہت پڑھے ہوئے ہیں، !"

"تجھیں پڑھا نہیں سکتے، اور پڑھے ہوئے ہیں، !"

"آج تو مجھے ایک سبق دیا ہے انھوں نے ؟"

وہ فکر کیا ہو سکتی ہے؟ وہ غم کیا ہے؟ اس کیفیت کی نوعیت کیا ہے؟ ———— یہ کون پوچھے؟ اور وہ تنہا نے بھی کیوں لگا؟

اور ہاں، یہ پرویز سے اس کی ممی کے بارے میں یعنی میرے بارے میں کرید کرید کر باتیں کیوں کیا کرتا ہے؟

میں نے خود اپنے کانوں سے سنا ہے، جب یہ دونوں بے تکلف دوست تنہا ہوتے ہیں تو زیادہ تر میری ہی باتیں ہوا کرتی ہیں،

کیوں؟

آخر میرا ذکر اس کثرت سے کس تقریب میں ہوا کرتا ہے؟

کیا کلیم نے مجھے دیکھ لیا ہے؟

پھر وہ اپنے دماغ پر زور دیتی، اور اسے یاد آجاتا، ہاں ایک مرتبہ میری اس کی نظریں چند لمحوں کے لیے چار ہوئی تھیں، پرویز بہت دیر سے باہر تھا، دلاری کھانا پکا رہی تھی، ابو محمد صاحب باہر گئے ہوئے تھے، اور عائشہ بی نماز پڑھ رہی تھیں، میں اسے تلاش کرتی ہوئی نکلی، اور بے ارادہ برآمدے تک چلی گئی، جہاں ایک چارپائی پر یہ دونوں یار غار نہایت اطمینان سے باتیں کر رہے تھے،

بس اس وقت ذرا کے ذرا میری اور اس کی آنکھیں چار ہوئی تھیں، لیکن ان آنکھوں میں شرارت نہیں تھی، ہوس نہیں تھی، خباثت نہیں تھی، معصومیت تھی، فرشتوں کی سی معصومیت،

میں فوراً ہی بڑی تیزی سے پیچھے ہٹ آئی تھی،!

" یعنی پڑھانا شروع بھی کر دیا، ؟"

" ہاں ——— بڑا اچھا پڑھاتے ہیں آسانیاں کہہ کہہ کر، !"

" اچھا ہوگا جاؤ، میرا سر نہ کھاؤ، !"

وہ بھی چلا جاتا، !

اور پھر وہ اطمینان سے اس عجیب و غریب شخص، اس نو وارد کے بارے میں سوچنے لگتی، نہ جانے کتنی مرتبہ کھڑکی سے، دروازے کی اوٹ سے، جھانک جھانک کر وہ اسے دیکھ چکی تھی، اور جب بھی دیکھا تھا، دل پر ایک نقش لے کر اٹھی تھی،

اس شخص کے چہرے پر، اس شخص کی باتوں میں، اس شخص کی اداؤں میں کچھ ایسی دلکشی تھی، جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا،

اسے کسی چیز کا شوق نہیں تھا، اچھے سے اچھا کھانا جس شوق سے کھاتا تھا، دال روٹی بھی اسی شوق سے کھا لیتا تھا، لوگ اس سے ادھر ادھر کی باتیں کیا کرتے، ابو محمد صاحب سارے جہان کے قصے لے کر اس کے سامنے بیٹھ جاتے۔ عائشہ بی تو اس طرح اس کا دامن پکڑ کر بیٹھتیں جیسے خدا نے ان کے نالائق بیٹے کا نعم البدل عطا کر دیا ہے، دلاری بھی کب کسی سے کم تھی، وہ بھی، اسے باتوں میں الجھانے کی کوشش کرتی، !

لیکن یہ شاعر مزاج شخص، سب کو ہاں ہوں میں ٹال دیتا، ہر وقت کسی فکر میں، کسی غم میں کسی کیفیت میں ڈوبا رہتا،

جیسے میں نے کسی شیر کو دیکھ لیا ہو،
جیسے میرا پاؤں سانپ پر پڑ گیا ہو،!
جیسے جلتا ہوا انگارہ میرے پاؤں سے لپٹ گیا ہو،
اور ہاں ان دوستوں میں باتیں کیا ہو رہی تھیں؟
وہ پھر سوچنے لگی،!
اور سوچتے سوچتے اسے یاد آیا، کلیم پرویز سے کہہ رہا تھا۔
"تمھاری ممی، کیا بہت سخت پردہ کرتی ہیں؟"
اس نے جواب دیا تھا، "اب تو نہیں کرتیں، پہلے کرتی تھیں،!"
اس نے پوچھا، "اب کیوں نہیں کرتیں؟"
پرویز نے پہلے تو لاعلمی کا اظہار کیا، پھر کہنے لگا، "اب وہ خود اپنے کام کی نگرانی اور دیکھ بھال جو کرتی ہیں،!"
"لیکن وہ نادہندوں، بے ایمانوں اور خودغرضوں پر سختی تو نہ کر پاتی ہوں گی؟"
"نہیں، ـــــــــ لیکن آپ نے یہ کیسے جانا؟"
"بات یہ ہے کہ ان کے چہرے پر جو نور برستا ہے، اس میں رحمت ہے، غضب نہیں، وہ ترس کھا سکتی ہیں، احسان کر سکتی ہیں، تشدد نہیں!"
"کیوں کلیم صاحب کیا آپ نے انہیں دیکھا ہے؟"
"ہاں یوں ہی سی ایک جھلک دیکھی تھی دو مرتبہ!"

" دو مرتبہ ؟ "

" ہاں ایک مرتبہ اسی دن جب میں پہلے پہل یہاں آیا تھا، اور تمہیں چاکلیٹ دے گئے تھے، اور ایک مرتبہ ابھی '! "

" سچ کہئے گا کیسی ہیں میری ممّی ، ! "

" بہت اچھی ، ——— تم سے بھی اچھی '! "

" آپ کا جی چاہتا ہے ممّی سے ملنے کا ؟ "

" بہت زیادہ '! "

" پھر ملتے کیوں نہیں ؟ "

" مندر میں اچھوت نہیں جا سکتے، دیوی کے درشن ان کے نصیب میں نہیں ہوتے، وہ دور ہی سے پرنام کر سکتے ہیں ' ؟ "

" مندر ' ——— اچھوت ' ——— دیوی ' ——— پرنام ' ——— درشن ' ——— یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ؟ "

" (ہنس کر) تم نہیں سمجھے ؟ "

" بالکل نہیں '! "

اور سمجھ بھی نہیں سکو گے . ! "

" آپ کیوں نہیں سمجھا دیتے ؟ "

" یہ باتیں، ایک وقت آئے گا خود بخود سمجھ میں آ جائیں گی، ابھی لاکھ سر پٹکو ، خاک نہیں سمجھ سکو گے ، ! "

" آپ تو بعض وقت نہ جانے کیسی باتیں کرنے لگتے ہیں،

" ہاں، ——— لیکن میں خود بھی تو عجیب آدمی ہوں،" ———

——— کیا نہیں ہوں، ؟"

" ہاں ہیں تو، ! ——— ممّی بھی یہی کہتی ہیں، !"

" (چونکتے ہوئے) ممّی بھی یہی کہتی ہیں، !"

"جی ہاں، ——— کئی بار کہہ چکی ہیں، !"

" کیا کہہ چکی ہیں ؟"

" کہتی ہیں کلیم صاحب بڑے عجیب آدمی ہیں، !"

" اور کیا کہتی ہیں ؟"

" کہتی ہیں کلیم صاحب بڑے اچھے آدمی ہیں، !"

" اور، ——— اور کیا کہتی ہیں ؟"

" کہتی ہیں کلیم صاحب بڑے نیک اور فرشتہ صفت انسان ہیں، !"

" کس سے کہہ رہی تھیں ؟"

" مجھ سے، !"

" اور کس سے ؟"

" اور کسی سے نہیں، !"

" دلاری سے بھی نہیں ؟"

" نہیں، !"

" عائشہ بی سے بھی نہیں ؟"

"جی نہیں ان سے بھی نہیں"!"

" اور ابو محمد صاحب سے؟"

"کسی سے بھی نہیں، ——— بس مجھی سے"!"

"تم ہی میرا ذکر کرتے رہتے ہوں گے ان سے؟"

"میں بھی کرتا ہوں، اور سب بھی کرتے ہیں"!"

" لیکن تمہارے سوا اور کسی سے کچھ نہیں کہتیں؟"

"جی کبھی نہیں، ———

اور پھر وہ اپنے اوپر غصہ کرنے لگتیں،

" ایک غیر شخص کے بارے میں اتنی تفصیل سے مجھے سوچنے کا کیا حق ہے؟"

اور پھر وہ کوئی کتاب لے کر بیٹھ جاتی،!

(۸)

کئی دن اور گزر گئے،!

اب کلیم بالکل اچھا تھا، کمزوری دور ہو چکی تھی، نقاہت کے آثار ناپید ہو گئے تھے،

اب یہاں رہنے کی کوئی وجہ نہیں تھی، ایک روز صبح صبح وہ اٹھا، اور باہر کی طرف چلنے لگا،

ابو محمد صاحب کو رات بخار آ گیا تھا، اب تک بستر پر، لیٹے حقہ پی رہے تھے، کہنے لگے،

"کہاں چلے میاں صاحبزادے ـ ؟"

کلیم نے جواب دیا، "یہ تو نہیں جانتا کہاں جاؤں گا، لیکن کہیں

نہ کہیں تو پہونچ ہی جاؤں گا، !"

وہ ہڑبڑا کر بستر سے اٹھ بیٹھے،

"کیا کہا؟ ——— کیا تم یہاں سے جا رہے ہو؟"

وہ بولا، "جی ہاں" ———

ابو محمد نے سوال کیا، "بغیر رخصت ہوئے، بغیر اجازت لیے، ——— یہ کون سی تہذیب ہے؟"

وہ بولا، "تو کیا تہذیب یہ ہے کہ یہاں پڑا رہوں؟ اور مفت کی روٹیاں توڑتا رہوں؟ ——— کیا آپ میری جگہ ہوتے تو ایسا کرتے؟"

ابو محمد صاحب بیٹھے سے کھڑے ہو گئے، انھوں نے اس کا بازو پکڑا، اور لا کر اپنے پاس بٹھا لیا، اور کہا،

"بھائی، میں یہ کب کہتا ہوں کہ مفت کی روٹیاں توڑتے رہو لیکن آدمی جب کہیں جاتا ہے، تو باقاعدہ رخصت ہوتا ہے، اجازت طلب کرتا ہے ——— یہی اخلاق ہے، یہی شائستگی ہے، اسی کو تہذیب کہتے ہیں، !"

وہ گویا ہوا، ضرور کہتے ہوں گے، لیکن، میں آیا بھی تو اسی طرح تھا ——— دفعتہً ——— جا بھی اسی طرح رہا ہوں، اگر یہاں مہمان بن کر آیا ہوتا تو ضرور رخصت ہو کر، اور اجازت لے کر جاتا، !"

ابو محمد صاحب سراپا حیرت بنکر اس انوکھے، اور نرالے شخص کو دیکھنے لگے، اپنی طویل عمر میں انھیں ہر طرح کے لوگوں سے سابقہ پڑا تھا، لیکن اس کینڈے کا کوئی آدمی ان کی نظر سے نہیں گزرا تھا، واقعی یہ دفعتہً آیا تھا، لیکن جتنے دن بھی رہا تھا، اس طرح گھل مل کر رہا تھا، جیسے کوئی دیرینہ شناسا، جیسے کوئی عزیز قریب، اور دامن جھاڑ کر اٹھا تو اس طرح جیسے کوئی تعلق ہی نہیں تھا، کچھ دیر تک وہ سوچتے رہے کہ ان باتوں کا جو کہ واقعیت پر مبنی تھیں، لیکن نہایت بے تکی تھیں کیا جواب دیں آخر سوچ ساچ کر انھوں نے فرمایا،

"یہ تو سچ ہے، لیکن تم ہماری مرضی کے بغیر نہیں جا سکتے!"

کلیم نے جواب دیا، "اور آپ کی مرضی کیا ہے؟"

ابو محمد صاحب نے قدرے توقف کے بعد فرمایا،

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

دراصل وہ اسی چکر میں تھے کہ اگر روکتے ہیں تو ممکن ہے یہ اقدام قمر کو ناگوار ہو، اور وہ اعتراض کر بیٹھے کہ ایک غیر شخص کو کیوں روک لیا آپ نے؟ اور اگر نہیں روکتے تو بھی یہ اندیشہ تھا کہ وہ اعتراض کر بیٹھے، آپ نے مجھے اطلاع کیوں نہیں دی؟

کلیم نے کہا، "آپ کچھ نہیں کہہ سکتے تو مجھے جانے دیجئے۔ ——— دھوپ تیز ہوتی جا رہی ہے!"

ابو محمد صاحب نے ایک مرتبہ سر پر ہاتھ پھیرا، اور کہا۔

"ذرا دیر ٹھہر جاؤ، ذرا بٹیا کو اطلاع دے دوں؟"

کلیم خاموش ہو گیا، اور ابو محمد صاحب اندر پہنچے، قمر اور پرویز میں لڑائی ہو رہی تھی، پرویز بضد تھا کہ میں باہر جاؤں گا، کلیم صاحب میرا انتظار کر رہے ہوں گے، اور وہ اصرار کر رہی تھی کہ کہیں جانے کی ضرورت نہیں یہیں بیٹھو چپ چاپ"!

ابو محمد صاحب کو دیکھ کر قمر نے پوچھا، کیسے آنا ہوا بابا؟"

بابا نے سر کھجلاتے ہوئے کہا،" وہ جو کلیم صاحب ہیں نا وہ جا رہے ہیں آج"!"

قمر کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، لیکن اس نے اپنی کیفیت ظاہر نہیں ہونے دی، کہنے لگی،

"کیوں جا رہے ہیں؟"

ابو محمد صاحب نے اپنی طرف سے جواب دیا،

"تلاش روزگار میں جا رہے ہوں گے"!"

بے ساختہ قمر کے منہ سے نکلا،

"تو پھر یہیں وہ کر وہ پرویز کی تعلیم اپنے ذمے کیوں نہیں لے لیتے؟ ——— تنخواہ طے کر لیجئے"!"

یہ غیر متوقع جواب سنکر ابو محمد صاحب کی باچھیں کھل گئیں، بہت خوش ہوئے، اور الٹے پاؤں واپس ہوئے، اور کہنے لگے،

"بٹیا کہتی ہیں، آپ یہیں رہ کر، پرویز کی تعلیم کا ذمہ کیوں نہیں لے لیتے، ؟ ——— خراب ہوا جا رہا ہے لڑکا، کبھل کود کر، !"

کلیم کچھ سوچنے لگا، اور فوراً جواب نہ دے سکا، جب کافی دیر گزر گئی اسے تو ابو محمد صاحب نے کہا، !"

"کیا سوچ رہے ہو بھئی، ؟"

وہ بولا، "سوچنے کی تو کوئی بات ہی نہیں ہے جیسا کہیے، !"

ابو محمد صاحب کو دل کی مراد مل گئی، جوشِ نشاط سے بے قابو ہو کر کہا،

"بس تو پھر اب معاملہ کی بات بھی طے کر لو، !"

کلیم نے انھیں حیرت سے دیکھتے ہوئے پوچھا،

"معاملہ کی بات کیا ہے ؟"

وہ کہنے لگے، "بس یہ کہ تنخواہ کیا لو گے ؟"

کلیم نے دفعتہً ایک قہقہہ لگایا، "تنخواہ ؟ ——— ؟"

ابو محمد صاحب نے سنجیدگی سے کہا، "ہاں بھئی تنخواہ، کیا یوں ہی مفت خدا میں کام کرو گے ؟"

"کلیم نے بھی سنجیدہ لب و لہجہ میں کہا،

"تعلیم کی کوئی قیمت نہیں ہوتی، ——— سچ کہیے گا کیا آپ نے تنخواہ دے کر پڑھا ہے ؟"

وہ بولے، "وہ زمانہ اور تھا میاں صاحبزادے، اب وہ بات کہاں؟"

کلیم نے جواب دیا، "اچھا اگر آپ بضد ہیں، تو جو دیں گے، میں خوشی سے قبول کر لوں گا۔!"

منشی ابومحمد نے اپنے دل میں سوچا تیس روپے کافی ہوں گے اور خاموش ہو گئے"!

(۹)

کلیم نے باقاعدہ رنگ پور کے بنگلہ میں اقامت اختیار کر لی، وہ نہایت پابندی کے ساتھ صبح شام پرویز کو پڑھانے لگا گو اس کے فرائض میں صرف پرویز کی تعلیم داخل تھی، لیکن ابو محمد صاحب کے کاموں میں بھی ان کا ہاتھ بٹانے سے انکار نہ کرتا، بیچارے بہت زیادہ بوڑھے اور ضعیف ہو چکے تھے، دماغ جواب دیتا جا رہا تھا، بہی کھاتے کا بھرنا، اور حساب کتاب کا رکھنا ان کے بس کا روگ نہیں رہ گیا تھا، کلیم نہایت مستعدی کے ساتھ بہی کھاتے کے اندراجات مکمل کرتا، اور تمام حساب کتاب نہایت باقاعدگی سے رکھتا لیکن یہ اس کا اور ابو محمد صاحب کا پرائیویٹ سمجھوتہ تھا، قمر تو یا گھر

والوں کو یہ پتہ نہیں تھا کہ کلیم، پرویز کو تعلیم دینے کے سوا کچھ اور کام بھی کرتا ہے۔

پرویز اتنا شوخ اور شریر تھا کہ بظاہر اس سے یہ امید نہیں کہ جی لگا کر پابندی کے ساتھ پڑھ سکے گا، لیکن کلیم نے بقول ابو محمد صاحب کے نہ جانے کیا چیز گھول کر اسے پلا دی تھی کہ نہایت شوق کے ساتھ تعلیم حاصل کرتا تھا۔

قمر کا یہ معمول تھا کہ پرویز جو کچھ پڑھ کر آتا، اسے سنتی اور اس کی تعلیمی رفتار سے برابر باخبر رہتی، وہ بھی یہ دیکھ کر خوش تھی کہ کلیم نہایت دیانت اور سچائی کے ساتھ تعلیم دے رہا ہے، اور پرویز نہایت شوق اور محبت کے ساتھ پڑھ رہا ہے،

جاڑے کا موسم آگیا تھا ایک روز پرویز کے لیے تل کے لڈو اور باجرے کی ٹکیاں خود اپنے ہاتھ سے پکائیں، ایک پلیٹ میں بہت سے لڈو، اور ٹکیاں رکھ کر، پرویز سے کہا،

"جاؤ کلیم صاحب کو دے آؤ!"

پرویز خوش خوش یہ تحفہ لے کر اپنے استاد کے پاس پہنچا، کلیم نے ان چیزوں پر ایک نظر ڈالی اور پوچھا،

یہ کیا ہے بھئی، ؟"

پرویز نے بتایا، "یہ چیزیں ہمارے لیے ممی نے خود بنائی ہیں، !"

کلیم نے کہا، "تو پھر موج کرو، کھاؤ خوب جی بھر کر"!

وہ کہنے لگا، "لیکن یہ تو آپ کے لیے بھیجی ہیں"!

کلیم نے پرویز کی بات کا یقین نہ کیا کہنے لگا،

"اچھے بچے جھوٹ نہیں بولا کرتے"!

پرویز نے صداقت اور راست گوئی کی پوری کیفیت اپنے اوپر طاری کرتے ہوئے کہا،

"میں جھوٹ نہیں بولتا، ——— یقین نہ ہو تو آپ خود پوچھ لیجیے"!

کلیم نے سوال کیا، "تمھارا مطلب یہ ہے کہ تمھاری ممّی نے یہ چیزیں میرے لیے بھیجی ہیں"!

"جی ہاں ——— صرف آپ کے لیے میں تو خوب کھا چکا، اور ابھی میرے لیے بہت سی ٹکیاں اور لڈو رکھے ہوئے بھی ہیں، کئی دن چلیں گے"!

"تو جناب میں کھائے لیتا ہوں پھر شکایت نہ کرنا"!

پرویز ہنسنے لگا، "نہیں کروں گا شکایت ——— کھا لیجیے"!

اور کلیم نے وہ ساری پلیٹ چند منٹ میں صاف کر دی'!

تم نے اتنے سارے لڈو، اور اتنی ساری ٹکیاں کلیم کو اس لیے بھیجی تھیں کہ روز روز بھیجنے کے بجائے بہتر یہ ہے کہ اکٹھی کافی بھیج

دی جا ہیں، اور وہ اطمینان سے کئی دن تک کھاتا رہے گا، لیکن اس نے ایک ہی دفعہ میں صفایا کر دیا، اس تیز دستی کا پرویز پر تو کوئی خاص اثر نہیں پڑا، لیکن قمر جو پرویز کے پیچھے پیچھے آئی تھی، اور دروازے کی اوٹ میں کھڑی، ان دونوں کی باتیں سن رہی اور کارروائیاں دیکھ رہی تھی، دل ہی دل میں ہنستے ہنستے لوٹ گئی، اسے کچھ ترس بھی آیا کہ پیہم مصیبتوں اور پریشانیوں نے اس بیچارے کو تدیدا بنا دیا ہے، اور کچھ بہ سادگی اور بے تکلفی کی ادا بھائی بھی، کہ آؤ دیکھا نہ تاؤ، ایک دفعہ جو شروع کیا تو ختم کر کے دم لیا، لیکن اپنی ہنسی اس نے روک لی، جی چاہا کہ واپس جائے، لیکن دل نے اس خواہش پر عمل نہیں کیا، وہیں کھڑی رہی، کلیم نے پلیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا،

"بے حیاؤ، !"

پرویز نے کسی طنز کے بغیر، کیونکہ وہ طنز کے استعمال، اور اس کے مفہوم سے ناواقف محض تھا سوال کیا،

"اور لے آؤں ؟"

کلیم نے کچھ دیر سوچا، پھر کہا،

"اگر تمھاری ممی دے دیں تو لے آؤ، !"

پرویز پلیٹ لے کر جانے کے لیے اٹھا، اتنی دیر میں قمر جلدی سے کھسک کر اپنے کمرے میں پہنچ چکی تھی، فوراً ہی پرویز بھی آگیا، اور

اس نے آنسے ہی تقاضہ کیا،

"ممی ممی، ———

قمر نے جھڑکتے ہوئے کہا، "کچھ کہو گے بھی ———

خواہ مخواہ ممی ممی کی رٹ لگا رکھی ہے۔؟"

اس نے کہا، "کلیم صاحب نے اور مانگا ہے'!"

وہ لیٹے سے اٹھ کر بیٹھ گئی، اور بالکل انجان بن کر پوچھا،

"کیا سب کھا لیا؟"

اس نے بتایا، "ہاں، ——— میں تو پہلے ہی کھا چکا تھا!"

"اور اب پھر مانگا ہے؟"

"ہاں، ———

"خدا خیر کرے، ——— دست آگئے تو مزا آجائے گا۔

لے جاؤ ———

یہ کہہ کر اس نے تھوڑی سی چیزیں اور پلیٹ میں رکھ دیں، پرویز جب جانے لگا تو مسکراتی ہوئی بولی،

"دلاری سے تھوڑا سا نمک جالینوس بھی لیتے جاؤ!"

وہ ہنستا ہوا چلا گیا۔

---

(۱۰)

لیکن یہ شخص جس کا نام کلیم ہے، ——— کیا ہے؟
جب سے یہ آیا تھا قمر کا سکون قلب جیسے کسی نے چھین لیا تھا،!
کتنے صبر، کتنے ضبط، کتنے حوصلے، اور کیسے عزم کے ساتھ اس نے دنیا کو، دنیا کی رنگینیوں کو، دل میں پیدا ہونے والی آرزوؤں اور تمناؤں کو مار دیا تھا، ہنسی، خوشی نشاط و طرب کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے ولولے کو، جوش کو، اپنی دنیا بسانے کے خیال کو، خیر باد کہہ دیا تھا، !

لیکن جب سے یہ دیوانہ شخص آیا تھا جسے نہ کھانے کا ہوش تھا نہ پینے کا، نہ سونے کا، نہ جاگنے کا، نہ باتیں کرنے کا، نہ باتیں سننے

کا، ـــــــــــ نہ اپنے آپ کا، وہ کتنی بدل گئی تھی؛ کتنا بڑا انقلاب آ گیا تھا دبے پاؤں اس کی زندگی میں'!

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اب تک وہ اپنے آپ کو دھوکا دیتی رہی تھی'!

اس کے دل میں وہ تمام ولولے' اور جذبے موجزن تھے، جو ایک نوجوان عورت کے سینے میں پیدا ہوتے اور مچلتے رہتے ہیں، لیکن اس نے انھیں دبا دیا تھا، اور اب وہ سینہ توڑ کر باہر نکلے رہے تھے'!

وہ بار بار اپنے دل ناتواں سے پوچھتی،

کیا میں نے اپنے سے جو عہد کیا تھا اس پر قائم رہ سکوں گی ؟
میں نے امی کے سامنے اپنے عزم واستقلال کا جو دعوے کیا تھا وہ کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ تو نہ جائے گا ؟

کیا اس سیلاب میں، جو کلیم کی صورت میں نمودار ہوا ہے، میں ایک حقیر اور بے مایہ تنکے کی طرح بہہ تو نہ جاؤں گی ؟

وہ گھنٹوں اور پہروں بستر پر لیٹی اپنے آپ کو ملامت کیا کرتی۔

یہ مجھے کیا ہو گیا ہے ؟
میں کس راستے پر چل رہی ہوں ؟ اس راستے کی منزل کیا ہے؟ انجام کیا ہے ؟ ـــــــــــ کیا میں منزل تک پہنچ سکوں گی'؟

کیا میں انجام کا مقابلہ کر سکوں گی؟ دیکھ سکوں گی اسے؟

اور پھر دل میں خیال آتا، میں کوئی جرم تو نہیں کر رہی ہوں، کوئی گناہ تو سرزد نہیں ہو رہا مجھ سے'؟

کیا محبت کرنا جرم ہے؟ ——— کیا سچی محبت گناہ ہے؟ لوگ بخار میں مبتلا ہوتے ہیں' دق کا شکار ہوتے ہیں، ——— امراض اور بیماریوں کا نزول ہوتا ہے ان پر' کیا انہیں بھی لوگ ملامت کرتے ہیں کہ تم بیمار کیوں ہوئے؟ کیا وہ بھی مستحق لعن وطعن ہوتے ہیں' ——— نہیں' ایسا تو نہیں ہوتا، لوگ ان سے ہمدردی کرتے ہیں، ان کا دکھ بٹانے کی کوشش کرتے ہیں،

پھر اگر میں محبت کی بیماری میں مبتلا ہو گئی تو کون سا جرم ہو گیا! کون سی خطا ہو گئی؟ مجھے لوگ کیوں ملامت کریں گے؟ میں لعن و طعن کی سزاوار کیوں قرار دی جاؤں گی؟ ——— کیوں؟ کس لیے؟

اور یہ شخص جو میرے دل میں آن کر بیٹھ گیا ہے' کیسا عجیب آدمی ہے'! ——— جوان ہے' خوب رو ہے، خوش اندام ہے' لیکن' نہ اپنے آپ کو ہیرو سمجھتا ہے' نہ اپنے تئیں اس کا مستحق سمجھتا ہے کہ اسے چاہا جائے' یہ ہر خواہش سے، ہر شوق سے، ہر آرزو سے آزاد ہے، کھانا مل جائے تو کھا لیتا ہے' نہ ملے تو مانگتا نہیں کسی کام سے رات بھر جاگنا پڑے تو

نیند کا شکوہ نہیں کرتا، کوئی کام نہ ہو تو اس طرح ٹانگیں پھیلا کر سوتا ہے جیسے گھوڑے بیچ کر سو رہا ہو، جس یکسوئی سے ابو محمد صاحب کی باتیں سنتا ہے، جس توجہ سے عائشہ بی کی خرافات سنتا ہے، جس التفات سے دلاری کی باتوں پر کان دھرتا ہے، اس سے زیادہ یکسوئی، توجہ، اور التفات پرویز کی بے معنی، مسلسل، اور سر میں درد پیدا کر دینے والی باتوں پر صرف کر دیتا ہے،

ایک آدھ مرتبہ کے سوا اس نے مجھے کبھی نہیں دیکھا، اور جو کچھ دیکھا وہ بھی ایک جھلک سے زیادہ نہ تھا، لیکن میری ذات میں بھی کتنی دلچسپی لیتا ہے، پرویز سے کرید کرید کر میرے متعلق باتیں کیا کرتا ہے، جیسے یہ ایسی داستان ہے جس کی دلچسپی کی کوئی انتہا نہیں، جیسے یہ ایسا ذکر ہے کہ ——————

وہ کہے اور سنا کرے کوئی،

کیوں؟

ایسا کیوں ہوتا ہے؟

اس کا سبب کیا ہے؟

کیا وہ مجھ سے محبت کرنے لگا ہے؟

کیا واقعی دل کو دل سے راہ ہوتی ہے؟

کیا یہاں وہ اسی لیے ٹک گیا ہے کہ میری چاہت نے اس کے پاؤں روک لیے تھے؟

نہیں، یہ ان ہونی سی بات ہے'! !

میں تو اسے آڑ سے دیکھتی رہتی ہوں گھنٹوں، اور پہروں دیکھتی رہتی ہوں، اس کی باتیں سنتی رہتی ہوں، گھنٹوں اور پہروں سنتی رہتی ہوں اس کی دل میں کھب جانے والی سادگی، معصومیت، اور نیکی کے نظارے کرتی رہتی ہوں، گھنٹوں اور پہروں نظارے کا سلسلہ جاری رکھتی ہوں، ——— مجھے تو اس سے محبت کرنے کا، اسے چاہنے کا، اس کی پرستش کرنے کا حق ہے، میں تو اس سے محبت کرنے پر مجبور ہوں،

لیکن وہ ؟

وہ مجھے کیا جانے ؟

اس نے کبھی میری کوئی بات نہیں سنی، شاید کبھی آواز سن لی ہو اس نے کبھی مجھے دیکھا نہیں، بس ایک آدھ بار جھپاک دیکھ لی، وہ میری عادات و خصائل سے ناواقف ہے، میرے مزاج، میری سرشت میری فطرت، میری جبلت کا اُسے کیا اندازہ ؟

وہ مجھ سے کس طرح محبت کر سکتا ہے ؟

وہ مجھ سے کیوں محبت کرے گا، ؟

بھلا ان دیکھی محبت بھی کبھی پروان چڑھ سکتی ہے ؟

نہیں وہ مجھ سے محبت نہیں کرتا، کر ہی نہیں سکتا، اسے مجھ سے محبت کرنی بھی نہیں چاہیے'، !

مجھ سے ؟ —— بھلا مجھ سے کوئی محبت کر بھی سکتا ہے ؟ جب سگے بھائی نہ چاہ سکے، تو کسی اور کا کیا سر پھرا ہے کہ مجھے چاہنے بیٹھ جائے گا، ؟ —— ہاں میں بے شک محبت کرتی ہوں اس سے، لیکن کیا اس بوجھ کو میں اٹھا سکوں گی ؟

کیا مجھ میں اتنی ہمت، اتنی سکت ہے ؟

کوئی بات نہیں، !

خاموش محبت، پہاڑ کی طرح بوجھل نہیں ہوتی، یہ پھول کی طرح سبک اور لطیف ہوتی ہے، اللہ میری یہ محبت خاموش محبت کے سوا اور ہے کیا ؟

کیا یہ لفظ کبھی میری زبان سے نکل سکتا ہے ؟

کیا میں کبھی اپنی محبت کا، اپنے سوز دروں کا اظہار کر سکتی ہوں؟!

جیتے جی تو یہ نہیں ہو سکتا، ہاں مرنے کے بعد لوگ جتنے اور جیسے چاہیں افسانے تراش لیں، !

---

(۱۱)

کئی دن سے قمر اسی طرح کی ذہنی کشمکش میں گرفتار تھی، کبھی عائشہ بی کی غیر دلچسپ باتیں سننے بیٹھ جاتی، کبھی دلاری کی افسانہ طرازیوں میں خواہ مخواہ زیادہ سے وقت صرف کر دیتی، کبھی ابو محمد صاحب کے عہد گذشتہ کی باتیں فرضی اور مصنوعی انہماک سے سنتی، کبھی پرویز سے خود ادھر ادھر کی بے معنی اور بے تعلق باتیں کرنے لگتی، اور کرتی رہتی، مقصد یہ کہ دل و دماغ پر جو کیفیت طاری ہے وہ دور ہو جائے ——— دور نہ ہو کم ہی ہو جائے۔

لیکن اس کوشش میں ذرا بھی کامیابی نہ ہوئی!

ایک روز تنہا اور خاموش بیٹھی تھی کہ ابو محمد صاحب بغل میں بہی کھاتہ دبائے تشریف لائے، اب کام ہی کیا رہ گیا تھا، اور آمدنی ہی کیا تھی؟ لیکن وہ اصول کے پکے تھے، آمدنی بالکل نہ ہو تب بھی ان کا بہی کھاتہ مکمّل رہتا تھا،!

پہلے تو اس کا جی چاہا کہ ابو محمد صاحب کو الٹے پاؤں واپس کر دے، جب جائداد تھی، دولت تھی، لین دین تھا، روپے کی ریل پیل تھی، اس وقت تو اس بہی کھاتے کا، اس حساب فہمی کا، کچھ تک بھی تھا، اب سب کچھ کھو کر بھی، ضابطہ اور اصول کی اتنی سخت پیروی اسے گوارا نہ تھی، پھر یہ سوچ کر کہ ذرا جی بہل جائے گا، وہ خاموش ہو گئی، ابو محمد صاحب آئے، اور بہی کھاتہ کھول کر سامنے رکھ دیا،

ثمرتے بے دلی کے ساتھ ورق الٹنا پلٹنا شروع کر دیے، دفعتہً اس نے کہا،

"یہ صفحہ آپ کا لکھا ہوا تو نہیں ہے، ؟"

اتنے نازک اختساب کا انہیں ذرا بھی اندیشہ نہ تھا، پہلے تو سٹ پٹا گئے، پھر زور سے ایک قہقہہ لگایا، پھر فرمایا،

"خوب پہچانا، ——— ہاں بیٹی یہ میرا لکھا ہوا نہیں ہے، !"

"پھر کس نے لکھا ہے ؟"

"کلیم نے، ———— میری تو ذرا طبیعت خراب تھی،
سچ کہنا کتنا اچھا خط ہے'!"

نمر نے ان باتوں میں سے کسی بات پر نہ زیادہ توجہ کی نہ کسی کا
جواب دیا، دفعتہً اس نے ایک سوال اور کر ڈالا۔

کلیم صاحب کو کام کرتے ہوئے شاید یہ تیسرا مہینہ ہے؟"

"ہاں بیٹی، ———— تیسرے مہینے کے بھی پندرہ
دن گزر گئے،؟"

"کیا آپ نے انھیں تنخواہ دے دی،؟"

ابو محمد صاحب ایک مرتبہ پھر بوکھلا گئے،

"تنخواہ ———— ؟"

اس نے زور دے کر کہا،

"جی ہاں میں نے یہی لفظ کہا تھا، تنخواہ'!"

وہ بولے، "ابھی نہیں دی'!"

"دلاری کو دے دی؟"

"کب کی، ———— وہ تو اتنی خراچ ہے کہ ہمیشہ پیشگی
لیتی رہتی ہے'!"

"بھنگی کا حساب صاف کر دیا'!"

"ہاں بیٹی کر دیا'!"

"دھوبی اور بہشتی کا؟"

" ان دونوں کا بھی ،!"

" تنہ مدنزا ئد صرف کلیم صاحب تھے ، اس لیے محروم رہ گئے

اچھا انصاف ہے آپ کا ،!"

بیٹی بات یہ نہیں ہے ، ——— اصل میں انھوں

نے مانگا ہی نہیں ،!"

" اور اگر وہ کبھی نہ مانگیں تو ؟ "

" (خفیف ہو کر ہنستے ہوئے) ایسا بھلا کیسے ہو سکتا ہے ؟"

" میں نے جہاں تک اندازہ لگایا ہے ، وہ اس طبیعت کے

آدمی ہیں ، ہر گز حرف مطلب زبان پر نہیں لائیں گے ، ایسے شخص کا تو

خود ہی حساب صاف کر دینا چاہیئے بابا ——— تاخیر سے

کتنی تکلیف ہوئی ہوگی ، تنخواہ دے دیجئے اور میری طرف سے

معذرت بھی کر دیجیئے ،!"

ابو محمد صاحب اٹھ کھڑے ہوئے " ابھی دے دیتا

ہوں ، اپنی اور تمھاری دونوں کی طرف سے معذرت کر دوں گا ،

لیکن بیٹی دیکھ لینا یہ سارے روپے وہ گنوا دے گا ،!"

" گنوا دے گا ، ——— کیوں ؟ "

" وہ کچھ ایسا ہی سیلانی قسم کا آدمی ہے ، ———

بیچارے کی تنخواہ ہی کتنی ہے ، میں نے سوچا تھا جب کافی رقم

جمع ہو جائے گی ، تو دے دوں گا ، کچھ کام بھی آسکے گی ،!"

"نہیں!!، ـــــــــ جس کی رقم ہے اسے پہنچ جاؤ چاہیے، ہمیں اس سے کیا کہ وہ اس کا کیا کرتا ہے، ؟ چاہے سڑک پر پھینک دے، یا مٹھائی کھالے ؟ یا کسی کو بخش دے وہ جانے اور ان کا کام، ! ـــــــــ وہ کوئی بچے تو ہیں نہیں کہ ہم ان کی رکھوالی کرتے پھریں، آپ تو بس ان کی جو رقم واجب ہوتی ہے وہ دے دیجئے، !!"

"ہاں بیٹی ابھی لو، واقعی مجھ سے بڑی چوک ہو گئی ـــــــــ لیکن غلطی آدمی ہی سے ہوتی ہے، ؟"

یہ کہہ کر ابو محمد صاحب نے پھر ایک مرتبہ کھاتہ بغل میں دبایا اور باہر تشریف لے گئے،

ابو محمد کے جانے کے بعد، قمر نے ایک ٹھنڈی سانس لی، اور کوئی کتاب لے کر بیٹھ گئی، تاکہ خیالات بٹ جائیں، اور وہ خیال قریب نہ پھٹکے جس نے دن کا چین اور رات کی نیند حرام کر دی تھی، کتاب دلچسپ تھی، طبیعت لگ گئی، اور وہ اس میں منہمک اور مستغرق ہو گئی، !

(١٣)

بڑی دیر تک وہ کتاب پڑھتی رہی، جب تقریباً سو صفحے پڑھ چکی تو نظر اٹھا کر صحن کی طرف دیکھا دھوپ زرد پڑ چکی تھی، اور سورج مائل بہ غروب تھا، اس نے نشانی لگا کر کتاب بند کی، جلدی جلدی وضو کیا، اور نماز پڑھنے کھڑی ہو گئی،

نماز سے فارغ ہوئی تو پرویز صاحب دولہا بنے تشریف

لا رہے ہیں،!

طمنچہ، بندوق، موٹر، کشتی، ہاتھی، اونٹ، گھوڑا، ایک چھوٹی سی میز، ایک چھوٹا سا بالکل ننھا منا سا فاؤنٹین پن،!! ان تمام چیزوں کے ساتھ لدے پھندے تشریف لائے، اور تم کے

سامنے یہ سارا مال ڈھیر کر دیا،

اتنی ساری چیزوں کو دیکھ کر قمر مبہوت ہو گئی، اس نے پوچھا،

"ارے یہ چیزیں کہاں سے اٹھا لایا؟"

وہ بولا، "اٹھا کیوں لاتا، کلیم صاحب نے دی ہیں؟"

اس نے اور زیادہ متحیر ہو کر پوچھا،

"کلیم صاحب نے دی ہیں؟ ——— کیوں؟"

اس نے جواب دیا، "ممی کیا میں کہیں سے چرا لایا ہوں،؟ ——— ——— پوچھ لو ان سے'!"

"لیکن تو نے لی کیوں؟"

"میں کب لے رہا تھا، انھوں نے زبردستی دے دیں'!"

"کمبخت تو نے تو لوٹ لیا انھیں، ——— ساری تنخواہ ان کی خرچ کرا دی'!" ——— کے مرتبہ کہا ہے کہ بغیر مجھ سے پوچھے کسی سے کوئی چیز نہ لیا کر'!"

نہایت برجستگی کے ساتھ پرویز نے جواب دیا،

"پوچھنے ہی تو آیا ہوں،!"

اس جواب پر غصّہ اور صدمہ کے باوجود، قمر کے ہونٹوں پر تبسم کے آثار نمایاں ہو گئے، اس نے دلاری کو آواز دی، وہ فوراً آموجود ہوئی، اس نے کہا،

"جا دیکھ کلیم صاحب باہر ہیں؟"

دلاری باہر چلی تو پرویز نے بتایا، "باہر ہی تو ہیں،!"

قمر نے دلاری سے کہا، میرے ساتھ چل، اور جو کچھ میں کہوں وہ ان سے کہتی جا، !"

پرویز نے پوچھا "میں بھی چلوں؟"

اس نے جواب دیا، "خبردار جو اپنی جگہ سے جنبش کی، چپ چاپ یہیں بیٹھے رہو!"

کلیم برآمدے میں ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا، اور سگریٹ پی رہا تھا، قمر آئی اور دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہوگئی، جہاں کھڑی ہو کر اکثر وہ کلیم کو دیکھا کرتی، اور اس کی دل میں اتر جانے والی باتیں سنا کرتی تھی، دلاری اسے وہاں چھوڑ کر باہر آگئی، اس نے کلیم سے کہا،

"بٹیا آپ سے کچھ پوچھ رہی ہیں،!"

کلیم نے جلتا ہوا سگریٹ لان پر پھینک دیا، اور کہا۔

"پوچھیں ———

دلاری کو اس جواب پر ہنسی آگئی،

قمر نے دلاری سے کہا،

"پوچھو، آپ نے اتنی ساری چیزیں پرویز کو کیوں دلا دیں؟"

دلاری نے یہ الفاظ دوہرائے کہ بٹیا پوچھتی ہیں، اتنی بہت

ساری چیزیں آپ نے پرویز کو کیوں دلا دیں؟"

کلیم نے پوچھا، "پھر کسے دلاتا؟"

یہ ایک جواب تھا، جس نے دلاری اور قمر دونوں کو تھوڑی دیر کے لئے ششدر، اور لاجواب کر دیا، لیکن دلاری بھی ایک ایک ہی تیز طرار تھی، بھلا خاموش کیا رہتی، کہنے لگی،

"ہم نے کیا خطا کی تھی؟"

کلیم نے کہا، "اگلے مہینہ میں تمھیں دلا دیں گے،!"

دلاری نے سوال کیا، "تو کیا آپ اسی طرح ہر مہینے تنخواہ لٹاتے رہیں گے؟"

کلیم نے جواب میں کچھ کہنا چاہا تھا کہ قمر کی طرف سے دلاری نے کہا،

"بٹیا کہتی ہیں، یہ تنخواہ اس لئے ہے کہ اس سے آپ اپنی ضرورتیں پوری کریں اس لئے تو نہیں ہے کہ اسے یوں خرچ کر دیں،!"

کلیم نے کہا، "لیکن میری تو ہر ضرورت بٹیا پوری کر دیتی ہیں،!"

کلیم کے منہ سے اپنے لئے یہ اپنایت سے بھرا ہوا لفظ سنکر قمر کا دل ڈوبنے لگا، اس کی طرف سے پھر دلاری نے کہا،

"بٹیا کہتی ہیں، یہاں کھانے کے سوا، اور آپ کی کون سی ضرورت پوری ہوتی ہے، ؟"

وہ بولا، "اس کے سوا اور میری ضرورت ہے بھی کیا ؟"

قمر اس جواب کی بلندی پر غور کرنے لگی، اور آج پہلی مرتبہ ولاری بھی جو ہمیشہ اسے چٹکیوں میں اڑایا کرتی تھی سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ یہ کس قسم کا شخص ہے ؟ یہ دنیا میں رہ کر دنیا والوں سے اتنا الگ، اتنا بے گانہ، اور اتنا غیر متعلق کیوں ہے، ؟ اس نے قمر کی طرف دیکھے اور اس سے کوئی ہدایت لئے بغیر اپنی طرف سے کہا،

"بس ——— آپ کی ضرورت صرف اتنی ہی ہے ؟"

وہ کہنے لگا، "سب کی ضرورت صرف اتنی ہی ہے، !"

وہ گویا ہوئی، "لیکن دوسرے لوگوں کا تو سینکڑوں میں بھی پورا نہیں ہوتا، ہزاروں سے بھی ضرورتیں دفع نہیں ہوتیں، آپ کے لئے تیس روپے بھی زیادہ ہیں، ؟" ——— آخر آپ آدمی ہیں یا فرشتہ ؟"

کلیم ہنسنے لگا، پھر اس نے کہا

"کیا فرشتے بھی آسمان سے اتر کر، آدمیوں کے درمیان رہنے سکتے ہیں ؟"

وہ بولی، "پہلے تو میں ایسا نہیں سمجھتی تھی، لیکن اب تو یہی خیال ہے میرا، !"

کلیم نے زیر لب تبسّم کے ساتھ کچھ کہنا چاہا، لیکن ایک مرتبہ پھر قمر کی ہدایت پاکر اس کی طرف سے دلاری بولی،

"بٹیا کہتی ہیں یہ چیزیں لاکر آپ نے ظلم کیا، آئندہ ایسا کبھی نہ کیجیے گا، اور یہ چیزیں جو لائے ہیں، ان کی قیمت لے لیجیے!"

اب تک کلیم خاموشی سے، بلکہ ایک حد تک لطف لے لے کر یہ باتیں سن رہا تھا، لیکن اب دفعتہً اس کا رنگ. رخ بدل گیا اس نے کہا،

"دلاری تم جھوٹ بولتی ہو، بٹیا مجھے سوداگر نہیں سمجھتیں، وہ مجھے اتنا برا نہیں سمجھتیں جتنا تم خیال کرتی ہو، اپنی طرف سے جو چاہو کہہ لو، میں سن لوں گا، ہنس کر ٹال دوں گا، لیکن ایسی باتیں تمھارے منہ سے نہیں سن سکتا، جو کبھی بھی بٹیا کے منہ سے نہیں نکل سکتیں، ———— تم ان کی توہین کرتی ہو؟"

اس زور کلام سے دلاری کچھ چکرا سی گئی، اس نے مدد کے لیے قمر کی طرف دیکھا، تو وہ مسکرا رہی تھی، آخر خود ہی اپنی طرف سے بولی، "واہ اچھے آئے مجھے جھوٹا کہنے والے،!!"

قمر نے انگلی سے اشارہ کیا "چپ،!!"

وہ چپ ہو گئی، !کلیم نے جوش اور غرور کے ساتھ کہا۔

"تم اتنے دنوں سے بٹیا کے ساتھ رہتی ہو، ان کی خدمت کرتی ہو، لیکن اب تک انھیں نہ سمجھ سکیں، ؟ اب تک نہ جان

سکیں کہ وہ کتنی اونچی، کتنی اچھی، اور کتنی نیک ہیں، ؟ ــــــــ
میں بھی تمھاری طرح بٹیا کا، اس گھر کا چاکر ہوں، وہ پرویز کو
کتنا زیادہ چاہتی ہیں میں جانتا ہوں، پھر کیا میرا یہ فرض نہیں
ہے کہ اسے ان سے بھی زیادہ چاہوں، ؟ اور کیا میری چاہت کا
یہ تقاضہ نہیں ہے کہ جو کچھ بھی میرے پاس ہو، جو کچھ بھی میں کماؤں
سب اس پر قربان کر دوں ؟ "

دلاری یہ باتیں سن رہی تھی اور سراپا حیرت بنی اسے دیکھ
رہی تھی، کئی مرتبہ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن لب کھل کر رہ گئے
بات منہ سے نہ نکل سکی، آخر میں اس نے کہا،

" جاؤ چلی جاؤ، خبردار آئندہ ایسی باتیں نہ کہنا، با"

قمر نے اپنے کمرے کی طرف آہستہ آہستہ جاتے ہوئے
اس طرح کہ پاؤں کی چاپ تک سنائی نہ دے، ہاتھ کے اشارہ
سے دلاری کو واپس بلا لیا اور وہ بادل نخواستہ واپس چلی آئی،
ورنہ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اس پاگل شخص سے لڑ جائے اس وقت!

" اور تمھارا کتنا لحاظ اور خیال کرتے ہیں،"!

قمر چونک پڑی، کیا دل کا چور پکڑ لیا گیا، اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا، جیسے کوئی مجرم چوری کرتا ہوا عین موقع واردات پر گرفتار کر لیا جائے، دلاری کے لیئے اتنا کافی تھا اس نے جو کچھ سوچا تھا وہ بالکل ٹھیک نکلا، کہنے لگی،

" اتنا خیال کرتے ہیں، اتنا خیال کرتے ہیں کہ کیا کہوں، ——

قمر نے تیوری چڑھاکر ٹوکا، " یہ کیا بک رہی ہے تو ؟"

وہ بولی، " تو کیا جھوٹ کہتی ہوں، ابھی کل ہی کا تو واقعہ ہے، میری طبیعت کسلمند تھی، سوچا کلیم میاں جلدی سے کھانا کھالیں تو سونے کے لیئے لیٹ جاؤں، اور وہ کبھی بھی نو بجے رات سے پہلے کھاتے نہیں آخر جب پہونچی، میں نے کہا،

" کھانا لے آؤں میاں ؟"

کوئی کتاب پڑھ رہے تھے بیٹھے ہوئے جواب ہی نہیں دیا، میں نے پھر وہی بات دوہرائی، کتاب پر نظر جمائے جمائے بولے،

" یہ بھی کوئی کھانے کا وقت ہے، —— ابھی نہیں ابھی بھوک لگنے میں دو گھنٹے کی دیر ہے "!!

میں نے دل میں کہا لو بھیّا بجے رات کے دس، آخر ایک تدبیر ذہن میں آئی، میں نے کہا،

" مجھے کیا ہے جب کہیئے لے آؤں گی، —— بٹیا کہہ

رہی تھیں، ذرا کلیم صاحب کو جلدی کھانا کھلا دے، پھر آکر میرا سر داب نہ جانے کیوں صبح سے درد کر رہا ہے"!

فوراً کتاب بند کر دی کہنے لگے، "بٹیا کہہ رہی تھیں تو لے آئی ہو تم، پوچھنے کیوں آئیں"؟"

مجھے ہنسی تو بہت آئی لیکن چپ رہی، لاکر کھانا سامنے رکھ دیا، ایک لقمہ کھایا ہو گا کہ ہاتھ روک لیا، کہنے لگے،

"تم نے کہا تھا بٹیا کے سر میں درد ہو رہا ہے؟"

میں نے جواب دیا، "ہاں ہو تو رہا ہے"!"

کچھ نہیں بولے، جلدی جلدی کھانا کھایا، اور، اٹھ کھڑے ہوئے میں نے کہا "بس؟"

بولے، "ہاں پیٹ بھر گیا"!"

میں برتن لے کر اندر چلی آئی، اور چپ چاپ بستر پر لیٹ گئی لیکن نیند نہ جانے کہاں بھاگ گئی، کوئی دس بجے کے قریب کسی نے دروازے پر دستک دی، پھر آواز آئی، "دلاری"!"

پہلے تو جی چاہا، سستی مارے پڑی رہوں، لیکن پھر دستک ہوئی اور پھر آواز آئی، اور یہ آواز کلیم میاں کی تھی، میں نے کہا خدا خیر کرے، آج ماش کی دھوئی ہوئی دال پکی تھی، اور ذرا کچی رہ گئی تھی، کہیں وہ تو رنگ نہیں لائی، گھبرا کر اٹھی، اور باہر پہنچی، تو دیکھتی کیا ہوں کلیم میاں کھڑے ہیں، لیکن کس طرح؟ پسینے میں شرابور،

چہرے کا رنگ سرخ، اور، سانس زور زور سے چل رہا تھا، بُبیا میرا دل تو دھک سے ہوگیا، میں نے کہا ضرور کوئی خاص بات ہے، بہرحال سوال کیا،

"کیا بات ہے کلیم میاں خیر تو ہے،؟"

کہنے لگے، "کہو، اب ٹیپلک کے دردِ سر کا کیا حال ہے؟"

آدمی جب ایک دفعہ جھوٹ بولتا ہے، تو کئی دفعہ بات بنانے کے لئے بولنا پڑتا ہے، پھر ایک دفعہ جھوٹ بولی،

"کچھ کم تو ہے، لیکن ہے،!"

کہنے لگے "کہیں سر دبانے سے درد جاتا ہے، دوا سے جاتا ہے، یہ لو اسپرین کی ٹکیاں ——— ایک ابھی کھلا دو، ایک گھنٹہ بھر کے بعد کھلا دینا، اور ایک پھر گھنٹہ بھر کے بعد،!"

ہنسی تو بہت آئی، جیسے ساری رات درد ہوتا رہے گا، اور اسپرین کی ٹکیوں کا خدانخواستہ دور جاری رہے گا، مگر ضبط کر گئی، میں نے پوچھا،

"لیکن یہ آپ لائے کہاں سے ؟" کہنے لگے، "شہر سے لایا ہوں، اور کہاں سے لاتا،!"

ہم نے حیران ہو کر پوچھا، کیا آپ شہر گئے تھے اس وقت، وہ جواب دیا، "پھر اور کہاں جاتا اس وقت، ——— بھلا یہ چیز، چیز پر اتنا زور دیا جیسے کہہ رہے ہوں اکسیر، ———

یہاں کہیں بھی مل سکتی تھی'، ؟"

میں نے سوال کیا، لیکن آپ شہر کس طرح گئے تھے ؟"

کہنے لگے، "جس طرح جانا چاہیے تھا، ——— کوئی سواری تو تھی نہیں، پیدل گیا تھا'، !"

بیچارے جھوٹ کبھی نہیں بولتے، جو بات بھی ہو سچ سچ کہہ دیتے ہیں، میں نے کہا،

"لیکن، اتنی رات کو'، !"

جواب دیا "ضرورت اب تھی جاتا صبح'، !"

میں الجھ پڑی، "لیکن راستے میں دریا بھی تو پڑتا ہے، جنگل بھی تو آتا ہے، چور، اور سانپ کا خطرہ بھی تو تھا'، !" فاصلہ بھی آٹھ میل کا ہے'، !"

بڑی بے پروائی سے بولے، "تو کیا ہوا، مجھے تیرنا بھی تو آتا ہے چوروں کا سامنا ہو تو لڑ بھی سکتا ہوں'، سانپ کاٹ کھائے تو مرجانے میں بھی عذر نہیں'، ! اور فاصلہ کی میں پرواہ کرتا نہیں'، !"

سچ کہنا کیسی عجیب باتیں تھیں، وہ کہہ رہے تھے، اور میں سن رہی تھی، حیران، پریشان، سوچ رہی تھی یہ کون شخص ہے ؟ کیسا آدمی ہے'، ؟ کیا ہے ؟ اسے کیا ہوگیا ہے ؟ کسی آرزو میں تو مبتلا نہیں ہے، آخر جب ان کی بات ختم ہوئی تو میں نے کہا،

——— "یہ سارے پاپڑ آپ نے کیوں بیلے'، ؟

اسپرین کی چند ٹکیوں کے لئے، !"

میرے یہ الفاظ اتنے بڑے لگے کہ خفا ہو گئے، مجھے گھور کر دیکھا، پھر ایک دم ٹھنڈے پڑ گئے، بڑے نرم اور ملائم لہجہ میں کہا،

" دلاری تم نہیں جانتیں تمہاری بٹیا کی جان کتنی قیمتی ہے، اسے بچانے کے لئے، تو یہ ساری دنیا قربان کر دی جا سکتی ہے، !"

جی چاہا ٹھٹھا مار کر ہنسوں، لیکن مسکرا کر رہ گئی، میں نے چھیڑتے ہوئے کہا،

" کیا یہ ساری دنیا آپ کی جاگیر ہے، !"

کچھ نہیں بولے، اور ماتھے سے ٹپ ٹپ ٹپکتے ہوئے پسینے کو پونچھنے لگے، میں نے سوال کیا،

" اتنا پسینہ کیوں آ رہا ہے ؟"

ذرا کے ذرا مسکرائے، جیسے بادل کی اوٹ سے چاند نکل آتا ہے، پھر کہنے لگے،

" تو کیا آٹھ میل پیدل چلنے کے بعد کمبل اوڑھنے کا جی چاہنے لگتا ہے، ؟"

میں نے پھر ایک سوال کیا، " آپ کا سانس کیوں پھولا ہوا ہے ——— کیا دوڑتے ہوئے آئے ہیں، ——— ؟"

ذرا سے تامل کے بعد جواب دیا، " ہاں پھر اور کیا کرتا ؟"

میں نے اپنا بیت کے انداز میں خفا ہوتے ہوئے دریافت کیا،

ایک تو اتنا بڑا آٹھ میل کا دھاوا مارا یہی بہت تھا، پھر دوڑنے کی کیا ضرورت تھی؟"

جواب کیا دیتے ہیں، "پھر جلدی کیسے پہنچتا، ــــــــ بار بار میرے دل میں خیال آ رہا تھا کہیں درد بڑھ نہ گیا ہو، وہ تو جب تم نے بتایا ہے کہ اب پہلے سے کم ہے تو ذرا دل ٹھہرا ہے'!"

"دل ٹھہرا ہے'؟" میں نہ جانے کیوں سوچنے لگی، کیا اس شخص کے سینے میں بھی دل ہے؟ اور وہ دھڑکتا بھی ہے؟'۔ ــــــــ لیکن اگر دھڑکتا ہے تو کیوں؟ کس کے لئے؟"

لیکن یہ باتیں سوچنے ہی کی تھیں، کہنے کی تو نہ تھیں، منہ سے تو نکالنا مناسب نہ تھا، دل پر جبر کر کے تو یہ زبان پر جبر کر کے خاموش ہو رہی، لیکن سچ کہتی ہوں، بڑا ترس آیا مجھے ان کا یہ حال دیکھ کر، ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی، پاؤں گرد سے اٹے ہوئے، چہرے پر ہوائیاں، آنکھوں میں کچھ عجیب طرح کا کرب، اور پسینے پسینے، تھکان اور تھکن سے بدن بدن چور، گو جی تو نہیں چاہ رہا تھا، لیکن یوں ہی پوچھ لیا،

"کیا چائے پئیں گے؟ ــــــــ لاؤں؟"

(۱۴)

پھر خفا ہو گئے، کہنے لگے، "جا کر سر دابو، اسپرین کی ٹکیاں استعمال کراؤ، چائے وائے کی کوئی ضرورت نہیں ہے"!"

میں نے کہا، "ابھی بتا تو چکی ہوں، اب کم ہے درد، اور وہ آرام سے سو رہی ہیں، کیا جگا کر ٹکیاں کھلاؤں؟ ——————

یہ سنکر کس مزے میں کہتے ہیں، "یہ بات ہے تو اچھا لے آؤ پھر"!"

یا تو سرِ شام کھانا کھلا کر نچنت ہو گئی تھی، یا اب چائے بنانے کے لئے چولھا پھونکنے بیٹھ گئی، خیر جیسے تیسے چائے تیار ہو گئی، اور میں لے کر ان کے کمرے میں پہنچی، میرا خیال تھا، اتنی دیر میں نہا

دھوکر، یا کم از کم ہاتھ پاؤں دھو کر آدمی بن گئے ہوں گے، لیکن دیکھتی کیا ہوں، وہ تو کمرے کے اندر ٹہل رہے ہیں، اور اس طرح ٹہل رہے ہیں، جیسے کوئی بڑی اہم بات سوچ رہے ہیں، میں نے چائے کی ٹرے میز پہ رکھتے ہوئے کہا،

"کیا سوچ رہے ہیں آپ کلیم میاں؟"

کہنے لگے، "سوال یہ ہے کہ سر میں درد ہوا کیوں؟"

لاکھ لاکھ ضبط کرنے کے باوجود بھی ہنسی نہ رک سکی، میں کھلکھلا کر ہنس پڑی، ٹہلتے ٹہلتے ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے، پوچھا،

"ہنس کیوں رہی ہو؟"

میں نے کہا، "کلیم میاں آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں، کس کے سر میں درد نہیں ہوتا، یہ تو سب ہی کے ہوا کرتا ہے، ہوتا ہے، اور ٹھیک ہو جاتا ہے!"

ٹہلنا چھوڑ کر قریب آئے، اور کرسی پر بیٹھ گئے، لیکن خیال کی دنیا میں اب تک تھے، کہنے لگے،

"مگر نہیں ہونا چاہئے!"

میں نے پوچھا، "کیا؟"

کہنے لگے، "درد!"

بے ساختہ منہ سے نکل گیا، "کیا آپ کبھی درد سر میں مبتلا نہیں ہوئے!"

جواب میں کہا، "وہ تو اس وقت بھی ہو رہا ہے!" ——

اکثر ہوتا رہتا ہے؟"

میں نے کہا، "پھر اگر بٹیا کر ہو گیا، تو کون سا غضب ہو گیا، وہ بھی ہماری آپ کی طرح آدمی ہیں'!"

لیکن میری اس بات سے انھوں نے اختلاف کیا، کہنے لگے، "نہیں —— وہ مجھ سے اور تم سے' ہم سب سے الگ ہیں'!"

میں نے دریافت کیا، "یہ کیوں؟"

فرمانے لگے، "وہ بہت کمزور ہیں' انھیں بیمار نہیں ہونا چاہیے

میں بھی جیسے پیچھے پڑ گئی تھی ہاتھ دھو کر پوچھ بیٹھی۔

"آپ کو کیا معلوم کہ وہ کمزور ہیں'؟ —— کیا آپ نے انھیں دیکھا ہے'؟"

بالکل اسی طرح جیسے کوئی خاص، غیر معمولی، اور اہم بات نہیں جیسے اس میں کوئی برائی نہیں، جیسے یہ ایک بالکل معمولی بات ہے، بڑی سادگی سے جواب دیا،

"ہاں کیوں نہیں، —— کئی بار'!"

یہ نئی اور عجیب بات سنکر مجھ پر تو سناٹا چھا گیا، میں نے پھر پوچھا،

"لیکن آپ نے کیسے دیکھا انھیں؟"

جواب ایسا دیا جو کوشش کے باوجود میری سمجھ میں نہیں آیا،
کہنے لگے، "کون ہے جو سورج کو نہیں دیکھتا؟ کیا اس کے لئے کوشش
کرنا پڑتی ہے؟ کون ہے جو چاند کو نہیں دیکھتا، کیا اس کے لئے تیاری
کرنا پڑتی ہے؟ کون ہے جو تاروں کو نہیں دیکھتا کیا اس کے لئے تاک
جھانک کرنا پڑتی ہے؟!"

میں کچھ سوال کرنے کو تھی کہ بڑے جوش کے ساتھ گویا ہوئے،
"سورج کی روشنی ہی سورج ہے، چاند کی چاندنی ہی چاند
ہے، تاروں کی جھلملاہٹ اور جگمگاہٹ ہی کو تارا کہتے ہیں،!"

میں ہق دق کلیم میاں کا منہ دیکھ رہی تھی، وہ ایک عجیب
عالم میں، ایک عجیب تاثر کے عالم میں کہے جا رہے تھے؛
"پھر اگر میں نے انھیں دیکھ لیا تو تمہیں حیرت کیوں ہے؟"
اور پھر خود ہی بولے، "آنکھیں بند کر لینے پر بھی سورج کی جھلک
آنکھوں تک پہنچ ہی جاتی ہے،!"

بھلا ایسی باتیں کا ہے کو میرے باپ دادا نے بھی سنی ہوں گی،
پھر ذرا دیر کے لئے چپ ہو گئے، اور اس کے بعد گویا ہوئے،
"دلاری، شاید تم سوچ رہی ہو گی کہ میں مرد ہوں، وہ عورت
ہیں، میں ایک اجنبی مرد ہوں، وہ ایک غیر عورت ہیں، میں نے
اگر انھیں دیکھ لیا، تو بہت برا کیا، پاپ کیا، گناہ کیا، ——
لیکن اگر واقعی تمھارے ذہن میں یہ خیالات آرہے ہیں تو یہ تمہاری

بھول ہے، تمھاری غلطی ہے، تمھاری حماقت ہے'!"

میں نے جل کر کہا، "یہ تو آپ نے کوئی نئی بات نہیں کہی، ــــــ سب ہی مجھے احمق کہتے ہیں'!"

وہ ذرا کے ذرا مسکرائے، اور پھر اسی لب و لہجہ میں، جس میں عجیب طرح کا رعب تھا، شان تھی، دبدبہ تھا، کہنے لگے،

ایسی باتیں صرف وہی لوگ سوچ سکتے ہیں، جو حد سے زیادہ تنگ دل اور تنگ نظر ہوں، ــــــ ورنہ ذرا غور تو کرو، کوئی آج تک سورج پر بھی بری نظر ڈال سکا ہے؟ کسی نے آج تک چاند کو بھی خراب نظروں سے دیکھا ہے؟ کسی کے بارے تم نے سنا ہے کہ وہ تاروں کو بد نظر سے دیکھتا ہے؟"

پھر چپ ہو گئے، اور ذرا دیر کے بعد بولے،

"نہیں اب کبھی نہیں ہوا، ایسا کبھی نہیں ہو سکتا، بے شک میں نے تمھاری بٹیا کو بغیر کسی کوشش کے دیکھا ہے، اور وہی لمحے میری زندگی کا حاصل تھے، یہی وہ لمحات تھے جب میں ان کے فیض دیدار سے خود سراپا تجلّی بن گیا تھا،! ــــــ بھلا جسے، یہ نعمت، یہ عظمت، یہ دولت حاصل ہوئی ہو، وہ بد نظر ہو سکتا ہے، توبہ کرو توبہ،!"

میں نے دونوں کان پکڑ کر کہا، "ایک مرتبہ نہیں ہزار مرتبہ توبہ لیکن چائے تو پی لیجئے،!"

خاموش ہو گئے، پھر نہایت اطمینان سے چائے بنائی، اور ایک ایک گھونٹ کر کے اطمینان سے پی گئے،

اب رات کے گیارہ بج چکے تھے، میری نیند بھی غائب ہو چکی تھی، میں نے سوچا لاؤ ایک پیالی میں بھی نوش جاں فرماؤں، میں نے بھی ایک پیالی بنائی، پہلا گھونٹ پیا تھا کہ حلق کے نیچے نہ اتر سکا، جلدی سے باہر آئی اور کلی کر دی، پھر ان سے جا کر سوال کیا

"یہ آپ نے کیا پیا ہے؟"

بڑے اطمینان سے کہا،

"چائے پی ہے، ____ کیا کچھ اور لے آئی تھیں؟"

میں نے کہا، "میرے سرکار لائی تو چائے تھی، لیکن اتنی دیر تک آپ نے باتیں کیں کہ وہ ٹھنڈی پالا ہو گئی، آخر آپ کی حلق کے نیچے پوری پیالی کیسے اتر گئی، میں نے تو ایک گھونٹ پیا تھا، اور کلی کر آئی باہر جا کر،!"

بڑی معصومیت سے، جیسے پرویز بول رہا ہو، فرمانے لگے،

"ہاں ٹھنڈی تو ہو گئی تھی،!"

میں نے جل بھن کر کہا، "آخر ضرورت کیا تھی اتنی ٹھنڈی چائے پینے کی، ____ کہہ دیتے میں پھر گرم کر لاتی،!"

بڑی سنجیدگی سے پوچھا، "کیا آگ ہو گی؟"

میں نے کہا، "کیوں نہیں ہو گی؟"

کہنے لگے، "تو اب جاکر گرم کر لاؤ۔!"

"یہ لو، نہ ٹھنڈی چائے کا ہوش، نہ اسے پھر سے گرم کرانے میں تامل، میں کہتی ہوں، اگر ایسے آدمی کو بھی سودائی نہ کہا جائے تو کسے کہا جائے؟ خیر، کیتلی لے کر پھر باورچی خانہ میں پہنچی آگ تو تقریباً ختم ہو چکی تھی، بھوبل پر اسے گرم کیا، اور لے آئی، بڑے شوق سے پی، جب ٹرے لے کر جانے لگی، تو یوں ہی میرے منہ سے نکل گیا،

"کوئی کام تو نہیں ہے؟ ہو تو بتا دیجئے، نیند تو میری گئی!"

— کہنے لگے، "دیکھ آؤ، کہ نیند ٹوٹی تو نہیں؟ —

اگر نہیں ٹوٹی تو اس کے معنے یہ ہیں کہ درد ختم ہو گیا، اور نیند آگئی ہے، اگر ٹوٹ گئی ہو، تو ابھی اپنے ہاتھ سے دو ٹکیاں اسپرین کی کھلا دو۔!"

میں نے کہا، "اطمینان رکھئے نیند نہیں ٹوٹی، اور سر میں درد بھی نہیں ہے، ورنہ فوراً میری طلبی ہوتی، اب آپ بھی سو جائیے۔!"

(۱۵)

صبح چائے لے کر گئی تو اسی طرح کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے، آنکھیں سرخ، صاف معلوم ہو رہا تھا رات بھر سوئے نہیں ہیں، مجھے دیکھتے ہی پوچھا،

"کیوں دلاری تمہاری بٹیا اب کیسی ہیں"

میں نے کہا، "اچھی ہیں، خدا کا فضل ہے"!"

کہنے لگے "اب تو درد نہیں ہے؟"

میں نے کہا، "قسم کھاتی ہوں بالکل نہیں ہے، آپ تو خواہ مخواہ اتنے پریشان ہوئے جا رہے"!" ——— لیجئے چائے لیجئے"!"

بلا کچھ کہے سنے چائے پینے بیٹھ گئے، دو تین گھونٹ پینے کے

بعد، پھر لہر آئی اور پوچھا،

"کیا یہ شکایت اکثر ہو جایا کرتی ہے"؟"

سچ کہوں مجھے ہنسی آگئی، اور ہنسی سے زیادہ ترس سی آگیا، میں اپنی نظر میں اتنی ذلیل کبھی نہیں ہوئی تھی، جتنی یہ ذرا سا جھوٹ بول کر ہوئی، تم سے کیا چھپانا زندگی بھر جھوٹ بولتی رہی ہوں، مگر کسی جھوٹ نے اتنی تکلیف مجھے نہیں دی جتنی اس جھوٹ نے میں نے سوچا کہ اتنے نیک اور بھلے آدمی کو خواہ مخواہ میں نے پریشان کیا، جی چاہا کہہ دوں، میں نے آپ سے جھوٹ بولا تھا، لیکن ہمت نہیں پڑی، میں نے سوچا اگر یہ بات کہدی تو ان کا دل پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا، اس کا تو مجھے خیال نہیں تھا کہ خفا ہوں گے، خفگی، ڈانٹ، گالی، سب کچھ برداشت کر لیتی لیکن جو چیز برداشت نہیں ہو سکتی تھی، وہ ان کے دل کا توڑنا تھا، !

دلاری بڑی دیر تک یہ داستان سناتی رہی، قمر بیچ میں ایک لفظ بھی نہیں بولی، نہ جانے وہ کیا سوچ رہی تھی، نہ جانے وہ کس عالم میں تھی ؟ نہ جانے کس طرح کی کشمکش میں گرفتار تھی، ؟

دلاری کو امید تھی، ایسی دل دوز، اور اثر انگیز کہانی سنکر وہ کھل پڑے گی، اپنا دل کھول کر رکھ دے گی، اپنا سارا ماجرا صاف بیان کر دے گی،

لیکن یہ کچھ نہ ہوا،

وہ بت کی طرح خاموش بیٹھی رہی!

یہ خاموشی دلاری کو بُری لگی، کچھ دیر تک تو وہ اس کی جنبش لب کا انتظار کرتی رہی آخر مایوس ہو کر بولی،

"اے بٹیا میں کہتی ہوں تم تو چپ ہو گئیں؟!"

قمر نے نظر بھر کر اسے دیکھا اور پوچھا،

"کیا کہوں؟ تم نے جو کچھ کہا میں نے سن لیا، مجھے تو کچھ کہنا ہے نہیں جو داستان طرازی شروع کر دوں؟!"

آخر دلاری نے براہ راست سوال کر لیا،

"کتنا خیال کرتے ہیں بیچارے تمہارا، ——— اور تم؟

قمر نے نگاہ بدل کر، بدلے ہوئے لہجہ میں سوال کیا،

"میں کیا؟ ——— مجھے کیا کرنا چاہیئے؟"

یہ ایسا برجستہ، اور بے ساختہ سوال تھا، دلاری کو کچھ دیر کے لئے خاموش ہو جانا پڑا، لیکن وہ رکنے والی تو تھی نہیں، کہنے لگی،

"کیا تمہیں ان کا خیال نہیں ہے؟"

قمر نے ڈپٹ کر کہا "نہیں!"

دلاری سہم گئی؛ لیکن ہار کب مانتی تھی، کہنے لگی،

میں تمہاری جگہ ہوتی، تو ایسے آدمی کے پاؤں دھو دھو کر پیتی، ——— سوچو تو سہی، اس زمانے میں، اس خود غرضی اور مطلب کے زمانے میں بھلا ایسے لوگ کہاں ملتے ہیں جو بے غرض محبت کر سکتے

ہوں، کیا وہ سر پر بٹھانے کے قابل نہیں ہیں'! !!

قمر کے چہرے پر کرب اور بے چینی کے آثار پیدا ہوئے، اس نے بڑے دکھ بھرے انداز میں دلاری سے کہا،

"شاید تم سمجھتی ہو، میں آدمی نہیں پتھر ہوں، نہیں دلاری، میں بھی آدمی ہوں، میرے سینہ میں بھی دل ہے، جذبات، احساسات، اور تاثرات مجھ پر بھی طاری ہوتے ہیں، لیکن تم اسے کیوں بھول جاتی ہو کہ میں بیوہ عورت ہوں، اور ان حقوق سے محروم ہو چکی ہوں، جو تمہیں یا دوسری عورتوں کو حاصل ہیں ——!

دلاری جل گئی، "بھاڑ میں جائے وہ دنیا جو تمہیں بیوہ سمجھتی ہے تم کیوں ہونے لگیں بیوہ'؟ بیوہ ہوں گے تمہارے دشمن'! —— تم نے تو شوہر کی صورت تک نہیں دیکھی'!"

قمر نے جواب دیا، ہاں میں نے شوہر کی صورت تک نہیں دیکھی، لیکن ساری دنیا مجھے بیوہ تسلیم کرتی ہے اور میں اسی دنیا میں رہتی ہوں، لہٰذا اس کے فیصلہ کو ٹھکرا نہیں سکتی ہوں'! "

"تو کیا زندگی بھر یوں ہی بیٹھی رہو گی؟"

"ہاں، —— یہ میرا فرض ہے، یہ میرے باپ کی وصیت ہے، یہ میرے خاندان کی روایت ہے، یہ میرے آباء اجداد کی عزت کا سوال ہے، بھلا انہیں ساری! میں کس طرح نظر انداز کر سکتی ہوں؟"

"چاہے کوئی مرجائے؟"

"جب میں ہی موت کے انتظار میں بیٹھی ہوں، تو کسی دوسرے مرنے والے سے مجھے کیا ہمدردی ہو سکتی ہے"!"

"کلیم میاں پر تمھارا دل نہیں کڑھتا،؟"

"بہت کڑھتا ہے، لیکن مجھ سے زیادہ بے بس اس دنیا میں کوئی نہیں ہے دلاری"!"

"وہ اسی طرح سر پٹکتے رہیں گے؟ اسی طرح شب بیداری کرتے رہیں گے؟ اسی طرح آہ بھرتے رہیں گے؟ اسی طرح اپنی زندگی برباد کرتے رہیں گے، مگر تم کچھ نہیں کر سکتیں؟"

صرف ایک کام کر سکتی ہوں، اور وہ کروں گی'!"

دلاری کے چہرے پر امید کی روشنی نمودار ہوئی، بڑے اشتیاق اور آس کے ساتھ اس نے پوچھا،

"کیا کام کر سکتی ہو،؟ کیا کروگی؟"

وہ بولی، "اب میں اور کلیم صاحب ایک گھر میں نہیں رہ سکتے، انھیں اس گھر سے رخصت ہونا پڑے گا، انھیں یہاں سے جانا پڑے گا'!"

دلاری پر جیسے بجلی گر پڑی' اس نے کہا،

"یہ میں کیا سن رہی ہوں؟ ——— یہ اندھیر؟"

"تم اسے اندھیر کہو، یا ظلم، یا سفاکی، یا درندگی، سب کچھ سن لوں گی، سب کچھ مان لوں گی، لیکن میرا یہ فیصلہ اٹل ہے، !"

دلاری کے پاؤں تلے سے زمین نکلی جا رہی تھی، اس نے پھر ایک کمزور سا سہارا لیا،

"لیکن میں پوچھتی ہوں، اس غریب کی خطا کیا ہے؟ قصور کیا ہے کس جرم میں اسے نکالو گی؟ کس خطا پر اسے چلتا کرو گی، ؟ اس نے آج تک ایک بات بھی تو تم سے نہیں کی، اگر محبت بھی کرتا ہے تو دل ہی دل میں، یہ حرف کبھی زبان پر نہیں لایا، یہ کوئی ایسا گناہ تو نہیں ہے جس کی سزا یہ ملے کہ اس کا روزگار تک ختم کر دیا جائے، !"

"نہیں میں اتنی ظالم نہیں ہوں، ———— تین مہینے کی تنخواہ دے کر رخصت کروں گی، !"

"اور جیسے وہ لے بھی لیں گے؟"

"یہ حق الخدمت ہے انھیں لینا چاہیے، نہ لیں، تو اس کی ذمہ داری بھی انہی پر ہوگی، !"

"نہیں بٹیا یہ مت کرو، ایسا تمھیں نہیں کرنا چاہیے، !"

"دلاری یہ فیصلہ میں نے خوب سوچ سمجھ کر کیا ہے، اس کے سوا کوئی چارہ نہیں، اگر اس فیصلہ کو عمل میں نہیں لاتی، تو میں رسوا ہو جاؤں گی، بدنام ہو جاؤں گی، مجھے اپنی رسوائی اور بدنامی کا کچھ خیال نہیں ہے، میرا باپ، میرا مرا ہوا باپ رسوا ہوگا، میرے باپ

کے آباد اجداد بدنام ہوں گے، میرا خاندان جو اب تک سر بلند رہا ہے،

جس کی شیخی کبھی کر کری نہیں ہوئی، سرنگوں ہو جائے گا،——

کیونکہ —— کیونکہ ——

یہ کہہ کر قمر نے دل پر ہاتھ رکھ لیا، اور بیکلی کے عالم پہلو بدلنے لگی، لیکن دلاری پوری بات سننا چاہتی تھی، اس نے پوچھا،

"ہاں بٹیا ایسا کیوں ہو گا،——؟"

وہ اسی طرح کلیجہ پر ہاتھ رکھے بولی،

"کیونکہ میں خود بھی اس سے محبت کرنے لگی ہوں،!"

---

(۱۶)

یہ بات قمر کے منہ سے سنکر دلاری کا دل ٹھہر گیا، اس نے سوچا، اگر یہ کلیم سے محبت کرتی ہے، تو پھر یہ محبت رنگ لائے بغیر نہیں رہے گی، اس محبت کے طوفان ہیں، باپ کی وصیت، خاندان کی روایت، آباؤ اجداد کی لاج تنکے کی طرح بہ جائے گی، یہ سارا جوش وقتی ہے، کچھ عرصہ میں ختم ہو جائے گا، !______

عشق ازیں بسیار کرد است و کند، !،

اس نے اطمینان کا سانس لیا، اور خاموش ہو گئی، اس موضوع پر اتنی طویل، اور اتنی دیر تک گفتگو ہو چکی تھی کہ اب پھر اسے زیر بحث لانا مناسب بھی نہیں تھا، بہر حال وہ مطمئن تھی، اور خوش تھی کہ کلیم

کی محبت یکطرفہ نہیں ہے، بے اثر نہیں ہے ———— دونوں طرف سے آگ برابر لگی ہوئی، اور اس کا نتیجہ جلد یا بدیر اچھا ہی نکلے گا،

لیکن صبح کی پو پھٹتے ہی اس کے سارے خیالات وہم باطل ثابت ہوئے،!

قمر نے دلاری کو بلایا، اور اس سے کہا،

"آؤ میرے ساتھ،!"

وہ ساتھ ہولی، قمر اپنے کمرہ سے نکلی، اور برآمدے میں دروازے کی آڑ لے کر کھڑی ہوگئی، کلیم اس وقت بھی ایک کرسی پر بیٹھا تھا، اور دیوان میر کی ورق گردانی کر رہا تھا،!

چاپ کی آواز سن کر اس نے نظر اٹھائی، تو دلاری سامنے کھڑی تھی، دلاری نے کہا،

"بٹیا آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہیں،!"

کلیم کا رنگ رخ ایک لمحہ کے لئے تبدیل ہوگیا، لیکن بہت جلد اپنی اصلی حالت پر آگیا، اس نے سر کھجاتے ہوئے پوچھا،

"کیا بٹیا بھی آئی ہیں،؟"

وہ بولی، "ہاں آئی ہیں، بٹیا میرے پاس کھڑی ہیں،!"

"کلیم نے صرف اتنا کہا، "اچھا،؟" اور خاموش ہوگیا،!

تھوڑی دیر تک دلاری اور ثریا میں کھسر پھسر ہوتی رہی اس کے بعد، اس نے کہا،

" بٹیا کہتی ہیں آپ نے جس محبت سے پرویز کو پڑھایا، اس کی وہ دل سے شکر گزار ہیں"!"

کلیم کا رنگ رخ ایک مرتبہ پھر ذرا کے ذرا تبدیل ہوا، پھر اس نے کہا،

" وہ شکر گزار کیوں ہیں؟ شکر گزار تو میں ہوں کہ مجھے اس کے پڑھانے کا موقعہ ملا، ——— میرا اس دنیا میں کوئی نہ تھا، تمہاری بٹیا نے مجھے پناہ دی، میرا کوئی سہارا نہ تھا، وہ یہاں مل گیا، میں بیکار تھا، بے روزگار تھا، آشفتہ حال تھا، برگشتہ بخت تھا، یہاں آکر میری ساری شکایتیں رفع ہوگئیں، مجھے کام مل گیا، مجھے روزگار مل گیا، میری حالت سدھر گئی، میری قسمت چمک گئی، ——— شکر گزار تو مجھے ہونا چاہیئے، ——— مجھے،!"

دلاری کو یہ الفاظ دوہرانے کی ضرورت نہ تھی،!

ثریا اس ہی کھڑی سب کچھ سن رہی تھی، اور خود اس کا بھی حال یہ تھا جیسے کسی نے سارا خون نچوڑ لیا ہوگا، کلیم کے ایک ایک لفظ پر اس کے دل کی دھڑکن بڑھ رہی تھی، اور اس کی بے کلی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا،!

تھوڑی دیر تک کوشش کے باوجود وہ کچھ کہہ نہ سکی،

اس کا جی چاہا شکریہ کے اس تبادلے کے بعد واپس چلی آئے اور جو کچھ کہنے آئی تھی، اسے پھر کسی اور موقعہ کے لئے اٹھا رکھے،

لیکن پھر اس نے سوچا یہ فیصلہ کن گھڑی ہے"!

اگر اس وقت میں خاموش رہی، اور دل کی بات زبان پر نہ لائی، تو یہ موقعہ پھر کبھی ہاتھ نہیں آئے گا"!

آخر دل پر جبر کر کے، اور اپنے اعصاب پر زیادہ سے زیادہ بوجھ ڈال کر اس نے آہستہ سے پھر دلاری سے کہا، اور وہ ترجمانی کا حق ادا کرتی ہوئی بولی،

"بٹیا کہتی ہیں آپ کی باتیں سنکر ان کے دل کو تکلیف ہوئی، آپ جس اپنائیت سے رہے، اس کے بعد ایسی باتیں آپ کو نہیں کرنا چاہیے تھیں، ان میں غیریت کی بو آتی ہے"!"

کلیم کا چہرہ وفور مسرت سے گلنار ہو گیا، کچھ توقف کے بعد اس نے کہا،

"اچھا، اگر یہ بات ہے تو اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں"!"

دلاری نے پھر سلسلۂ سخن شروع کیا، "بٹیا کا کہنا ہے کہ اب فی الحال پرویز تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رکھ سکے گا، ——"

کلیم نے سوال کیا، "کیوں؟ وہ تو بڑا تیز لڑکا ہے" اور بڑے شوق سے پڑھتا ہے، اس موقعہ پر اگر اس کا تعلیمی سلسلہ منقطع کیا گیا تو ——"

آگے وہ کچھ کہہ نہیں پایا تھا کہ دلاری نے قمر کی زبان سے کہا،
"حالات کچھ ایسے ہی ہیں'!"
سلیم خاموش ہو گیا، اور پھر خفیف سے تامل کے بعد گویا ہوا،
"تو پھر مجھے اب چلا جانا چاہیے یہاں سے'!"
قمر کا دل اس زور سے دھڑکا کہ سارا بدن ہل گیا، لیکن اس نے
پھر دلاری سے کہلایا،
"ہاں، اور کیا'!"
سلیم کا چہرہ سفید پڑ گیا، اس گھر سے یوں، اور اس طرح، اور
بالکل فوری طور پر اسے رخصت ہونا پڑے گا، اس کا تو اس نے کبھی
بھولے سے بھی تصور نہیں کیا تھا، وہ تو اس خیال میں مگن تھا کہ زندگی
بھر پرویز بچہ رہے گا، اور وہ اسے پڑھاتا رہے گا، اور کبھی کبھی، قمر
کے جمال جہاں آرا کی تجلیوں کا مشاہدہ کیا کرے گا، !
لیکن اسوقت کی گفتگو نے سارا نقشہ درہم برہم کر کے رکھ دیا تھا،
سوچا کچھ تھا، ہوا کچھ، اور وہ بھی یوں کہ، "بہت بے آبرو ہو کر ترے
کوچہ سے ہم نکلے'!"
وہ خاموش، اور گم صم بیٹھا تھا کہ دلاری نے قمر کی طرف سے کہا۔
"اس مہینہ کی تنخواہ کے علاوہ، تین مہینے کی تنخواہ اور آپ کو
ملے گی، تھوڑی دیر میں بابا آتے ہوں گے وہ دے دیں گے، اس
کے بعد آپ جا سکتے ہیں، ـــــــ"

کلیم نے اس مرتبہ بھی کوئی جواب نہیں دیا، ایک بت کی طرح خاموش بیٹھا رہا، !

قمر دلاری کو ساتھ لے کر اپنے کمرہ میں پہنچی، دلاری نے اسے زخمی نظروں سے دیکھا، اور کہا،

" بٹیا یہ سر حاضر ہے، جتنی چاہو جوتیاں مار لو، اگر ات کر جاؤں جو چوری کی سزا دو میری سزا، لیکن یہ ضرور کہوں گی کہ تم نے جو کچھ کیا اچھا نہیں کیا، !"

وہ بستر پر گرتی ہوئی بولی،

" ہاں دلاری سچ کہتی ہو تم واقعی میں نے بہت برا کیا، جتنا میرا دل ملامت کر رہا ہے میں ہی جانتی ہوں، !"

مایوسی کی تاریکی میں پھر امید کی کرن نظر آئی، دلاری نے پوچھا،

" تو جاؤں، روک لوں انہیں؟ ——— منع کر دوں انہیں، جانے سے ——— ؟ "

قمر نے ایک عزم کے ساتھ فیصلہ کن انداز میں کہا،

" نہیں، ———

دلاری خاموش ہو گئی، اور واپس جانے لگی، قمر نے اس سے کہا،

" دیکھو اگر بابا (ابو محمد صاحب) آ گئے ہوں تو ابھی، ورنہ جب آئیں، فوراً، جو حساب میں نے بنایا ہے اس کے مطابق ان سے روپیے لے کر کلیم صاحب کو دے آنا، !"

دلاری نے کوئی جواب نہیں دیا چلی گئی، زندگی میں کبھی بھی اُسے قمر پر غصہ نہیں آیا تھا لیکن آج ؟

آج وہ قمر سے حددرجہ برہم تھی، بے انتہا خفا ــــــ، اگر اس میں ہمت ہوتی تو ایسی کھری کھری اس بے مروتی، سنگدلی، اور شقاوت پرستانی کرتی صاحبہ کو مزا آجاتا، لیکن وہ خاموش رہنے پر مجبور تھی اس کی حیثیت ہی کیا تھی، ؟ ــــــ ایک معمولی ملازمہ،

دلاری کے چلے جانے کے بعد، قمر تکیئے میں منہ چھپا کر خوب روئی، شاید زندگی میں اتنا کبھی بھی نہیں روئی تھی، اس کی ہچکیاں بندھ گئیں، سسکیوں کا سلسلہ کسی طرح ختم ہونے ہی نہیں آتا تھا، !

کوئی ایک گھنٹہ کے بعد وہ چونک کر اٹھ بیٹھی، بابا گھر میں، عائشہ بی سے کسی بات پر الجھ رہے تھے،

اس نے پھر دلاری کو بلایا، اور اسے حکم دیا کہ کلیم کو فوراً روپے دے آئے جاکر،

ذرا دیر میں وہ واپس آئی، اور روپے سامنے رکھی ہوئی میز پر رکھتی ہوئی بولی،

" وہ تو گئے، ــــــ

قمر نے پوچھا کب ؟ "

وہ کہنے لگی، " نہ جانے کب ؟ میں تو اندر تھی بابا کہتے ہیں جب وہ باہر سے آئے تو کمرہ بند تھا، ــــــ نہ ان

کی کوئی کتاب ہے، نہ ٹوپی، نہ کپڑے، !"
قمر کے بدن میں سنسنی ہونے لگی، کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔
"جائیں گے کہاں؟ یہیں کہیں ہوں گے جاؤ ڈھونڈو، !"
وہ بولی، "کہہ تو رہی ہوں بٹیا نہیں ہیں، ———— وہ
گئے، !"

حسرتِ ناتمام

عید ہوئی ذوق و سلے شام کو

(۱)

زمانہ!

کیا چیز ہے یہ زمانہ بھی!

زمانہ کے انقلاب، کسی کو بھی سلامت نہیں چھوڑتے، یہ سب پر طاری ہوتے ہیں، اور سب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں، یہ دولت مند سے اس کی دولت چھین لیتے ہیں، حسینوں سے ان کا حسن و جمال چھین لیتے ہیں، زور آور اور طاقت والوں سے ان کی قوت و طاقت چھین لیتے ہیں، پھول سے اس کی رعنائی، اور شاخ گل سے اس کی لچک چھین لیتے ہیں، عالی شان، بارونق، اور بھرے پرے گھروں سے ان کی رونق چھین لیتے ہیں، کشت و چمن سے ان کی سرسبزی اور شادابی چھین لیتے

ہیں، ——— اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انسان سے اس کی زندگی چھین لیتے ہیں،

ارشد ایسا گیا کہ پھر اس کا سراغ نہ لگا، !

اسی غم میں زبیدہ بیگم نیم جان ہو گئیں، خود شیخ صاحب ویسے تعلدرستی کی حالت میں بھی کیا کم پاگل تھے، اور جب سے اکلوتا لڑکا داغ مفارقت دے گیا تھا، رہی سہی کسر بھی پوری ہو گئی تھی، یعنی باقاعدہ پاگل ہو گئے تھے، وہ ارشد کو اس کی نالائقیوں پر خوب پھٹکار کرتے تھے اسے زیادہ منہ نہیں لگاتے تھے، اس کی طبیعت اور مزاج کے خلاف تھے، لیکن دل کی گہرائی میں اس کی انتاہ اور بے پناہ محبت انگڑائیاں لے رہی تھی، ان کی ڈانٹ ڈپٹ کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ راہ راست پر آجائے، یہ تو نہیں تھا کہ ہاتھ سے نکل جائے، ہاتھ سے نکل گیا تو وہ بھی کسی کام کے نہ رہ گئے۔

اس غم نے دونوں میاں بیوی کو کہیں کا نہ رکھا، شیخ صاحب کی دیوانگی نے سارا کاروبار چوپٹ کر دیا، علاج معالجہ کے بعد بڑی مشکل سے اچھے ہوئے، لیکن ارشد کی بازیافت سے مایوس ہو چکے تھے، انہیں یقین تھا اس نے خودکشی کر لی، اور اب وہ خود بھی زندگی کے خواہشمند نہیں رہ گئے تھے، پہلے موت کے خیال سے دہل جاتے تھے اب اس کے انتظار میں گھڑیاں گنا کرتے تھے، نقد روپیے، اور جائداد منقولہ و غیر منقولہ کے لئے انھوں نے یہ انتظام کیا کہ ایک ٹرسٹ

قائم کیا، اور رفاہ عام کی مختلف مدات کے لئے، اس کی آمدنی وقف کردی، وہ زندگی میں اپنے بیٹے کو خوش نہ رکھ سکے، لیکن آخرت کے لئے ایک تحفہ ٹرسٹ کی صورت میں تیار کر دیا،

خان بہادر رضی الدین صاحب کو زندگی بھر اپنے کسی فعل پر اتنا پچھتاوا نہیں ہوگا، جتنا ارشد کو داماد منتخب کر کے ہوا، وہ دل ہی دل میں سوچا کرتے تھے اس سے تو بہتر تھا کہ سلطانہ کی شادی ہی نہ ہوتی، وہ یوں ہی کنواری بیٹھی رہتی، آخر ایسے دیوانے لڑکے سے شادی کر کے کیا ملا؟ سوا داغ حسرت کے؟ وہ لڑکی جو ہر وقت پھول کی طرح کھلی رہتی تھی، جس کے ہونٹوں پر ہمیشہ تبسم رقص کیا کرتا تھا، جو شوخی اور زندہ دلی کی تصویر تھی، اپنے نالائق، اور بدکار شوہر کی جدائی کے غم میں مری جارہی ہے، لاکھ لاکھ سمجھاتا ہوں، اس کمبخت کا خیال چھوڑ، لیکن وہ ہے کہ اس کی یاد میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے اگر وہ نہ ملا تو یہ خود مر جائے گی، جان دے دے گی،

ارشد کی تلاش کا جہاں تک تعلق تھا، کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا گیا، کنوؤں میں بانس ڈال دیئے، دور و نزدیک کے شہروں میں لوگ دوڑائے گئے، اور انہیں سراغ رسانی پر مامور کیا گیا، اخبارات میں اشتہارات دیئے گئے اور اعلان کیا گیا کہ جو شخص ارشد کا پتہ بتادے گا، یا اسے لے آئے گا، اسے دس ہزار روپیہ انعام دیا جائے گا، یہ ساری کوششیں مشترکہ طور پر ہو رہی تھیں، شیخ صاحب

الفت پدری سے مجبور ہو کر، اور خان بہادر صاحب اکلوتی اور چہیتی بیٹی کا حال زار دیکھ کر ——— گو انتہائی نفرت اور بد دلی کے ساتھ ——— اس کام میں لگے ہوئے تھے،

لیکن ارشد نہیں ملا، ساری کوششیں بیکار، اور بے سود ثابت ہو ئیں،

اور بالآخر اسی غم میں، پہلے زبیدہ بیگم دنیا سے رخصت ہوئیں، پھر شیخ صاحب نے کنارہ کیا، ان دونوں کے مرنے سے وہ شاندار مکان ایک ویرانے میں تبدیل ہو گیا،

خان بہادر رضی الدین کو ارشد کا تو کوئی غم نہیں تھا، لیکن، دمے کے پرانے مریض تھے، ایک مرتبہ اتنی دیر تک اور اتنے زور سے کھانسنے کا سلسلہ شروع کیا کہ دم ہی نکل گیا، قیصر بیگم کو کچھ شوہر کا غم، کچھ لڑکی کا داغ، صحت ان کی بھی بگڑ چکی تھی، وہ کینسر کے جان لیوا اور لاعلاج مرض میں مبتلا ہو ئیں، اور چند ہفتوں میں ختم ہو گئیں،

اب سلطانہ تنہا تھی، بالکل تنہا، لیکن مایوس نہیں، بے شک اس نے روتے روتے آنکھیں سجا لی تھیں بے شک ارشد کے جانے کے بعد سے اب تک نہ وہ ہنسی تھی نہ مسکرائی تھی، لیکن مایوس ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں ہوئی تھی، ! اسے یقین تھا، ارشد زندہ ہے اور ایک نہ ایک دن ضرور واپس آئے گا، وہ ہر روز اس کی راہ تکا کرتی، اور وہ کسی دن بھی نہ آتا، لیکن امید کا دیا باد مخالف کے جھونکوں

بیں بھی تمٹما رہا تھا، ماں باپ کے مرنے کے چند ہی روز بعد ساجد بھی ہیضہ کا شکار ہو کر چٹ پٹ ہو گیا اب باپ کی ساری جائداد املاک کی بلا شرکت غیرے مالک سلطانہ تھی ہی۔ لیکن شیخ صاحب بھی اسے بہت کچھ بہ صورت زر نقد وجواہرات وزیورات دے گئے تھے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ارشد کی یادگار میں اس کی روح کو خوش کرنے کے لئے جو ٹرسٹ قائم کیا تھا، اس کا متولی انھوں نے سلطانہ ہی کو بنایا تھا، اس ٹرسٹ کی ایک بہت بڑی مد یہ تھی کہ ضرورت مند لوگوں کو مناسب ضمانت پر، بلا سودی قرض دیا جائے، اور آسان قسطوں میں وصول کر لیا جائے، تاکہ یہ نیک اور مفید کام ہمیشہ جاری رہے، سلطانہ کے پاس جب اس طرح کی کوئی درخواست آتی، یا اسے کسی مستحق آدمی کی سن گن مل جاتی، تو وہ بے تامل مطلوبہ رقم دے دیتی، قسطیں نہایت آسان رکھتی، اور پھر بھی، اگر ضرورت ہوتی توسیع کرتی رہتی،

اپنی ذاتی جائداد کے نظم وانصرام پر وہ اتنا وقت نہیں صرف کرتی تھی، جتنا ٹرسٹ کے کاموں پر، اس کی دلی خواہش تھی کہ کوئی شریف اور ضرورت مند اور نادار، جائز، اور امکانی امداد سے محروم نہ رہ جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس نے دل سے نکلی ہوئی دعاؤں کا بہت بڑا توشہ جمع کر لیا تھا، اور اس توشہ کو وہ سرمایۂ آخرت سمجھتی تھی، اس غیر معمولی اور مسلسل مصروفیت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس کا خیال تھا اس طرح وہ ارشد کو اپنے سے اور زیادہ قریب

کرنے کا سامان کر رہی ہے، جب بھی وہ آئے گا، جب کبھی بھی وہ آئے گا، اور اس کے ان کارناموں کو دیکھے گا، تو کتنا خوش ہوگا اس سے،!!

آہ، ارشد!

کتنے دن ہوگئے تھے اسے گئے ہوئے، اسے بچھڑے ہوئے،

لیکن آج تک دل کا مکین وہی تھا،

اور شاید زندگی بھر، یہ جگہ اس کے لئے وقف رہے گی،!

اس کی یاد ہیں، اس کے انتظار ہیں، اس کی جستجو ہیں ساری زندگی کاٹ دینا، کتنا بڑا فخر ہے، ایسا فخر جسے کوئی چھین نہیں سکتا،

اور پھر وہ سوچنے لگتی، وہ ضرور آئے گا، ————

آئے گا اور یہ دیکھ کر کہ میں اس کے مقصد کے لئے کس درجہ خلوص اور سچائی کے ساتھ برسر عمل ہوں، کتنا خوش ہوگا، ؟

حقیقت یہ ہے کہ خیالی طور پر اسے خوش رکھنے کے لئے، اس کے محبوب مقصد کو پورا کرنے کے لئے وہ کسی ایثار سے بھی دریغ نہیں کرتی تھی، اس کی کارگزاریاں صرف ٹرسٹ تک محدود نہ تھیں، ایسا بھی ہوتا، اور بار بار ہوتا کہ ٹرسٹ کے پاس روپیہ نہ ہوتا، اور وہ اپنے پاس سے جتنا روپیہ درکار ہوتا دے دیتی، اور ایک ادا یہ بھی تھی کہ اس طرح کا دیا ہوا روپیہ، خواہ وہ ہزاروں ہی کی تعداد میں کیوں نہ ہو، واپس نہ لیتی، وہ بھی ٹرسٹ میں شامل ہو جاتا، قرض خواہ سے ملتا تو ٹرسٹ کی آمدنی میں داخل ہو کر، کسی دوسرے

مستحق، اور ضرورت مند شخص کو دے دیا جاتا، ! ——— اور سلطانہ سمجھتی کہ اس نے ایک مرتبہ پھر ارشد کو جیت لیا ہے،

ایک سال کی مدت گزری، دو سال کی مدت گزر گئی، تین سال ہو گئے، مگر ارشد کا سراغ نہ لگا، اس کا پتہ نہ چلا ڈھونڈھنے والے تھک کر بیٹھ گئے، تلاش کرنے والوں نے ہار مان لی، لیکن، سلطانہ کے دل میں جیسے کوئی بیٹھا کہہ رہا تھا، ارشد مرا نہیں زندہ ہے، وہ آئے گا، اور ضرور آئے گا، ! ——— اس کی مایوسی، پھر امید سے بدل جاتی، !

---

(۲)

اور ایک روز واقعی ارشد اپنے گھر واپس آگیا، !

اور یہ آنا بھی کچھ عجیب تھا، !

خان بہادر رضی الدین کے ایک دوست تھے، چودھری صاحب انھیں بھی خدا نے بہت کچھ دے رکھا تھا، آخر خان بہادر کا ایک دوست کوئی معمولی آدمی تو نہیں ہو سکتا تھا، یہ کہ معمولی آدمی نہیں تھے، لیکن بہت زیادہ غیر معمولی بھی نہیں تھے، لیکن ایک بات ضرور بڑی خوبی کی تھی، آدمی ملنسار اور با وضع تھے، اور اس بات میں، غریب امیر کی تفریق نہ تھی، سب سے اچھی طرح

ملتے تھے، اچھی طرح پیش آتے تھے، خوش خلقی اور خوش مزاجی کا مظاہرہ کرتے تھے، غریب عزیزوں کی مالی امداد میں تو بخیل تھے، لیکن ان کے ہاں کوئی تقریب ہوتو ضرور پہنچتے تھے۔ اور اس موقع پر دس بیس روپے خرچ کر دیتے ہیں بھی تامل نہیں کرتے تھے،

کلو میاں کے ہاں نواسہ پیدا ہوا، ارشد کے طفیل میں اب ان کی حالت بہت کچھ سدھر چکی تھی، دو کو کھلا کر کھاتے تھے گو چوہدری صاحب کی ٹکر کے نہیں تھے، لیکن ایسے بھی نہیں تھے کہ چوہدری صاحب انکی وجاہت خاندانی، اور خوش حالی کو نظر انداز کر دیں، چنانچہ نواسے کی تقریب عقیقہ میں انھوں نے اپنے تمام دوستوں، عزیزوں، نیز رشتے داروں اور قرابت مندوں کو مدعو کیا، انہی میں چودھری صاحب بھی تھے،

چودہری صاحب اپنی موٹر پر رواں دواں جا رہے تھے کہ ایک پگڈنڈی سے ایک آدمی نکلا اور سڑک پار کرتا ہوا بالکل ان کے پاس سے گزرا، چودھری صاحب آدمی گوش ہوش کے تھے، بجلی کی سی تیزی سے بریک لگایا، لیکن کار رکتے رکتے بھی اس رہرو کو زمین پر گرا دیا۔ چودہری صاحب سمجھے مر گیا، یا بہت زیادہ زخمی ہو گیا سے پہلے تو خیال آیا، اسے اسی حالت میں چھوڑ کر فرار ہو جائیں، لیکن ضمیر نے مجبور کیا، کار سے اتر پڑے، دیکھنے کیا ہیں، ایک نہایت لاغر، اور نحیف شخص، نہایت میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس، داڑھی ضرورت

سے زیادہ بڑھی ہوئی، سر کے بال الجھے ہوئے، ننگے پاؤں، سر پر ٹوپی تک ندارد، ٹکر کھا کر اوندھے منہ گر پڑا ہے،

چودھری صاحب اس شخص کے پاس پہنچے، اور اسے اٹھانے کی کوشش کی، لیکن وہ خود اٹھ بیٹھا، اور گرد جھاڑتے ہوئے کہا۔

"ذرا دیکھ کر کار چلایا کیجیے"!"

اس نصیحت پر چودھری صاحب نے کوئی توجہ نہیں کی،

سوال کیا۔

"کہیں چوٹ تو نہیں آئی؟ زخمی تو نہیں ہوئے"؟"

اس آدمی نے کہا، "چوٹ بھی کھائی ہے' اور گھائل بھی ہوں۔ ___ لیکن آپ کی کار سے نہیں، آپ تشریف لے جائیے۔ منزل کھوٹی نہ کیجیے"!"

آدمی کچھ دلچسپ سا نظر آیا، پوچھا، "تم کون ہو؟"

اس نے جواب دیا، "میں نہیں جانتا"!"

"عجیب آدمی ہو، تمھیں یہ نہیں معلوم تم کون ہو"!"

"ایک نہایت سخت جان شخص، ___ جو موت کی تلاش میں ہے، لیکن موت اس کے نام سے بھاگتی ہے، جو مرنا چاہتا ہے، مگر زندگی اسے مرنے نہیں دیتی، پورے دو سال سے ٹوریم میں گزار کر آ رہا ہوں، ہر روز یہ آس لگاتا تھا کہ آج ڈاکٹر خون کی قے دیکھ کر مایوسی کا اظہار کر دے گا، کہدے

گا، تم نہیں بچ سکتے، لیکن یہ آرزو کبھی پوری نہ ہوئی، یہاں تک کہ آج پروانۂ رہائی مل گیا، اس کا خیال ہے، اگر میں احتیاط رکھوں، تو زندہ رہ سکتا ہوں، ـــــــ لیکن اب احتیاط نہ کر کے زندہ رہنے کی کوشش کروں گا، دیکھئے کیا نتیجہ نکلتا ہے، !"

یہ باتیں جتنی عجیب تھیں اس سے زیادہ دلچسپ، چودھری صاحب کلو میاں کو تو بھول گئے، پھر سوال کیا،

لیکن تم زندگی سے اتنے بیزار کیوں ہو؟"

یہ سوال آپ کس کس سے کریں گے، ؟ ـــــــ نہ جانے کتنے آدمی زندگی سے بیزار ہیں، ـــــــ اور میں تو متنفر ہوں اس سے، !"

"شاید تم مالی پریشانیوں میں گرفتار ہو، اگر ایسی بات ہے، تو تمھیں "ارشد ٹرسٹ" سے حسب ضرورت مدد مل سکتی ہے

"ارشد ٹرسٹ" یہ کیا بلا ہے، ؟"

"میرے ایک دوست تھے شیخ محمود حسین ان کا اکلوتا لڑکا ارشد لاپتہ ہو گیا، اس کی یادگار میں انھوں نے اپنی ساری جائداد منقولہ و غیر منقولہ سے یہ ٹرسٹ مرنے سے کچھ دن پہلے قائم کیا ہے، ؟"

"کیا شیخ صاحب کا انتقال ہو گیا، ؟"

"ہاں، ——— کیا تم انھیں جانتے ہو، ؟"

اس شخص نے جواب نہیں دیا، تیورا کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔

چودھری صاحب نے پہلے تو اسے ہوش میں لانے کی تدبیریں کیں، پھر سوچا اسپتال میں لے جا کر داخل کر دیں، لیکن دفعتہً خیال آیا، یہ شیخ صاحب کا نام سُن کر کیوں بیہوش ہوا؟

اس کا کیا تعلق ہو سکتا ہے شیخ صاحب سے؟"

"کیا یہ انھیں جانتا اور پہچانتا ہے، !"

گرتے وقت اس شخص کی جیب سے کچھ کاغذات بھی نکل کر گر پڑے تھے، چودھری صاحب نے ایک سرسری نظر ان پر ڈالی، تو سب سے پہلے جس چیز پر نظر پڑی وہ ٹی بی سنی ٹوریم کا آئی ڈنٹی کارڈ تھا، !

" ارشد حسین، !

ولد شیخ محمود حسین،

عمر ۲۷ سال

مرض، ٹی بی،

ان تفصیلات کے ساتھ ایک تصویر بھی چپکی ہوئی تھی، تصویر دیکھ کر انھوں نے پہچان لیا، یہ ارشد ہے اور اسپتال سے ڈسچارج ہو کر کہیں جا رہا تھا کہ یہ حادثہ پیش آ گیا، انھوں نے تقریب میں جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا، اور ارشد کو کار میں ڈال کر سیدھے محمد پور

روانہ ہوئے،

کار فراٹے بھرتی ہوئی جا رہی تھی، ذرا دیر میں شیخ صاحب کے دولت کدے پر پہنچ گئی،

آج بھی سلطانہ تمام کاموں سے فارغ ہوکر، ارشد کے انتظار میں بیٹھی تھی، سوچ رہی تھی شاید آج آجائیں، شاید اب آجائیں،!

اتنے میں کار کی آواز اس کے کانوں تک پہنچی، وہ سوچنے لگی، کار پر اس وقت ہمارے ہاں آنے والا کون ہو سکتا ہے؟

وہ خود باہر نکلی تو دیکھا چودھری صاحب کار سے اتر رہے ہیں، اس نے پرتپاک استقبال کرتے ہوئے کہا،

"چچا آپ؟، اس وقت؟" ———— خیریت تو ہے؟"

چودھری صاحب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا،

"ہاں بیٹی خیریت ہے، اور بہت بڑی خیریت ہے، ایسی زبردست خیریت ہے کہ تم سنکر خوش ہو جاؤ گی، باغ باغ ہو جاؤ گی،!"

سلطانہ سوالیہ نظروں سے چودھری صاحب کی طرف دیکھنے لگی۔ کچھ پوچھ نہ سکی،!

چودھری صاحب نے زیرلب تبسم کے ساتھ کہا،

"بھگوڑے کو پکڑ لایا ہوں،!"

سلطانہ کا ذہن اب بھی ارشد کی طرف نہیں گیا، وہ کچھ سوچتی ہوئی بولی،

"جی آپ کس کے بارے میں کہہ رہے ہیں؟ ————— کون بھگوڑا، ؟"

چودھری صاحب نے اور زیادہ شوخ لہجہ میں کہا،

"غور کرو، سوچو، ————— کیا کوئی ایسا بھگوڑا ذہن میں نہیں آتا جس کی تلاش میں تم نے زمین آسمان ایک کر دئے تھے، !"

سلطانہ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، اس کی آنکھوں کے سامنے ارشد کا مسکراتا ہوا، دل آویز اور سحر طراز چہرہ گھومنے لگا، اس نے بڑے جوش اور بے تابی کے ساتھ کہا،

"تو پھر بتانے کیوں نہیں؟ کیا ارشد؟

(۳)

کئی روز تک ارشد پر بیہوشی، مدہوشی، اور خود فراموشی کی کیفیت طاری رہی، حکیموں اور ڈاکٹروں کا تانتا لگ گیا، یہ آیا وہ گیا، آخر کئی روز کے بعد طبیعت ذرا سنبھلی اس عرصہ میں سلطانہ نے اپنے آپ کو اس کی خدمت اور دل جوئی کے لیئے وقف کر رکھا تھا، وہ اسے ہر طرح سے بہلانے، پرانی یادیں فراموش کرانے، اور، نئی زندگی پیدا کرنے کی کوشش کرتی رہی، لیکن اس کا دل کچھ اس طرح بجھا ہوا تھا کہ کسی طرح وہ پہلا سا ارشد نہ بن سکا،

کچھ دنوں تک تو سلطانہ یہ سمجھتی رہی کہ یہ حالت باپ کے غم، ماں کی یاد، اور گھر کی تباہی کے باعث ہے، لیکن رفتہ رفتہ محسوس کرنے لگی، بے شک باپ کا غم بھی ہے، ماں کی یاد بھی ہے، گھر کے اجڑنے کا صدمہ بھی

ہے، لیکن ان سب سے بالاکوئی اور بات بھی ہے "

اور وہ بات کیا ہوسکتی ہے ؟

بہت ذہن لڑایا، بہت جستجو کی، لیکن، کسی بات پر طبیعت جمی

نہیں، !

اور پھر ایک دن اس نے محسوس کر لیا کہ ارشد اپنے ساتھ کسی کے عشق کا روگ لے کر آیا ہے، !—— وہ بے خبر سو رہا تھا، دفعتہً سوتے سوتے اس نے بڑانا شروع کیا، اور بہت کچھ اپنی داستان معاشقہ بیان کر دی، !—— اس داستان سے یہ تو معلوم ہوگیا کہ ارشد کسی کو چاہتا ہے، لیکن کسے؟ یہ نہ معلوم ہو سکا،

ارشد کی یہ نئی تبدیلی سلطانہ کے لیے کافی تکلیف دہ اور الم ناک ثابت ہوئی، اس کی خودی کو جھٹکا لگا، وہ سوچنے لگی، جسے میں نے دل و جان سے چاہا، جسے پاکر میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوگئی جسے ایک نظر دیکھ لینا، جس سے ایک مرتبہ بات کر لینا، جس کے پاس تھوڑی دیر بیٹھ جانا، میں حاصل حیات سمجھتی تھی، اس نے مجھے دغا دی، ؟——

وہ میرا نہیں کسی اور کا ہے، ؟

اور پھر وہ سوچنے لگتی، یہ کئی سال، یہ زندگی کے کئی ویران، ہیبت ناک اور غم انگیز سال میں نے اس کی یاد میں، اس کے انتظار میں بسر کر ڈالے لیکن یہ سال کتنی مصیبت کے تھے، صرف میں جانتی ہوں، یا میرا دل، ان سالوں میں کون دکھ، کون تکلیف، کون اذیت اور کون سی پریشانی تھی جو

میں نے برداشت نہیں کی، محض اس امید میں، محض آسرے میں کہ ارشد ایک دن آئے گا اور میری ساری کلفتیں دور کر دے گا۔ ——— ——— وہ آیا لیکن میری کلفتوں اور مایوسیوں کا تحفہ لے کر، ——— کیا یہی ہونا چاہیے تھا، ؟

دنیا کہتی تھی، ارشد مر گیا، میرے باپ کا فیصلہ یہی تھا، میری ماں کی رائے یہی تھی، خود اس کے باپ کو اس کا یقین تھا، خود اس کی ماں اسی غم میں گھل گھل کر مر گئی، ———

لیکن ایک میں تھی، جو اس یقین اور اس فیصلے کے خلاف ڈٹی ہوئی تھی، میرے دل کے اندر بیٹھا کوئی کہہ رہا تھا، ارشد مرا نہیں زندہ ہے وہ ایک دن آئے گا اور ضرور آئے گا ——— ہاں، وہ مرا نہیں، زندہ رہا، ایک دن ایسا بھی آیا کہ وہ آگیا، لیکن، میرے لئے کیا لایا ؟ ——— غم، غم جانگداز !

اس سے تو وہ مایوسی اور انتظار کی زندگی اچھی تھی، لاکھ درجہ اچھی تھی، !

میرے ماں باپ مر گئے، ارشد کے ماں باپ نے اس دنیا سے کوچ کیا، میرے لئے میرے ماں باپ کیا کچھ نہیں چھوڑ گئے، ؟ روپیہ، پیسہ زیور، جواہرات، زمین، جائداد، املاک، مکان، فرنیچر، کھیت، باغ، سب کچھ، اور یہ سب کچھ اتنا ہے کہ اس کی آمدنی سے میں اللے تللے کر سکتی تھی، نئی زندگی شروع کر سکتی تھی، شاہزادیوں کی طرح زندگی بسر

کر سکتی تھی،

لیکن میں نے کیا کیا؟

میں نے ایک ایسی عورت کی زندگی بسر کی، جو کوئی آرزو نہ رکھتی ہو، میں نے اپنی ہر آرزو، ہر شوق، اور ہر ولولہ اس دن کیلئے اٹھا رکھا تھا، جب میرا سرتاج، میری زندگی، میری روح اور میرے خیال کا مالک آجائے گا، !

وہ آیا، ——— لیکن خالی ہاتھ! خاموش!

نہ اس کے پاس مجھے دینے کو کچھ تھا، نہ محبت کے دو لفظ، !

اس کے باپ نے مرتے وقت اپنی ساری جائداد و املاک کا ایک ٹرسٹ قائم کر دیا تھا، اس ٹرسٹ کا مقصد تھا، غریبوں، ضرورت مندوں، اور سفید پوش شریفوں کی جائز امداد، اس ٹرسٹ کی متولی میں تھی ——— !

میں نے ایک ایک پائی کا حساب رکھا، میں نے اتنی محنت، اتنی عرق ریزی اور اتنی شفقت سے کام کیا کہ کسی دفتر کا کلرک بھی کیا کرتا ہو گا میں نے ایک پیسہ بھی ضائع نہیں ہونے دیا، اور وہ مقصد پورا کیا جس کے لئے ٹرسٹ قائم ہوا تھا،

میں نے مستحقوں اور ضرورت مندوں کو تلاش کیا، اور ان کی مدد کی،

یکھل کیا ایسا؟

اس لیئے کہ ارشد اس سے خوش ہو گا، یہ کام عین اس کی مرضی اور مزاج کے مطابق تھا، میری محنت دیکھ کر لوگ عش عش کر اٹھتے تھے'!

لیکن ارشد نے اس وفاداری کا صلہ کیا دیا؟

پہلے جس اخلاق، تپاک، اور گرم جوشی کے ساتھ ملا کرتا تھا، ان خدمتوں کے بعد میں اس سے بھی محروم ہو گئی'

شاید وہ مجھ سے کبھی بھی محبت نہیں کرتا تھا، لیکن، میرا خیال تو کرتا تھا، میرے جذبات اور احساسات کا احترام تو کرتا تھا، میری مرضی اور خواہش کا لحاظ تو رکھتا تھا'! ——— لیکن اب دیکھتی ہوں تو وہ چیز بھی ناپید ہے' وہ اس گھر میں رہتا ہے' لیکن پردیسی کی طرح، اجنبی کی مانند'

کیا میں اس کی کوئی نہیں ہوں؟

"کیا میرا، اور اس کا رشتہ منقطع ہو گیا ہے؟

کیا میری یہ وفاداریاں اور خدمتیں اس کی نظر میں کوئی قیمت نہیں رکھتیں؟

بلکہ اب تو میں یہ تک دیکھتی ہوں کہ اسے ٹرسٹ کے کام سے بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے میں نے اسے حساب کتاب سمجھانے اور اپنی کارگزاریوں کی تفصیلی بتلانے کی کوشش کی' اس کا جواب کتنا مختصر اور عجیب تھا۔

"میں تمہارے کام میں نہ مداخلت کرنا چاہتا ہوں، نہ محاسبہ

کرنا چاہتا ہوں، جو کچھ تم کر رہی ہو ٹھیک ہے، بس اسی طرح کئے جاؤ،
ان نیکیوں اور بھلائیوں کا اجر خدا تمہیں دے گا، !"

یا میرے اللہ !

کیا یہ سب کچھ میں خدا کے لئے کر رہی تھی ؟

آخر وہ کیا چاہتا ہے ؟

کس طرح کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے ؟

یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ ایک عضو معطل بنا پڑا ہے، نہ کھانے کا ہوش، نہ پینے کی فکر، نہ سونے کا وقت، نہ آرام کا خیال، نہ کسی چیز سے دلچسپی، نہ کسی کام سے رغبت، ہر وقت سر جھکائے کسی فکر میں بیٹھے ہیں، کوئی ملنے آیا، تو کسی بات کا، کسی سوال کا جواب نہیں دیتے، وہ جانے لگا تو اخلاقاً بھی اتنا تک نہیں کہتے کہ تشریف رکھیے،

آخر ——— کیونکر اس کی جگہ نا مرد سے جیتا ہوگا ؟ ؟"

---

(۴)

ایک روز حسبِ معمول سلطانہ خود اپنے ہاتھ سے ناشتہ تیار کر کے لائی، ارشد، کمرے میں کھڑکی کے پاس کھڑا باہر کی طرف دیکھ رہا تھا، سلطانہ نے ناشتہ میز پر رکھنے کے بعد کہا،

" ادھر باہر کی طرف کیا دیکھ رہے ہو؟"

ارشد نے سلطانہ کی طرف رخ کرتے ہوئے کہا،

" دیکھ رہا ہوں باہر سبزہ خود رو حد نظر تک پھیلا ہوا ہے، کہیں کہیں پھول بھی کھلے ہوئے نظر آ رہے ہیں، درختوں کی شاخیں بھی ہری بھری دکھتی ہیں، !" ——————

پھر ارشد چپ ہو گیا، اور خاموشی سے کرسی پر آ کر بیٹھ گیا،

سلطانہ نے بے کلی کے ساتھ کہا، "تو اس میں تعجب کی بات کیا ہے؟
یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے؟"
ارشد بگڑ گیا، "کیا ہوتا رہتا ہے؟ ——— میں ان پھولوں
کو نوچ دوں گا،!"
سلطانہ سہم گئی، لیکن کچھ بولی نہیں، البتہ اس کی چشم سے گوں میں
آنسو ڈبڈبانے لگے، اس نے ناشتہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے
کہا۔
"چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے، پی لو!"
ارشد جیسے بے خودی کے عالم سے ہوش میں آگیا، کہنے
لگا۔
"اچھا تم چائے بھی لے آئیں؟ ——— خود کیوں لائیں؟
کیا کوئی ملازمہ نہیں ہے؟ خادمہ نہیں ہے؟"
اپنا بیت کے یہ الفاظ سنکر سلطانہ کا دل ڈولنے لگا، دل کی
مرجھائی ہوئی کلی پھر سے کھلنے لگی، اس نے خوشی کا جھلا جھلتے
ہوئے کہا،
"آپ کا ہر کام میں خود ہی کرتی ہوں!"
ارشد کا رنگ پھر بدل گیا، اس کی تیوریاں چڑھ گئیں، اس
نے کہا،
"کیوں؟ ——— تم میری کون ہو، میں تمہارا کون ہوں؟"

دنیا میں کون کسی کا ہے ؟ یہ سارے رشتے، یہ سارے تعلق، ایک دھاگے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے، اس دنیا میں نہ خلوص کی قدر ہے، نہ محبت کی، نہ سچائی کی، ـــــــ تم مجھ پر جان چھڑکتی ہو، میں تمہاری پروا نہیں کرتا، میں کسی اور پر جان دیتا ہوں، اسے میری پروا نہیں، پھر بھی ایک رشتہ ہے، ایک تعلق ہے جو قائم ہے ؟ ـــــــ میں پوچھتا ہوں کیوں ؟ آخر اس نمود اور نمائش کی ضرورت کیا ہے ؟

کیا یہ ساری باتیں ایک فریب نہیں ہیں ؟"

یہ بہکی بہکی باتیں سنکر سلطانہ کے اوسان خطا ہو گئے، اس نے ابھی سوچا تھا کہ یہ حضرت راہ راست پر آ رہے ہیں، اور اب اس کا دل ڈولنے لگا، کہیں پھر روپوش نہ ہو جائیں، تیور تو کچھ ایسے ہی ہیں، بہت ڈری اور سہمے ہوئے انداز میں اس نے کہا۔

" میں اب تک یہ نہیں سمجھ سکی آپ کی یہ حالت کیوں ہے ؟" ـــــــ اگر مجھ سے کوئی شکایت ہو تو کہیے، اپنی جان دے کر بھی اسے رفع کرنے کو تیار ہوں، رہا رشتہ اور تعلق کا سوال ، سو بے شک، وہ کمزور بھی ہوتے ہیں، اور بے حقیقت بھی، اور مبنی بر فریب بھی، لیکن کچھ رشتے اور تعلق ایسے ہوتے ہیں، جو ان سب چیزوں سے ماورا ہوتے ہیں، ـــــــ"

ارشد نے اسی طرح جبیں بر جبیں پوچھا،

"یعنی؟ —— کیا کہنا چاہتی ہو تم؟"

وہ گویا ہوئی، "مثلاً، میرا اور آپ کا رشتہ، ——

ایمان سے کہیئے آج تک کبھی میں نے آپ سے کچھ چاہا؟ کچھ مانگا؟ کچھ لیا؟ —— ہر شادی "لو میرج" تو نہیں ہوتی، لیکن شادی کے بعد میاں بیوی ایک دوسرے کے قدر دان بن جاتے ہیں، ایک دوسرے سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کر لیتے ہیں، اور خوشی کی زندگی بسر کرتے ہیں، دنیا کا نظام "لو میرج" پر نہیں قائم ہے، اس عام اصول پر قائم ہے، مانا کہ آپ مجھ سے محبت نہیں کرتے، لیکن مجھے محبت کرنے سے کیوں روکتے ہیں؟ مانا کہ آپ مجھ سے کبھی محبت نہیں کر سکیں گے، لیکن اگر میں ہمیشہ آپ کو چاہتی رہوں تو آپ کا کیا نقصان ہے؟ مانا کہ آپ کو بیوی کی ضرورت نہیں ہے، لیکن ایک ساتھی کی، ایک دوست کی، ایک جاں باز اور فداکار رفیق کی تو ضرورت ہے، اس حیثیت سے آپ مجھے کیوں نہیں قبول کر لیتے؟"

ارشد نے کچھ عجیب سی نظروں سے سلطانہ کو دیکھا، پھر کہا۔

"آج تم مجھے ذلیل کرنے پر کیوں تلی ہوئی ہو؟"

وہ ایک جذبہ و تاثر کے عالم میں بولی،

"یہ میری مجال کہاں؟ اس کا تو اگر آپ محبت کرتے ہوتے مجھ سے جب بھی میں تصور نہیں کر سکتی تھی، !"

ان باتوں سے ارشد پر کچھ ندامت کچھ پشیمانی، کچھ خفت کی

کیفیت طاری ہوگئی، وہ کچھ جھینپ سا گیا، ابھی ذرا دیر قبل، اس پر جو نیم مجنونانہ کیفیت طاری تھی، اب وہ بالکل نہیں، تو بڑی حد تک دور ہو چکی تھی، اس نے بڑے سنبھلے ہوئے انداز میں کہا،

"سلطانہ میرے دل میں تمہاری بڑی عزت ہے، اور میرے والد کے انتقال کے بعد تم نے جس طرح ٹرسٹ کا کام سنبھالا، اور میری عدم موجودگی میں جس طرح میرے گھر کو آباد رکھا، اس کا شکریہ، اگر میں نہایت کمینہ خصلت آدمی ہوتا تو بھی ادا کرنے پر مجبور تھا،!!"

وہ بولی، "مجھے شکریہ نہیں چاہئے،!!"

ارشد نے پوچھا، "پھر کیا چاہیئے؟"

وہ کہنے لگی، "ہنستا ہوا، مسکراتا ہوا ارشد!!"

ارشد نے ایک ٹھنڈی سانس لی، سینہ پر ہاتھ رکھ کر دل کو دبایا، اور کہا،

"ناممکن کی آرزو کیوں کرتی ہو سلطانہ؟ وہ ارشد جس کا تم ذکر کر رہی ہو، مدت ہوئی مر گیا، اب تمہارے سامنے جو ارشد ہے، وہ دوسرا ارشد ہے، جسے زندگی سے نفرت ہے،!!"

"زندگی سے نفرت؟"

"ہاں سلطانہ، ——— نفرت اور انتہائی نفرت،!!"

"لیکن کیوں؟ ——— آپ تو زندگی سے بھرپور تھے، پھر زندگی سے اتنی نفرت کیوں ہو گئی آپ کو؟"

"(ایک ٹھنڈی سانس لے کر) ہو گئی'!"

"ایسے موقع پر کہ آپ زندگی سے اتنے بیزار اور متنفر ہیں، اگر ایک بیوی کی نہیں تو کیا ایک رفیق کی بھی آپ کو ضرورت نہیں ہے؟"

"(ایک اور ٹھنڈی سانس لے کر) آہ یہ کیا کہا تم نے؟ یہ کیا کہتی ہو تم؟

اہل دنیا ہیں فقط صورت شناس روز عیش
شام غم کی تیرگی میں کون کس کا آشنا!

کیا میرا بھی کوئی رفیق بن سکتا ہے؟"

سلطانہ نے بڑے عزم اور تیور کے ساتھ جواب دیا۔

"ہاں میں'!"

---

(۵)

ارشد نے حیرت تعجب، اور اضطراب کے ساتھ سلطانہ کی طرف دیکھا اور پوچھا،

"تم ——— ؟ ——— تم ؟"

وہ پہلے سے زیادہ عزم و ثبات کے ساتھ گویا ہوئی۔

"ہاں میں، ——— کیا آپ کو شبہہ ہے کچھ میرے دعوے کی صداقت میں ؟"

ارشد خاموش ہو گیا، اس نے کوئی جواب نہیں دیا، کچھ دیر تک سلطانہ بھی چپ رہی، اور ارشد کی طرف تکتی رہی، پھر اس نے قفل سکوت توڑا، اور کہا،

"آپ مجھ پر بھروسہ کیوں نہیں کرتے ؟"
اور پھر خفیف سے تامل کے بعد بولی،
"شاید آپ کسی دوسری عورت سے محبّت کرتے ہیں۔"

یہ سنکر ارشد کا چہرہ سرخ ہوگیا، اس پر اضطراب کی کیفیت طاری ہوگئی، لیکن سلطانہ نے سلسلۂ سخن جاری رکھا،
"اگر یہ بات ہے تو بھی آپ مجھے اس کا رقیب نہیں اپنا رفیق پائیں گے ؟ !"
ارشد پھٹی پھٹی آنکھوں سے سلطانہ کی طرف دیکھنے لگا، اور وہ کہہ رہی تھی،
"میں جھوٹ نہیں کہتی، آزما کر دیکھ لیجیے، مجھے اگر آپ سے محبت ہے تو اس لئے نہیں کہ آپ بھی مجھے چاہیں، پھر تو یہ کاروبار ہوگیا، سودا ہوگیا، محبت تو نہ رہی" ! "
ارشد کی قوت گویائی جیسے کسی نے سلب کرلی تھی، اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا، لیکن سلطانہ کی قوت تکلم عروج پر تھی، وہ گویا ہوئی،
"اگر آپ کسی دوسری عورت سے محبت کرتے ہیں، تو میں خوشی سے اجازت دیتی ہوں، اس سے شادی کر لیجیے، اپنی جان ہلکان نہ کیجیے، اس سے شادی کر لینے کے بعد، کم از کم وہی ہنستا ہوا مسکراتا

ہمارا رشد تو واپس مل جائے گا، میرے لئے یہی بہت ہے، ! " میں اسی پر قانع ہوں، اس سے زیادہ مجھے کچھ نہیں چاہیے، ! "

اتنی دیر کے بعد ارشد کے لبوں نے جنبش کی، اس نے اقرار کر لیا، !

" ہاں سلطانہ میں محبت کرتا ہوں، ! "

" یہ تو میں عرصہ سے جانتی ہوں، ——— اسی دن سے جب آپ واپس آئے تھے، ! "

" پھر بھی تم میری خدمت، اور سیوا کرتی رہیں، ! "

" ہاں، ——— اس لئے کہ یہ میرا انسانی فرض تھا، بیمار سے نفرت نہیں کی جاتی، اس کی خدمت ہی کی جاتی ہے، مجبور سے ضد نہیں کی جاتی، اس سے ہمدردی کی جاتی ہے، ——— آپ خدمت اور ہمدردی کے مستحق ہیں، ! "

" تم کتنی عالی ظرف ہو، کتنی بلند اور برتر مخلوق ہو، اس کا تو مجھے اندازہ ہی نہیں تھا، ! "

" اب تو ہو گیا ؟ "

" ہاں، ——— آج پہلی مرتبہ، یہ اندازہ ہوا، اور میرے دل کا کیا حال ہے، اسے لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا، ! "

" وہ میں محسوس کر رہی ہوں، سننا نہیں چاہتی، ———

لیکن اب آپ کو جلد از جلد شادی کر لینی چاہیئے، !"

ارشد نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا،

"شادی، ــــــ نہیں سلطانہ یہ ممکن نہیں ہے؟"

وہ سراپا حیرت بن کر بولی،

"کیا ممکن نہیں ہے،؟"

ارشد نے افسردگی، مایوسی، اور اضطراب کے ساتھ جواب دیا،

"جس سے مجھے محبت ہے، اس سے میں شادی نہیں کر سکتا، !"

"کیوں نہیں کر سکتے؟"

"اس لئے کہ وہ عنقا ہے، !" ــــــ بھلا عنقا سے بھی کوئی شادی کر سکتا ہے؟"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، ــــــ کا کیا مطلب؟"

وہ گویا ہوا، "اس کا مطلب؟ کیا، تم نے سنا نہیں ہے وہ شعر،

برو ایں دام بر مرغ دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ

اتنے اونچے آشیانے تک دام پہنچ ہی نہیں سکتا، !"

"یہ آپ کا خیال ہے، !"

"نہیں سلطانہ یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے، !"

"میں نہیں مان سکتی'!"

"میرے سوا کوئی بھی نہیں مان سکتا' ——— لیکن بدقسمتی سے معاملہ مجھی سے متعلق ہے' لہذا' میرا ہی ماننا سب کچھ ہے'!"

"بتائیے وہ کون ہے؟"

"ایک پھول'!"

"اس کا نام کیا ہے؟"

"پھول چاہے گلاب کا ہو' یا کسی چیز کا' پھول ہی کہلاتا ہے' ———"

"پھر بھی اسے کسی خاص نام سے پکارتے تو ہوں گے؟"

"نام معلوم کر کے تم کیا کرو گی۔"

"میں وہ کروں گی' جو آپ نہیں کر سکتے' میں اس کے دل میں آپ کی محبت کا دیا روشن کر دوں گی' اسے آمادہ کر دوں گی کہ وہ آپ کی محبت قبول کر لے'!"

"جو کام خدا بھی نہیں کر سکتا' اس کا بیڑا تم اٹھاتی ہو'؟"

"توبہ کیجیے' ——— کیسی کفر کی بات منہ سے نکال رہے ہیں آپ'؟"

ارشد نے زہر خند کرتے ہوئے کہا'

"تم اب تک کفر و اسلام کے چکر میں پڑی ہو' حالانکہ مذہب

محبت نہیں، نہ کفر کا سوال ہے نہ اسلام کا، ——— بقین کرو، میری محبت کبھی سرسبز نہیں ہوسکتی، وہ ہے اسی لیے کہ پامال کی جائے، اور اسے ٹھوکریں لگائیں جائیں، تم لاکھ انتقام نہ لو۔ لیکن قدرت تو تمہاری طرف سے انتقام لے گی، اور لے کر رہے گی، !

---

(۶)

دن گزرتے رہے!

ارشد کی عجیب حالت تھی، گھڑی میں کچھ، پل میں کچھ، اطمینان سے بیٹھا باتیں کر رہا ہے یکایک خاموش ہو گیا۔ دریائے فکر میں غوطہ زن ہو گیا، ایک فلسفی کی طرح سوچنے لگا، کسی وقت ہنس رہا ہے مسکرا رہا ہے، لطف صحبت میں شریک ہے، اور کبھی دفعتہً آنکھیں پرنم ہو گئیں، چہرے پر وحشت برسنے لگی، اضطراب، بے کلی، اور افسردگی پھر سے طاری ہو گئی!

گھر میں ہے تو کئی کئی دن باہر نہیں نکلتا، باہر آیا، تو کئی دن گزر گئے گھر میں قدم نہیں رکھا، علاقے پر چلا گیا تو دو دو مہینے گزار دئے آنے کا نام تک نہیں لیتا، سلطانہ نے مصروفیت کی ٹوہ لگائی تو معلوم ہوا کبھی

جنگل کی سیر کو نکل گیا، کبھی کسی تالاب کے کنارے بیٹھ گیا، کبھی چڑیوں سے باتیں کرنے لگا، کبھی کھیت کی منڈیر پر بیٹھ گیا، کبھی کنویں کی جگت پر ڈیرا جما دیا، بوڑھوں سے، جوانوں سے، مردوں سے، عورتوں سے، بچوں سے باتیں شروع کیں، تو ان کا سارا حال دریافت کر ڈالا، اور جو کچھ جیب میں تھا انڈیل کر چلا آیا،

گرمی کا موسم ہو یا برسات کا، یا جاڑے کا، نہ لباس کی پروا، نہ اہتمام نہ احتیاط، موسلا دھار بارش میں ٹہلنے لگا، اور میلوں چلا گیا، لڑکے تھپیڑے کھاتا ہوا گھر سے نکلا اور نہ جانے کہاں نکل گیا، کڑکڑاتی ہوئی سردی میں بالکل سادہ اور معمولی لباس میں باہر گیا، اور گھنٹوں واپس نہ آیا،

یہ باتیں معلوم کر کے سلطانہ کڑھتی تھی، جلتی تھی، پریشان ہوتی تھی۔ غصہ ہوتی تھی، روتی تھی، لیکن وہ ——— تنہا!

کوئی اس کا غم بٹانے والا نہیں تھا، کوئی اسے سہارا دینے والا نہیں تھا، کوئی ایسا نہیں تھا جو اس کے ڈوبتے ہوئے، ڈوبتے ہوئے گرتے ہوئے دل کو سنبھال سکتا،

اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کرے؟

کیا ارشد بیمار ہے؟ ——— بالکل نہیں!

کیا وہ دیوانہ ہے؟ ——— قطعاً نہیں!

پھر ایسا آدمی، جو نہ بیمار ہو، نہ دیوانہ کس طرح قابو میں لایا جائے؟

کیونکر اسے موسم کی مناسبت سے کپڑے پہنائے جائیں ؟ کیونکر اسے وقت پر کھانا کھلایا جائے ؟ کیونکر اسے آرام پر راغب کیا جائے ؟ کس طرح اسے تفریح اور انجمن آرائی پر آمادہ کیا جائے ؟" یہ ایک معمولی سی بات سلطانہ کے لئے، ایک بڑا اور کٹھن مسئلہ بن گئی تھی،!

ایک لاینحل مسئلہ،!

عزیزوں کے ذریعہ، دوستوں کے ذریعہ، وفادار، اور قدیم ملازموں کے واسطہ سے اس نے لاکھ لاکھ کوشش کی کہ وہ راہ راست پر آجائے مگر بات بن نہ سکی،

وہ اور کچھ نہیں چاہتی تھی، اسے اپنی فکر نہ تھی، اپنی خوشی، اپنی مسرت اور اپنی خواہش، یہ الفاظ اس کے لئے بے معنی ہو کر رہ گئے تھے،

اسے فکر ایک تھی،!

ارشد زندہ رہے، تندرست رہے، خوش رہے،!

لیکن مصیبت تو یہی تھی کہ اسے زندگی سے نفرت تھی، تندرستی کی اسے کوئی پرواہ نہ تھی، خوشی ؟ ——— وہی شخص جو کبھی ہمیشہ خوش و خرم اور ہشاش بشاش رہتا تھا، اب ایسا بجھا کہ نہ تبسم اس کے ہونٹوں پر لہراتا ہے، نہ ہنسی اور قہقہے کا شور اس کے کمرے سے بلند ہوتا ہے ——— جیسے وہ زندگی میں کبھی لب بس مسکرایا تھا، جیسے وہ زندگی بھر نہیں ہنسا تھا،!

اسے اپنی بدقسمتی پر رونا آتا تھا،!

وہ سوچا کرتی تھی، اگر میں خوش نہیں رہ سکتی، اگر میں اپنے مطلوب کو نہیں حاصل کر سکتی، اگر میں ساحل مراد تک نہیں پہنچ سکتی تو ارشد کو کیا ہو گیا ہے؟ یہ کیوں خوش نہیں ہے؟ یہ اپنے مطلوب کو کیوں نہیں پا لیتا؟ یہ ساحل مراد تک کیوں نہیں پہنچ جاتا۔

ہوتی ہیں دنیا میں ایسی بیویاں بھی جو اپنے لئے، اپنی زندگی بنانے اور سنوارنے کے لئے شوہر کو قربان کر دیتی ہیں، اس کے راستے میں سنگِ گراں بن کر حائل ہو جاتی ہیں، لیکن میں تو ایسی نہیں ہوں، میں تو کبھی ارشد کے راستے میں حائل نہیں ہوئی، میں نے تو اسے کھلی چھٹی دے رکھی ہے کہ جو چاہے کرے، ——— مگر خوش رہے، !

پھر بھی نہ میں خوش ہوں نہ وہ خوش، یا اللہ اس زندگی کا انجام کیا ہوگا؟

(۷)

جاڑے کا موسم تھا، کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی، ابھی تھوڑی سی دیر ہوئی اولے بھی پڑے تھے، اور جھارٹ برس رہی تھی، ہوا کے جھکڑ اتنے زور زور سے چل رہے تھے، کہ لبنٹ نگر کا چھوٹا سا بنگلہ ہلتا ہوا معلوم ہو رہا تھا، ادھر ایک مہینہ سے ارشد یہیں مقیم تھا، اور کوئی چارہ کار نہ دیکھ کر سلطانہ بھی، یہیں آ کر وہ پڑی تھی کہ جب تک ارشد یہاں مقیم ہے وہ بھی یہیں ڈیرے ڈالے رہے گی، مختار صاحب ہر ہفتہ تشریف لاتے تھے، ٹرسٹ کا، اور ذاتی جائداد کا حساب پیش کر کے دستخط لے کے، اور ضروری ہدایات حاصل کر کے واپس چلے جاتے تھے،

رات کے دس بج چکے تھے، ارشد اپنے کمرہ میں، میز کے سامنے کرسی پر بیٹھا تھا، صرف ایک معمولی سا کرتا پہنے ہوئے،

سلطانہ یہ دیکھنے کہ ارشد سو گیا ہے یا نہیں ادھر آئی، اور اسے اس حالت میں بیٹھا دیکھ کر دل ہی دل میں لرز گئی، کہنے لگی،

"کتنی سردی پڑ رہی ہے، برسوں سے ایسی سردی نہیں پڑی تھی!"

ارشد نے کوئی جواب نہیں دیا، غوطہ میں بیٹھا رہا، سلطانہ نے پھر کہا۔

"اور آپ صرف یہ کرتا پہنے بیٹھے ہیں،؟ نہ سوئیٹر، نہ کمبل، نہ کوٹ نہ مفلر، ——— اگر خدانخواستہ نمونیہ ہو گیا تو ———؟"

ارشد نے زہر خند کرتے ہوئے کہا، "انشاء اللہ کے موقعہ پر خدانخواستہ ———؟"

سلطانہ کا دل لرزنے لگا، وہ ارشد سے کسی معاملہ پر بحث بالکل نہیں کرتی تھی، اس نے اسے بالکل آزاد چھوڑ دیا تھا، جو چاہے کرے جس طرح چاہے رہے، شاید یہی وجہ تھی کہ وہ ٹک بھی گیا تھا، ورنہ خدا جانے کب کا کہیں نکل گیا ہوتا، اس نے منہ سے کچھ نہ کہا، اور کمبل اٹھا کر اس کی پیٹھ پر ڈال دیا، اس نے مزاحمت نہیں کی، یوں ہی خاموش بیٹھا رہا، پھر سلطانہ نے دریافت کیا،

"ابھی اولے پڑے ہیں، بارش بھی بڑی تیز ہو رہی ہے، سردی خاصی چمک گئی، کیا کافی بنا لاؤں؟"

ارشد سوچنے لگا، جیسے جواب تلاش کر رہا ہے، سلطانہ نے خیال کیا شاید میری تکلیف کے خیال سے تکلف کر رہا ہے، وہ کہنے لگی۔

"چولہا گرم ہے، دودھ موجود ہے، پانی کیتلی میں ہر وقت ابلتا رہتا ہے، دو منٹ میں تیار ہو جائے گی، ______ بس گئی، اور آئی، !"

ارشد خلا کی طرف گھور رہا تھا، جیسے نہ جانے کس فکر میں ہے؟ کیا سوچ رہا ہے، اور خاموش رہنے کی تو جیسے اس نے قسم کھا رکھی تھی، سلطانہ نے اتنی باتیں کہیں، اتنی باتیں پوچھیں، مگر، نہ اس نے اس کی طرف دیکھا، نہ جواب دیا، نہ ملتفت ہوا،

اس نے سوچا اگر میں جواب حاصل کرنے پر بضد رہی، تو عین ممکن ہے یہ انکار کر دے، اتنی دیر سے بیٹھا سردی کھا رہا ہے، کافی کا پلانا ہے بہت ضروری، جس طرح میری بات کا جواب نہ دے کر بستر سے اٹھانے سے اس نے کمبل اوڑھنا گوارا کر لیا، اسی طرح کافی لے آؤں گی، تو بادل نخواستہ سہی پی لے گا، اس طرح بدن میں کچھ گرمی تو آ جائے گی، نہ جانے کب سے یوں ہی بیٹھا سردی میں اکڑ رہا ہے،

چنانچہ جواب نہ پا کر بھی، وہ جلدی جلدی قدم اٹھاتی باورچی خانے میں پہونچی، ملازمہ سو چکی تھی، اسے جگانا اچھا نہ معلوم ہوا، چولہا ٹھنڈا پڑا تھا، کیتلی بھی یوں ہی بیکار پڑی ہوئی تھی، ہاں دودھ ضرور موجود تھا۔

— لیکن بچے، !"

اس نے جلدی جلدی آگ جلائی، کیتلی خوب اچھی طرح دھوئی، اور صاف کی، دودھ گرم کیا، پانی ابالا، اور کافی ڈال دی، پھر یہ سارا سامان ٹرے میں رکھ کر خوش خوش، ارشد کے کمرے کی طرف چلی،

دو قدم بڑھی ہوگی کہ خیال آیا، خالی کافی پلانا ٹھیک نہیں، کھانا بھی کچھ نہیں کھایا ہے، یوں ہی منہ جھٹال لیا تھا، نعمت خانہ کھولا تو اس میں بادام کا حلوہ، جو آج ہی اس نے بنایا تھا رکھا تھا، ایک پلیٹ میں رکھا، اور ارشد کے کمرے میں پہنچ گئی، !

---

(۸)

لیکن، ———

لیکن ارشد کہاں گیا؟

کرسی خالی پڑی تھی، کمبل زمین پر گرا ہوا تھا، !

سلطانہ کا دل زور زور سے کسی نامعلوم خطرے کے باعث دھڑکنے لگا،

اس کے سارے بدن میں سنسنی ہونے لگی، !

وہ ٹرے اس نے اس میز پر رکھ دی، جہاں ابھی ارشد بیٹھا تھا، اور پھر اس نے اسے تلاش کرنا شروع کیا، پہلے اپنے کمرے میں گئی، لیکن وہ خالی تھا، پھر ڈرائنگ روم میں پہنچی وہ خالی تھا، پھر ڈائننگ روم

کا رخ کیا، مگر یہاں بھی کوئی نہ تھا، پھر ان دو کمروں میں پہنچی جو مہمانوں کے لئے مخصوص تھے، مگر وہ اسی طرح بند اور خالی تھے، پھر غسل خانے میں گئی، مگر وہاں بھی کوئی متنفس نظر نہ آیا،

اب تھک ہار کر وہ مختار صاحب کے کمرے میں پہنچی، جو آج ہی تشریف لائے تھے، اور بارش کی وجہ سے نہ جا سکے تھے، وہ بے خبر سو رہے تھے انھیں جگایا، وہ ہڑبڑا کر آنکھیں ملتے ہوئے اُٹھ بیٹھے، پہلے تو انھیں یقین نہ آیا کہ ان کے سامنے سلطانہ کھڑی ہے، وہ سمجھے گھر کی نوجوان ملازمہ ہے، جسے وہ اکثر چھیڑا کرتے تھے اور وہ بھی چھیڑنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتی تھی، سمجھے آج قسمت جاگ گئی، خود ہی، کشش دل سے مجبور ہو کر اور شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ کر آگئی، کوئی بے تکلفانہ جملہ کہنا ہی چاہتے تھے کہ ایک مرتبہ پھر آنکھیں مل کر دیکھا تو ساری غلط فہمی، بلکہ خوش فہمی رفع ہو گئی، جلدی سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے، سلطانہ کے چہرے پر نظر ڈالی تو ستا ہوا تھا، بالکل سفید، جیسے سارے بدن میں خون کا ایک قطرہ نہیں ہے، آنکھیں پرنم، سارا جسم مرتعش یہ کیفیت دیکھ کر گھبرا گئے، پرانے نمک خوار تھے اسی گھر کے، اور سلطانہ کو تو انھوں نے گود میں کھلایا تھا، بڑی بے کلی، اور اضطراب کے ساتھ پوچھا،

"کیا بات ہے بیٹی، ؟ —— خیر تو ہے ؟"

وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی،

"اس بارش، اس سردی، اس ادھے پالے میں وہ کہیں چلے گئے ہیں، !"

مختار صاحب نے اور زیادہ پریشان ہو کر پوچھا، "ارشد میاں کہیں چلے گئے ہیں، !" ——— لیکن کہاں ؟"

وہ بولی، "میں نہیں جانتی کہاں گئے ہیں، ——— لیکن سوچیے تو سہی کتنا بڑا خطرہ مول لے کر گئے ہیں، !" ———

یہ اندھیری رات، نہ ہاتھ میں لاٹھی، نہ بندوق، نہ ٹارچ، نہ بدن پہ کمبل، نہ کوٹ، نہ مفلر، نہ کوئی ساتھی، نہ کوئی رفیق، ———"

ہاتھ ملتے ہوئے مختار صاحب بولے، "نہ جانے کیا ہو گیا ہے اس لڑکے کو، ——— غضب خدا کا، ———"

لیکن سلطانہ نے انہیں مزید بولنے کا موقع نہ دیا، کہنے لگی، "خدا کے لئے جائیے، انہیں کہیں سے بھی، کسی طرح بھی تلاش کر کے لائیے، ——— کہیں خدانخواستہ انہیں کچھ ہو نہ جائے کہیں خدانخواستہ انہیں کچھ ہو نہ گیا ہو، ——— وقت بہت کم ہے، سوچئے نہیں جائیے، میں آپ کے انتظار میں بیٹھی ہوں، !"

مختار صاحب نے ایک موٹا سا کمبل اوڑھا، ایک چھتری لی، ایک لاٹھی تھامی، ایک پستول لٹکایا، ایک ٹارچ لی، اور ان تمام اسلحہ سے مسلح ہو کر وہ سب سے پہلے، بندو کے گھر پہنچے،

بندو اس گاؤں بسنت نگر کا نمبردار تھا، بڑا جیالا، بڑا بہادر، پچاس

آدمیوں پر تنہا بھاری، بسنت نگر اور اس کے آس پاس کے راستوں کے ایک ایک چپہ اور گوشہ سے واقف، اسے سارا ماجرا سنایا، وہ سب کچھ جانتا تھا، فوراً ساتھ چلنے پر تیار ہو گیا، بلکہ ساتھ میں اپنے دونوں بھائیوں کو بھی لے لیا، اور یہ مختصر سی پارٹی، ارشد کی تلاش میں روانہ ہوئی،

سلطانہ مختار صاحب کو رخصت کر کے اپنے کمرہ میں آئی، اور مصلے پر بیٹھ گئی، اس سے فریاد کرنے کے لئے جو سب کی سنتا ہے اور کسی کو مایوس نہیں کرتا، !

---

(۹)

یہ لوگ گیارہ بجے رات کے قریب ارشد کی تلاش میں روانہ ہوئے تھے، سلطانہ مصلے پر بیٹھی مسلسل دعائیں مانگ رہی تھی، اپنے خدا سے رو رو کر گڑگڑا گڑگڑا کر عرض کر رہی تھی کہ ارشد صحیح سلامت واپس آجائے، ہر طرح کے حادثہ سے محفوظ اور مامون رہے،

اسی طرح دعا مانگنے اور انتظار کرتے کرتے دو بج گئے،!

دو بجے کے قریب بنگلہ کے باہر کچھ لوگوں کے باتیں کرنے کی آواز آئی،

سلطانہ مصلے سے اٹھی اور بجلی کی سی تیزی سے باہر پہنچی، اس نے

دیکھا مختار صاحب زور زور سے باتیں کر رہے ہیں کسی شخص سے، ایک اور شخص بھی، ان کے پاس ہی کھڑا ہے، اور دو مزید آدمی پیچھے کھڑے ہوئے ہیں، وہ بے تابی کے ساتھ آگے بڑھی، اور پوچھا،

"مختار صاحب آپ آ گئے؟ ——— کہئے کچھ پتہ چلا ان کا؟ وہ ملے؟"

مختار صاحب نے گو ان کی آواز بڑی کڑک دار تھی، لیکن نہایت مدہم اور بجھے ہوئے انداز میں کہا

"ہاں چل گیا!"

سلطانہ اس سے زیادہ نہ سن سکی، اس نے سراپا اضطراب بن کر سوال کیا

"تو کہاں ہیں وہ؟" آپ اپنے ساتھ کیوں نہیں لائے؟ کہاں چھوڑ آئے انھیں؟"

مختار صاحب نے کہا، "کیا کہوں بیٹی، ——— یہ لڑکا تو نہ جانے کیا گل کھلائے گا، غضب خدا کا اپنی جان تک کی پروا نہیں ہے اسے؟ ——— جو کچھ میں کہوں گا سے یقین کرو گی؟ یہاں سے کئی میل کے فاصلے پر شیشم کے ایک درخت کے نیچے بیہوش پڑا تھا، اور اوپر سے پانی برس رہا تھا، ——— حد ہو گئی، نہ جانے آج کل کے نوجوانوں کو کیا ہو گیا ہے،؟"

ان باتوں پر سلطانہ نے ذرا بھی توجہ نہ کی، سوال کیا۔

"لیکن آپ اکیلے کیسے چلے آئے؟ انھیں کہاں چھوڑ دیا!
وہ کہاں ہیں؟ انھیں اپنے ساتھ ہی کیوں نہیں لائے؟"

مختار صاحب نے فرمایا، "بیٹی عقل کے ناخن لو، کیا اس طرح، اس بارش میں، ہوا کے اس جھکڑ میں، اس طوفان میں اسے یوں ہی کندھے پر لاد کر لے آتا، تاکہ خدانخواستہ کچھ نہ ہونے والا ہوتا جب بھی ہو جاتا؟"

بات کچھ کچھ سلطانہ کی سمجھ میں آگئی، اس نے پوچھا،
"تو پھر کیا کیا آپ نے؟"

مختار صاحب نے جواب دیا۔ "پالکی کا انتظام کیا ہے، اس پہ ابھی آجائے گا، ذرا دیر میں، تم جاکر اطمینان سے بیٹھو!"

لیکن سلطانہ کی قسمت میں اطمینان کہاں تھا؟ اس نے پھر دریافت کیا،

"یہ تو آپ نے اچھا کیا، اس طرح بارش سے بچ جائیں گے، لیکن کیا اب تک بیہوش ہیں؟"

مختار صاحب نے جھوٹ بولنا مناسب نہ سمجھا، بالکل صحیح جواب دیا،
"ہاں بیٹی، ہوش تو نہیں آیا ہے اب تک، ——— لیکن میں نے حکیم صاحب کا بھی بندوبست کر لیا ہے، انھیں جگا کر آیا ہوں، وہ بھی ضروری اور فوری سب دوائیں لے کر بس اب آتے ہی ہوں گے!"

(۱۰)

حکیم صاحب کی دوا دوش سے کسی حد تک ہوش تو آگیا ارشد کو، لیکن بے کلی کا یہ عالم تھا کہ ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا، سلطانہ دل ہی دل میں اپنے اوپر نفریں کر رہی تھی کہ اس نے ہوش میں لانے کی تدبیر کیوں کی؟ اس سے تو بہتر یہی تھا کہ بیہوش رہتا،

آخر خدا خدا کر کے رات کو آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹ گئی، صبح ہوتے ہی پہلا کام یہ کیا گیا کہ مختار صاحب ڈاکٹر کو لینے کے لئے شہر روانہ ہوئے، پہلے تو یہ رائے ہوئی کہ کہ ارشد ہی کو لے جایا جائے، لیکن اس کی حالت ایسی نہ تھی، وہ سفر کا تحمّل کر ہی نہیں سکتا تھا، مختار صاحب گھوڑے پر تنہا چلے گئے تھے، موٹر پر ڈاکٹر کے

ساتھ واپس آئے، ڈاکٹر بامی، پرانے، تجربہ کار، اور معمر ڈاکٹر تھے، سول سرجنی سے ریٹائر ہوئے تھے اور اب اپنا ذاتی مطب کر رہے تھے اور وہ خوب چل رہا تھا، خان بہادر رضی الدین صاحب سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے، خبر سنتے ہی مطب یوں ہی چھوڑا، اور آنے پر تیار ہو گئے،

ڈاکٹر صاحب نے بہت اچھی طرح مریض کا معائنہ کیا، مختار صاحب سے اس کی جو کیفیت سنی تھی، اس کی بنا پر ایک رائے قائم کر لی تھی، اور معائنہ کے بعد وہ بالکل صحیح ثابت ہوئی، انھوں نے انجکشن دیا، پھر اس کے سینے پر پلاسٹر لگا دیا، اور تاکید کر دی کہ کسی طرح کی بد پرہیزی نہ ہونے پائے، انھوں نے کہا، ہر روز شام کو کمپونڈر آکر انجکشن لگا جایا کرے گا اور پلاسٹر بدل جایا کرے گا، دوسرے تیسرے دن میں بھی آتا رہوں گا،

پھر باہر نکلے، سلطانہ ساتھ ساتھ آئی، اس نے پوچھا،

"حالت نازک تو نہیں ہے؟ ـــــ بچ جائیں گے؟"

ڈاکٹر صاحب جاتے جاتے پلٹ پڑے، بڑی شفقت اور محبت کے ساتھ کہا۔

"دعا کرو، ـــــ دعا کرو بیٹی!"

سلطانہ رونے لگی، "دعا کرو" کے معنی یہ تھے کہ حالت نازک ہے، اور بچنے کی امید بالکل نہیں ہے،

ڈاکٹر صاحب اس کی ذہنی کیفیت سمجھ گئے، انھوں نے فرمایا،

"ارشد انشاء اللہ بچ جائے گا!"

سلطانہ کے چہرے پر رونق آ گئی، پھر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا،

"ڈبل نمونیہ ہے"، ـــــ اگر علاج میں ذرا دیر اور ہوتی تو معاملہ قابو سے باہر تھا، ـــــ تم نے رات ہی کو مجھے کیوں نہ بلوا لیا،؟"

نمونیہ کا نام سنکر اس کی حالت پھر دگرگوں ہو گئی، اس نے کہا،

"میں نے لاکھ لاکھ مختار صاحب سے کہا لیکن وہ اتنے بزدل ہیں کہ ڈر کے مارے مرے جا رہے تھے، کسی طرح تیار ہی نہیں ہوئے، کبھی کوئی بہانہ کر دیتے، کبھی کوئی عذر،!" ـــــ لیکن نمونیہ ہو گیا ہے تو کیا ہوگا؟"

ڈاکٹر صاحب نے تسلی دی اور فرمایا۔

"نمونیہ اب اتنا خطرناک مرض نہیں رہا ہے، جتنا آج سے چند سال پہلے تھا، اب تو بڑی حد تک اس پر قابو پا لیا گیا ہے، ـــــ ذرا بھی پریشان نہ ہو، انشاء اللہ ارشد بچ جائے گا، میں اس کا ذمہ لیتا ہوں،!"

سلطانہ کا لرزتا ہوا دل پھر ٹھہر گیا، اس نے ذرا رکتے رکتے کہا۔

"لیکن آپ خود کیوں نہ روز آجایا کریں، بڑی خوشی سے میں فیس پیش کرتی رہوں گی،!"

وہ ہنسنے لگے، اور فرمایا، "فیس کا تو کوئی سوال نہیں ہے، ویسے ہر روز میرے آنے کی ضرورت تو نہیں، لیکن تمہاری خواہش یہی ہے تو آجایا کروں گا!"

وہ خوش ہو گئی، اس نے دل سے شکریہ ادا کیا، اور انھیں رخصت کر کے ارشد کے کمرے میں دبے پاؤں پہنچی، اسے مارفیا کا انجکشن لگایا گیا تھا، اور اب وہ غنودگی کے عالم میں تھا، لیکن بے کلی اور اذیت اور کرب کے علامات اس کے چہرے سے ہویدا تھے۔

وہ آکر چپ چاپ اپنے شوہر کے پاس بیٹھ گئی، وہ ٹکٹکی لگائے ارشد کو دیکھ رہی تھی، اور نہ جانے کیا کیا سوچ رہی تھی، بیتے ہوئے دنوں کی یاد، عہد ماضی کی باتیں، زندگی کا وہ دور جب صرف خوشی تھی، مسرت تھی، نشاط بیکراں تھی، جب کوئی غم نہ تھا، کوئی فکر نہ تھی!

ہر وقت قہقہے تھے، چہچہے تھے، مجلس آرائیاں تھیں،

یکایک ارشد کے منہ سے آہ کی آواز نکلی، وہ جلدی سے کھڑی ہو گئی، اور بالکل اس کے قریب پہنچ کر بولی،

"کہیں درد ہو رہا ہے،؟"

لیکن ارشد نے جواب نہیں دیا، یہ آہ اس کے منہ سے بیہوشی ہی کے عالم میں نکلی تھی،

سلطانہ نے سر جھکا کر اپنا منہ بالکل اس کے منہ کے قریب کر لیا، اور اسے اس طرح دیکھنے لگی جیسے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو!

اور واقعی اسے اب پہچاننا آسان بھی کب تھا! — کتنا بدل گیا تھا وہ! وہ جوان رعنا جس کے حسن مردانہ کی دھوم تھی، آج پوست اور استخوانی کا ایک ڈھانچہ رہ گیا تھا،! نہ وہ رنگ تھا، نہ روپ، یا اللہ کیا ہو گیا ہے اسے،؟ —— کیا یہ پھر ویسا ہی نہیں ہو سکتا، جیسا پہلے تھا،؟ یہ کون سا روگ ہے جو اسے کھائے جا رہا ہے؟ کیا یہ روگ اس کی جان لے کر رہے گا؟

اگر مجھے معلوم ہوتا کہ وہ کون ہے جس سے اسے محبت ہے تو میں خود

اس کے پاس جاتی، اس کی خوشامد کرتی، منت کرتی، ہاتھ جوڑتی، پاؤں پڑتی، اور اسے لے آتی، اور اس گھر میں رانی بنا کر بٹھا دیتی، مجھے تو اس کی چاکری کرنے میں بھی کوئی عذر نہ تھا! لیکن یہ ایسا راز ہے جو شاید مجھے کبھی نہیں معلوم ہو سکے گا، ارشد مجھے کبھی اعتماد میں نہیں لے گا، ہرگز نہیں بتائے گا کہ وہ کون ہے جس سے محبت ہے اسے؟

کاش وہ میرا دل دیکھ سکتا، پھر مجھ پر بھروسہ کرنے پر مجبور ہو جاتا، پھر وہ مجھے اپنا سچا رفیق اور جاں نثار سمجھتا، میری وفا کی قدر کرتا، اور اس قدر دانی کے بدلے میں، کیا کچھ نہ کر گزرتی میں اس کے لئے"؟

تھوڑی دیر کے بعد ارشد کو ہوش آ گیا! لیکن بے کلی اب بھی قائم تھی، سلطانہ خوش ہو گئی، اس نے بڑے پیار بھرے لہجہ میں پوچھا،

"اب کیسی طبیعت ہے؟"

بہت کمزور آواز میں اس نے جواب دیا، "ٹھیک ہے'!"

اور پھر خود ہی، ٹھہر ٹھہر کر، آہستہ آہستہ دریافت کیا،

"مجھے کیا ہو گیا ہے؟، میرے سینہ میں درد کیوں ہو رہا ہے؟ میرے سینہ پر یہ پلاسٹر کیسا چڑھا ہوا ہے، میں جکڑا ہوا کیوں پڑا ہوں بستر پر، ؟ ——— ؟"

سلطانہ نے اسی پیار بھرے انداز میں کہا۔

"تم بیمار ہو، تم پر نمونیہ کا اٹیک ہوا تھا لیکن ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں خطرہ ٹل گیا، بہت جلد اچھے ہو جاؤ گے، !"

ارشد خاموش ہو رہا،

"تھوڑی دیر کے بعد سلطانہ ایک شیشے کے گلاس میں دوا انڈیل کر لائی، اور پاس کھڑی ہو کر بولی"

"پی لو اسے،! —— اٹھو،!"

اس نے پوچھا، "کیا پی لوں؟ مجھے پیاس نہیں ہے'؟

وہ بولی، "یہ پانی نہیں دوا ہے'!"

اس نے کہا "دوا؟ —— کچھ دماغ چل گیا ہے تمہارا؟ —— میں دوا پیوں گا؟ میں علاج کروں گا؟"

وہ اپنے سر پر ایک نامعلوم سا خطرہ منڈلاتا ہوا محسوس کرنے لگی، لیکن اس نے اپنے حواس بجا رکھے، اور کہا،

"دوا نہیں پیو گے تو پھر اچھے کیسے ہو گے؟"

وہ کہنے لگا، "تم سے کس نے کہا ہے کہ میں اچھا ہونا چاہتا ہوں؟ —— میں نے کب یہ خواہش کی تھی کہ میرا علاج کرایا جائے؟ اس دوا کو پھینک دو، اس شیشی کو توڑ دو، میرے سینے سے یہ پلاسٹر ہٹاؤ، — ہٹاؤ!"

آخری لفظ اس نے اس طرح چیخ کر کہا کہ اس پر بیہوشی کی سی کیفیت طاری ہونے لگی، سلطانہ ڈر گئی، اور اس نے سوچا، یہ شخص نہ جانے اپنا کیا حال کر لے گا، وہ بولی،

"اچھا اچھا، نہ پیو، میں لئے جاتی ہوں'!"

اس نے دوا لے جا کر الگ رکھدی اور دل ہی دل میں اپنی پھوٹی

قسمت کو، رونے لگی،

یہ بڑا ٹیڑھا، اور نازک سوال پیدا ہو گیا تھا، !

اگر ارشد اسی طرح اڑا رہا، دوا پینے اور علاج کرنے سے انکار پر قائم رہا تو کیا ہوگا ؟

کیا اسے خودکشی کر لینے کی اجازت دے دی جائے ؟ ——

آخر اس مشکل کا حل کیا ہے، ؟

لیکن کچھ سوچ کر وہ پھر ایک مرتبہ ارشد کے پاس پہنچی اس نے بیزاری کی نظروں سے اسے دیکھا، اور گویا ہوا،

"اب کیا ہے ؟"

وہ کہنے لگی، "اگر تم اچھے نہ ہوئے تو، ؟" ——

وہ بولا، "ہاں میں اچھا ہونا نہیں چاہتا، !"

وہ کہنے لگی، "تمھیں اچھا ہونا پڑے گا، —— تم نے جس سے محبت کی ہے اس کی محبت جیتنے کے لیئے، !"

ارشد نے بے اعتباری کی نظروں سے اسے دیکھا اور بولا،

"کیا ایک رٹ لگا رکھی ہے، —— نہ میں کسی کو جیتنا چاہتا ہوں، نہ جیت سکتا ہوں، میں تو ہارا ہوا جواری ہوں، اور ہارا ہوا جواری ایک مرتبہ تباہ ہونے کے بعد پھر کبھی نہیں پنپتا، پھر اس کی جیب ہمیشہ خالی رہتی ہے۔"

اتنی باتیں کرنے سے اس کا سانس پھول گیا، اس نے آنکھیں بند کر لیں، اور خاموش ہو گیا، !

(۱۱)

ارشد کی بیماری کو دو مہینے گزر چکے ہیں، اب وہ تقریباً تندرست ہے، تھوڑی سی کمزوری ضرور باقی ہے،

بیماری اور تندرستی کا یہ وقفہ سلطانہ کے لئے عالم نزع سے کم نہ تھا، اس ضدی اور ہٹیلے شخص کو دوا پینے پر مختلف حیلوں بہانوں سے آمادہ کرنا صرف اسی کا کام تھا، ڈاکٹر علاج کر سکتا تھا، لیکن علاج پر مجبور تو نہیں کر سکتا تھا، یہ کام سلطانہ نے اپنے ذمہ لیا، اور سچ یہ ہے کہ اس نے اپنے آپ کو ہر طرح سے ہلکان کر کے جس بے نفسی، بے لوثی، اور خلوص کے ساتھ اس کی تیمارداری، اور معالجہ کیا، یہ صرف اسی کا حصہ تھا، اور حقیقت یہ ہے کہ علاج معالجہ کے سلسلہ میں اس کے اندر جو تھوڑی سی لچک پیدا ہوئی وہ سلطانہ کی اسی بے نفسی، ایثار، اور خود فراموشی کا ثمرہ تھا،

وہ بہت جھلاتا تھا، بہت بگڑتا تھا، بہت خفا ہوتا تھا، دوا کو دیکھ کر، علاج

کا نام سنکر، لیکن سلطانہ نے بھی اس کے ساتھ مرنے کا تہیہ کر لیا، اس نے غذا ترک کر دی، وہ بھی، موت کو لبیک کہنے کے لیے تیار ہو گئی، اپنے لیئے نہیں، اسے حاصل کرنے کے لئے نہیں صرف اسے زندہ رکھنے کے لئے، آخر وہ بھی چشم بیدار، اور قلب حساس رکھتا تھا، اس لیے وہ سلطانہ کی جان نہیں لے سکتا تھا، آخر اس کی کیا خطا تھی؟ کیا جرم تھا!

اس نے آج تک اس سے کوئی مطالبہ نہیں کیا تھا، کوئی ضد نہیں کی تھی اس کے راستے میں حائل نہیں ہوئی تھی، کبھی اس کی محبت پر معترض نہیں ہوئی تھی، اس کی کسی بات کو، کسی فعل کو، کسی کام کو، مورد لعن و طعن نہیں قرار دیا تھا اپنے حقوق نہیں مانگے تھے، ان حقوق کے لئے لڑی نہیں تھی، جھگڑی نہیں تھی۔ ایسی ہستی اگر اسے صرف زندہ رکھنے کے لئے مر رہی ہے، تو اس کی خاطر سے کچھ دنوں کے لئے جب تک صحت نہیں ہو جاتی، جب تک پاؤں میں چلنے کی طاقت نہیں آجاتی، زندہ رہنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، اگر ایک آدمی مرنے کا فیصلہ کر لے تو وہ ہر وقت مر سکتا ہے، آج بھی اور کل بھی،

غرض دونوں نے اپنی اپنی جگہ کچھ سوچا، اور سمجھوتے پر رضامند ہو گئے، سلطانہ کے دل میں یہ بات تھی کہ خدا اسے اچھا کر دے، یہ اگر میرا بن کر نہیں رہتا تو کسی اور کا بن کر رہے لیکن زندہ تو رہے، اور ارشد نے یہ سوچا تھا کہ اس کی آنکھوں کے سامنے کیوں مرے؟ کم از کم یہ داغ تو چلتے چلتے، اس دنیا سے رخصت ہوتے ہوتے نہ دے، تندرست ہونے کے بعد، یہاں سے جاکر کہیں بھی، کسی جنگل میں، کسی ویرانے میں، عروس مرگ سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔

ہاں تو ارشد اب پہلے سے بہت اچھا ہو چکا تھا لیکن کمزور تھا، دوا اور پرہیز کا سلسلہ جاری تھا، سلطانہ اس کی دیکھ بھال کیلئے شب و روز وقف تھی، اسکے اس اخلاق اور اخلاص کو دیکھ کر دل میں شرمندہ بھی ہوتا تھا کہ ایسی عورت کا بھی نہ بن سکا، جو مجموعۂ خوبی ہے، لیکن فوراً ہی کوئی اور خیال آجاتا اور دل و دماغ پر مسلط ہو جاتا، یہ ذہنی ندامت بھی ختم ہو جاتی اور تاثر بھی۔

اب ارشد کو کمرے سے باہر نکلنے کی، چند قدم چلنے کی اجازت مل چکی تھی۔

سلطانہ اور ارشد برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے، ارشد ایک آرام کرسی پر نیم دراز تھا، دوسری آرام کرسی پر قریب ہی سلطانہ تھی، اور اسے تازہ اخبار جو ابھی ابھی شہر سے آیا تھا، خبریں سنا رہی تھی، اتنے میں مختار صاحب پلندا بغل میں دبائے تشریف لائے، سلطانہ کو اس وقت آنا اچھا نہ لگا۔ اسنے تیور چڑھا کر کہا۔

"اس وقت نہیں، ——— آپ دیکھتے نہیں ہیں اخبار سنا رہی ہوں۔!"

وہ جانے کے لئے واپس مڑے تھے کہ ارشد نے کہا "نہیں نہیں اگر کوئی ضروری کام ہے تو اسے انجام دے دیجئے، اخبار کوئی بھاگا تو نہیں جاتا ہے ذرا دیر کے بعد سن لوں گا۔ ———

مختار صاحب پھر واپس آگئے، اور پاس پڑی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گئے، مختلف کاغذات اور حساب کتاب کے رجسٹروں پر سلطانہ سے دستخط کرانے کے بعد، بڑی سنجیدگی سے ایک سوال کیا۔

"قمر بیگم پر پندرہ سو روپیہ کی جو رقم عرصہ سے باقی چلی آرہی ہے اسے اب معاف ہی کر دو، ———

سلطانہ نے پوچھا،

"کیا وہ بالکل نہیں دے سکتیں کچھ؟"

وہ بولے، "ایک پائی بھی نہیں" ــــ جس کا فاقے کرکے گذارا ہو رہا ہو، جو دق میں مبتلا ہو، اور علاج تک نہ کرا سکتی ہو، وہ اگر دینا بھی چاہے تو کہاں سے دے سکتی ہے ــــ ہاکیا زمانہ تھا، کس دم خم کے لوگ تھے۔ اور شرفو میاں کی آنکھ بند ہوتے ہی کیا ہو گیا؟ گھر پر ہاتھی جھومتے تھے، آج اس کی لڑکی ایڑیاں رگڑ رہی ہے، اعزبت اور افلاس کے عالم میں!" ــــ میں نے قمر بیگم کا زمانہ دیکھا ہے خدا گواہ ہے پیشاب میں چراغ جلتا تھا! "میری تو یہی رائے ہے کہ یہ رقم اب معاف ہی کر دینی چاہیئے، اللہ اجر دے گا ــ!"

سلطانہ یہ باتیں چپ چاپ سنتی رہی، پھر بولی "یہ بات ہے تو معاف کر دیجئے بلکہ حسب ضرورت کچھ اور رقم پہنچا دیجئے، لیکن، سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ بات کیا ہو گئی!"

مختار نے ایک داستان گو کی طرح بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

بات تو کچھ بھی نہیں ــــ شرفو میاں نے اپنی آدھی جائداد جس کی قیمت کئی لاکھ روپے تھی، قمر کے نام لکھدی، کیونکہ وہ رخصتی سے پہلے ہی بیوہ ہو گئی تھی۔ اور ان کے خاندان کی یہ ریت ہے کہ بیوہ کی شادی نہیں کرتے۔ لڑکی کیا تھی گلاب کا پھول تھی، ایسا حسن اور ایسی معصومیت میں نے کبھی نہیں دیکھی ــــ

سلطانہ الجھ کر بولی، "آپ نے نمک مرچ لگانا شروع کر دیا، بات کیجئے!"

وہ بولے، "باپ کے مرنے کے بعد دونوں بھائی جو اس بات پر بڑے خفا تھے کہ ان کا حصہ کاٹ کر بہن کو کیوں دے دیا گیا، فریب کاری پر اتر آئے اور

دھوکے سے ساری جائداد ہتیالی، صرف چند بیگھے زمین اور ایک چھوٹی سی کوٹھی اس کے لئے چھوڑی۔ اس کے لئے یہ بھی بہت تھا، گھر میں رہنا جب دو بھر ہو گیا تو غریب نے گھر بھی چھوڑ دیا، جو اسی کے نام شرفیمیاں لکھ گئے تھے اور اپنی دیہاتی کوٹھی میں اٹھ آئی لیکن مصیبت یہاں بھی ساتھ آئی، کچھ دنوں کے بعد باغ بھی بھائیوں نے فروخت کر ڈالا، اب گزارا صرف زمین پر رہ گیا، لیکن جانتی ہو، دو سال سے کیسا قحط پڑ رہا ہے کوئیں تک سوکھ گئے، بدقسمتی سے یہ زمین بارانی تھی، بالکل کاشت نہ ہو سکی لہٰذا آمدنی بھی نہیں ہوئی، میں چونکہ سارے حالات سے واقف تھا اور شرفومیاں کیسے بھی ایک زمانے میں یاد اللہ تھی۔ اس لئے ایک مرتبہ جب ادھر گزر ہوا اور سارے حالات معلوم ہوئے تو میرا دل کڑھا اور میں نے اسکی نہیں نہیں کے باوجود تین مرتبہ پانچ پانچ سو کی رقم بہ مداعانت تم سے صلاح کر کے اسے دے دی۔

سلطانہ نے کہا، "ہاں مجھے یاد ہے! ——— آپ حسب ضرورت رقم جلد از جلد اسے پہنچا دیجئے اور علاج کا بھی بندوبست کروا دیجئے، مصارف ٹرسٹ سے ادا کئے جائینگے

ایک ٹھنڈی سانس لے کر مختار صاحب نے ارشاد فرمایا۔

"اس نیت کا خدا تمہیں ضرور ثواب دیگا، لیکن اب اس کا بچنا مشکل ہے حالت بہت نازک ہو چکی ہے۔ میں اپنی آنکھ سے دیکھ چکا ہوں!

ارشد اب تک خاموشی سے یہ باتیں سن رہا تھا، اس نے نہ کوئی سوال کیا تھا نہ گفتگو میں کسی طرح کی مداخلت کی تھی۔ اب اس نے ایک سوال کیا۔

کون شرفومیاں؟ ——— وہی احمد نگر والے؟

مختار صاحب نے مختصر سا جواب دیا "ہاں"!

ارشد نے پوچھا "تو اب بھائیوں سے لڑائی کے بعد ان کی لڑکی کہاں رہتی ہے؟ اس کی زمین کہاں ہے؟"

مختار صاحب نے بڑی سادگی سے کہا۔

رنگ پور میں!

یہ سنتے ہی دفعتاً ارشد کا رنگ بدل گیا، وہ اٹھ کر بیٹھ گیا، اس نے کہا۔

رنگ پور میں؟

مختار صاحب نے پھر اپنا جواب دوہرا دیا، "ہاں رنگ پور میں!

اس گاؤں کے کئی پٹی دار ہیں، آدھے کی مالک تو ہماری بیگم صاحبہ اسلطانہ ہیں، باقی آدھے میں کئی پٹی دار ہیں، انہی میں چند بیگھے زمین قمر بیگم کی بھی ہے۔

ارشد نے دریافت کیا۔

رنگ پور میں ان کی کوٹھی کس طرف ہے۔

مختار صاحب نے جواب دیا "وہی ایک کوٹھی تو ہے رنگپور میں جسے ہم اپنے روپے کے حساب میں لیکر کچھ تھوڑا سا روپیہ اور دیکر مول لے سکتے ہیں۔ ـــــ بڑی اچھی اور خوبصورت کوٹھی ہے۔ شرفو میاں نے بڑے چاؤ سے اپنے لئے بنوائی تھی!

ارشد نے بادل کی طرح گرج کر کہا۔

احمق ـــــ

مختار صاحب حیرت سے اس کا چہرہ دیکھنے لگے، ارشد جیسے نیک سعادتمند اور فرشتہ خصلت شخص کے منہ سے اپنے لئے کبھی یہ لفظ بھی سن سکتے ہیں اسکا تو

وہم و گمان بھی نہ تھا، انہوں نے بڑے ملائم لہجہ میں پوچھا۔

"کیا کہا بیٹا۔"

ارشد دفعتاً اٹھ کھڑا ہوا، اس نے کہا۔

"میں رنگ پور جاؤں گا ——— سلطانہ میں ابھی اور اسیوقت جاؤنگا تم کو میں مرتے نہیں دیکھ سکتا۔ اسکی موت میں برداشت نہیں کر سکتا، وہ میرے سامنے نہیں مر سکتی میں صرف اس سے محبت ہی نہیں کرتا، وہ میری محسن بھی ہے اسنے مجھے اس وقت پناہ دی جب زمین و آسمان مجھے پناہ دینے سے انکار کر چکے تھے۔

سلطانہ سب کچھ سمجھ گئی، اس نے کہا۔

"اکیلے کیسے جاؤ گے، میں بھی چلتی ہوں!"

ارشد نے بے بسی کے ساتھ سلطانہ کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

"تم بھی چلتی ہو؟"

وہ بڑے ٹھنڈے لہجہ میں بولی ہاں تو کیا ہوا؟ میں چلوں گی۔ اسے اپنے ساتھ لاؤں گی اور بہن کی طرح رکھوں گی ——— مجھے بھی تو اس سے محبت ہے؟"

ارشد نے پھر عجیب نظروں سے اسے دیکھ کر پوچھا۔

"تمہیں بھی محبت ہے اس سے؟"

وہ اس طرح جیسے کوئی کسی دیوانے کو سمجھاتا ہے یا بچہ کو بہلاتا ہے۔ بولی۔

"ہاں ——— میں اس سے محبت کرتی ہوں، اور زندگی بھر کرتی رہوں گی۔ ——— مختار صاحب جلدی سے جوڑی کسوائیے!"

(۱۲)

چند منٹ کے اندر شکرم تیار ہو کر آگئی! اور یہ دونوں مختار صاحب سمیت رنگ پور کی طرف روانہ ہو گئے۔

رنگ پور یہاں سے کچھ زیادہ فاصلے پر نہ تھا صرف ۱۵ میل کی مسافت تھی موٹر ہوتا تو یہ فاصلہ ذرا دیر میں طے ہو جاتا، گھوڑے لاکھ تیز رفتار ہوں پھر بھی انہیں پہنچتے پہنچتے دو گھنٹے لگ ہی گئے۔

یہ دوپہر کا وقت تھا۔

رنگ پور کی وہ کوٹھی جس میں راشد نے اپنی زندگی کے کچھ دن گزارے تھے۔ اسی طرح موجود تھی۔ لیکن ایک عجیب ہیبت ناک سناٹا چھایا ہوا تھا اس پر!

راستے بھر راشد کوچوان کو ہدایت کرتا رہا کہ جلدی چلے اور جب کوٹھی آگئی تو جلدی سے شکرم کا دروازہ کھول کر وہ پھاند پڑا۔ اس کے پیچھے سلطانہ کودی، پھر مختار صاحب نے جست لگائی۔

ارشد کوٹھی کے احاطے میں داخل ہوا اور اس نے صدا لگائی۔

دلاری ——— دلاری ——— دلا

لتنے میں ایک نوجوان لیکن سراپا الم عورت باہر نکلی اور ارشد کو دیکھتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ارشد نے کانپتی ہوئی آواز سے کہا۔

روتی کیوں ہو دلاری میں آگیا۔ میں تمہاری بٹیا کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ ان کا علاج کراؤں گا انکے لئے بہترین حکیموں اور ڈاکٹروں کی خدمات حاصل کروں گا۔ پھر بھی اگر وہ اچھی نہ ہوئیں تو انہیں لے کر یورپ جاؤں گا، لندن، پیرس برلن، ویانا ہر جگہ ان کا علاج ہوگا اور وہ توانا اور تندرست ہو کر واپس آجائیں گی آج تم رو رہی ہو، پھر ہنسو گی، خوش ہوگی، دھومیں مچاؤگی ——— لیکن تم مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہی ہو، وہ کہاں ہیں؟ ——— جلدی بتاؤ کہاں ہیں؟ خدا کے لئے رحم کرو مجھ پر!

دلاری نے جو سوز و گداز کا پیکر بنی ہوئی تھی۔ بڑے غم انگیز لہجہ میں کہا۔

"اب آئے ہیں آپ؟"

وہ بولا "تو کیا ہوا؟ آتو گیا"۔

وہ کہنے لگی۔ "ہاں آگئے لیکن کب۔؟"

ارشد نے سراپا اضطراب بن کر پوچھا۔

"لیکن کب؟ ——— کیا کہنا چاہتی ہو تم؟"

وہ گویا ہوئی "جب وہ آپ کے غم میں گھل گھل کر اس دنیا سے رخصت ہوگئیں، وہ کبھی نہ مرتیں اگر آپ یوں اچانک روپوش نہ ہو جاتے، انہیں آپ سے

محبت تھی، وہ آپ پر ہزار جان سے فریفتہ تھیں، آپ کے جانے کے بعد مجھ سے جب بھی انہوں نے کوئی بات کی، وہ آپ ہی کے بارے میں تھی، "نہ جانے وہ کہاں ہونگے؟ خدا جانے ان کا کیا حال ہوگا؟" بس صرف یہی، اس کے سوا نہ کوئی ذکر تھا، نہ شغل یا چپ چاپ لیٹی رہتیں یا آپ کی باتیں کیا کرتیں۔ شروع شروع میں آپ سے اپنی محبت انہوں نے مجھ سے بھی چھپائی، لیکن آپ کے جانے کے بعد بند ٹوٹ گیا، وہ کھل گئیں، انہوں نے اپنا دل کھول کر میرے سامنے رکھ دیا۔ میں نے آپ کو کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا؟ کس کس جگہ تلاش نہیں کیا؟ لیکن آپ نہ ملے ــــ آپ نہ ملے اور وہ اپنی جان پر کھیل گئیں، نہ کھانے کا ہوش، نہ پانی کی فکر، ہر وقت ٹھنڈی آہیں، ہر وقت آپ کی یاد، آپ کا ذکر، اسی غم نے انہیں دق میں مبتلا کر دیا اور وہ اس دنیا سے سدھار گئیں ــــــــ آخر وقت تک ان کے ہوش قائم رہے، آخر وقت تک یہ آس لگائے رہیں کہ آپ آجائیں گے ــــ آخر وقت وہ صرف آپ ہی کو یاد کرتی رہیں، لیکن ان کی آس یاس سے بدل گئی، آپ نہ آئے آپ نے انہیں یاد بھی نہیں کیا ــــــــ

ارشد چیخا، دلاری میں ہمیشہ انہیں یاد کرتا رہا ــــــــ

اور پھر وہ کچھ نہ کہہ سکا، پختہ فرش پر تیورا کر گرا، سر پھوٹ گیا، خون کی ندی جاری ہوگئی، فوراً ڈاکٹر بلایا گیا اور اس نے فیصلہ کر دیا۔ اب یہ کبھی ہوش میں نہ آئے گا ــــ!

∴